
فروری 2025
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
www.Pklibrary.com
www.Pklibrary.com

خواتین ڈائجسٹ

بانی ———— محمود ریاض
مدیرہ ———— نادرہ خاتون
نائب مدیرہ ———— رضیہ جمیل
مدیرخصوصی ———— امت الصبور
بلقیس بھٹی
تفصیلات ———— ادارہ
قانونی مشیر ———— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈوکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز
واٹس اپ 03172266944

آپ سے کیا پردہ

خاتون کی ڈائری

مجھ سے ملئے

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

افسانے



نظمیں غزلیں

پکوان

رنگا رنگ پھول

میری بیاض سے

نفسیات

بیوٹی بکس

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

فروری 2025

جلد 52 شمارہ 09

قیمت 150 روپے

زرسالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ——— 1,800 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، یورپ — 25000 روپے

سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں

subscriptions@khawateendigest.com

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

ایڈیٹر و پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 0317 2266944

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

کہی اَن کہی

خواتین ڈائجسٹ فروری کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

فرد کی ذہنی تربیت اور تہذیب و تمدن کے فروغ کے لیے ادب ایک اہم ذریعہ ہے۔ کسی بھی قوم یا ملک کا ادب اس کے ذہنی رجحان، اس کی تہذیب، سوچ و فکر اور روایات کا ترجمان ہوتا ہے ایک کہانی کے ذریعے جو بات سمجھائی جا سکتی ہے۔ وہ براہ راست تبلیغ و تقریر سے زیادہ پر اثر ثابت ہوتی ہے۔ بے مقصد کہانیاں دلچسپ ہو سکتی ہیں، پسندیدگی کی سند بھی حاصل کر سکتی ہیں لیکن کہانی کو مکمل اسی وقت کہا جائے گا جب وہ معاشرے کے لیے سنوار کا باعث ہو، اسے کسی مثبت مقصد کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہو لیکن ایک بات کا دھیان رکھنا ضروری ہے کہ مقصد کو کہانی پر غالب نہیں آنا چاہیے۔ اس طرح کہانی خشک، نصیحت اور تبلیغ کا تاثر دیتی ہے۔ اور ایسی تحریریں قارئین کے لیے بھی دلچسپی کا باعث نہیں ہوتیں۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ نے ہمیشہ نئی مصنفین کو متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بے شمار تخلیق کاروں کی صلاحیتیں خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے منظر عام پر آئیں۔ ہمیں ہر ماہ بڑی تعداد میں نئی لکھنے والی بہنوں کی تحریریں موصول ہوتی ہیں۔ نئی لکھنے والی مصنفین کہانی کے مقصد کو تو سامنے رکھتی ہیں لیکن کہانی پر بالکل توجہ نہیں دیتیں۔ اس لیے ان کی تحریروں میں دلچسپی کا عنصر کم ہوتا ہے اور کبھی تو بالکل نہیں ہوتا۔ ہم ان مصنفین سے کہنا چاہتے ہیں کہ وہ کردار نگاری اور کہانی پر زیادہ توجہ دیں مقصد ضرور ہو لیکن براہ راست نصیحت نہیں۔ آپ کی کہانی پڑھنے والوں کو سوچنے پر مجبور کر دے اور وہ خود مقصد اخذ کریں دوسری بات جس کا خیال رکھنا ضروری ہے، وہ یہ کہ اپنی تحریروں میں قرآن پاک یا احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم لکھتے ہوئے بہت احتیاط کریں، مستند حوالہ کے بغیر ہرگز نہ لکھیں، نہ شرعی مسائل کو زیر بحث لائیں۔

قارئین سے سروے

1۔ یہ پرچا آپ کو ملے گا تو شعبان المعظم کا آغاز ہو چکا ہوگا۔ بہت سے گھروں میں شعبان سے ہی رمضان المبارک کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ گھر کی تفصیلی صفائی، کچن کو نئے سرے سے سیٹ کیا جاتا ہے۔ عبادت کے لیے خاص طور پر نظام الاوقات ترتیب دیا جاتا ہے۔ آپ رمضان المبارک کے استقبال کے لیے کیا تیاری کرتی ہیں؟

2۔ ہر گھر میں افطاری اور سحری میں اپنی حیثیت کے مطابق خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ آپ سحری اور افطاری میں کیا بناتی ہیں؟ آپ کے گھر میں سحری اور افطاری میں دستر خوان پر کیا چیز لازمی ہوتی ہے؟

ان سوالات کے جواب اس طرح بجوائیں کہ ہمیں 22 فروری تک موصول ہو جائیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔
قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کررہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

طہارت کا ثواب

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"تم میں سے کوئی شخص جب وضو کرتا ہے اور اچھی طرح (خوب سنوار کر) وضو کرتا ہے، پھر مسجد میں آتا ہے، اسے نماز کے علاوہ کوئی اور مقصد گھر سے نہیں نکالتا، (ایسا شخص) جو قدم بھی اٹھاتا ہے اس کے بدلے اللہ تعالیٰ اس کا ایک درجہ بلند فرماتا ہے۔ اور ایک گناہ معاف کرتا ہے۔ (اسے مسلسل یہ ثواب ملتا رہتا ہے) حتیٰ کہ وہ مسجد میں داخل ہوجاتا ہے۔"

فوائد ومسائل

1۔ وضو کرتے ہوئے اچھی طرح سنوار کر وضو کرنے کا ثواب بہت زیادہ ہے۔
2۔ بعض اوقات انسان مسجد میں آتا ہے تو اس کا مقصد کسی آدمی سے ملاقات کرنا یا کوئی اور ضرورت پوری کرنا ہوتا ہے مگر ساتھ نماز بھی پڑھ لیتا ہے۔ اس صورت میں نماز کے ثواب میں کمی نہیں آتی لیکن جب صرف نماز کے لیے گھر سے نکلے کوئی اور مقصد نہ ہو تو ثواب زیادہ حاصل ہوتا ہے۔
3۔ نماز اتنا عظیم عمل ہے کہ اس کے لیے مسجد میں آنے کا اس قدر ثواب ہے۔ تو خود نماز اگر پورے آداب وشرائط کا خیال رکھتے ہوئے پڑھی جائے تو کتنی رحمتیں اور برکتیں حاصل ہوں گی، اور یہ نماز کس قدر بلندی درجات کا باعث ہوگی۔
4۔ اللہ کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ اس نے بظاہر معمولی نظر آنے والے اعمال کے لیے بہت زیادہ اجر وثواب مقرر کر رکھا ہے، پھر بھی اگر انسان جہنم سے چھٹکارا پاکر جنت حاصل نہ کرسکے تو یہ حقیقتاً انسان کی بہت بڑی کوتاہی ہے۔
5۔ مسجد کے بجائے اپنے گھر، دفتر اور دکان وغیرہ سے وضو کرکے مسجد میں آنے کا ثواب زیادہ ہے۔

طہارت کی اہمیت وفضیلت

☆ طہارت کے لغوی معنی: لغت میں، میل سے صاف ہونے، نجاست سے پاک ہونے اور ہر عیب دار

قول و فعل سے بری ہونے کا نام "طہارت" ہے۔

☆ اصطلاحی تعریف: شریعت میں حدیث اصغر (بے وضو ہونے) کے بعد وضو کرنے اور حدیث اکبر (جنبی ہونے) کے بعد غسل کرنے کو طہارت کہتے ہیں۔

☆ طہارت کی ضرورت واہمیت: اسلام طہارت ونظافت کا دین ہے۔ اس نے اپنے پیروکاروں کو نجاست اور گندگی سے دور رہنے کا حکم دیا ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو جسم، لباس، رہنے سہنے کی جگہ، کھانے پینے، غرضیکہ تمام امور حیات میں طہارت وصفائی کا پابند بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب نبی اور امت کے رہنماو مرشد صلی اللہ علیہ وسلم کو صفائی وستھرائی کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے "(اے نبی!) اپنے کپڑے صاف رکھیے اور گندگی سے دور رہیے۔" (المدثر 54/74)

اسلام کا پہلا درس طہارت ہی ہے۔ اسلام کے بنیادی اور اہم رکن نماز کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طہارت کی شرط لگائی ہے۔

اگر پہلے سے باوضو ہوں تو دوبارہ وضو کرنے کی ترغیب دی، صفائی کے اہتمام میں مسواک کی فضیلت واہمیت واضح فرمائی، پانی موجود نہ ہو تو تیمم مشروع فرما کر سہولت مہیا کر دی تاکہ مسلمان ہر حالت میں صفائی وستھرائی کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنائیں۔ اس طرح اسلام کا سارا نظام صفائی وستھرائی پر مبنی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی ذات کا شان دار اسوہ پیش کیا ہے، آپ ہر نماز سے پہلے، گھر میں داخل ہوتے ہوئے اور صبح بیدار ہونے کے بعد مسواک کرتے۔ لباس وجسم کی صفائی کا اہتمام فرماتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو ترغیب بھی دلاتے، مثلاً ایک صحابی میلے کچیلے اور بوسیدہ کپڑے پہنے خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔

"کیا تمہارے پاس مال نہیں ہے؟"

وہ کہنے لگا: "کیوں نہیں، اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی نعمت عطا کی ہوئی ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "پھر تمہارے رہن سہن میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اظہار بھی ہونا چاہیے۔" (مجمع الزوائد: 132/5، وسلسلہ الاحادیث الصحیحہ 311/3)

اسلام کے اس روشن اور پاک صاف نظام کے مقابلے میں یہودیت، عیسائیت، ہندومت، بدھ مت یا سکھ مت کو دیکھو تو ان کی ساری زندگی غلاظت وگندگی میں غرق نظر آتی ہے۔ غسل وصفائی سے ناآشنا یہ اقوام پلیدی ونجاست کی پیداوار میں دن رات اضافے کا باعث بن رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو اسلامی نظام طہارت پر تعجب ہوتا ہے جیسا کہ ایک یہودی نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے بطور طنز کہا:

"سنا ہے، آپ کا رسول آپ کو رفع حاجت کے طریقے بھی سکھاتا ہے؟"

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے بغیر کوئی خفت اور شرمندگی محسوس کیے کمال خود اعتمادی اور فخر وسرشاری سے جواب دیا۔

"ہاں، ہمارا نبی ہمیں ہر بات کی تعلیم دیتا ہے حتیٰ کہ رفع حاجت کے آداب بھی سکھاتا ہے۔"

اس پر یہود ونصاریٰ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ (صحیح مسلم، الطہارۃ، باب الاستطابۃ، حدیث: 262)

اسی تعلیم وتربیت کے سائے میں پرورش پانے والے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف وتوصیف خود رب العالمین نے بیان کی ہے۔

ارشاد ہے۔ "اس (مسجد قباء) میں ایسے لوگ (نماز پڑھتے) ہیں جو طہارت کو بہت پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ طہارت کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" (التوبہ 108/9)

یہ آیت کریمہ اہل قبا کی شان میں نازل ہوئی جو قضائے حاجت کے بعد پانی سے استنجا کرتے تھے اور جنابت کے بعد غسل کرتے تھے۔ اسلام کے اسی نظام طہارت کی شان واہمیت بیان کرتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ "طہارت نصف ایمان ہے۔" (صحیح مسلم۔ 223)

اسلام کے نظام طہارت نے انسان کے اشرف

المخلوقات ہونے پر مہر تصدیق ثابت کردی ہے جبکہ غیر مسلم اقوام کے نظام ہائے حیات کو دیکھ کر انسانیت شرمندہ ہو جاتی ہے۔ حیوانات اور ان کی زندگی میں کچھ فرق محسوس نہیں ہوتا، اس لیے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اسلام وہ نظام ہے جو پوری انسانیت کا رہنما اور قائد ہو سکتا ہے۔

وضو اور غسل کے لیے پانی کی مقدار

حضرت صفینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مد (پانی) سے وضو اور ایک صاع (پانی) سے غسل کر لیا کرتے تھے۔ (مسلم)"

فوائد و مسائل:

1۔ "صاع" پیمائش کا ایک پیمانہ ہے۔ کلوگرام کے حساب سے اس کی مقدار دو کلو سو گرام اور بعض کے نزدیک ڈھائی کلو ہے۔

مد صاع کے چوتھائی (1/4 صاع) کو کہتے ہیں، اس کی مقدار پانچ سو پچیس گرام ہے۔ مائعات کے لیے صاع تقریباً دو لیٹر سے کچھ زائد اور مد اس سے چوتھائی سمجھا جا سکتا ہے۔

غسل اور وضو کے لیے یہ مقدار ذکر کرنے کا یہ مقصد نہیں کہ اس سے کم یا زیادہ پانی استعمال کرنا جائز نہیں۔ مقصد محض ایک اندازہ بیان کرنا ہے تاکہ بلاوجہ بہت زیادہ پانی ضائع نہ کیا جائے، بلکہ تھوڑے پانی کو طریقے سے استعمال کیا جائے کہ پوری طرح صفائی حاصل ہو جائے البتہ صدقہ، فطر وغیرہ میں "صاع" سے کم مقدار میں غلہ ادا کرنا درست نہیں۔

پانی کی مقدار

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مد (پانی) سے وضو اور ایک صاع (پانی) سے غسل فرماتے تھے۔" (ابوداؤد)

پانی کی کفایت

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مد (پانی) سے وضو اور ایک صاع (پانی) سے غسل فرماتے تھے۔"

سب سے افضل

حضرت عقیل بن ابو طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"وضو کے لیے ایک مد (پانی) اور غسل کے لیے ایک صاع (پانی کافی) ہے۔"

ایک آدمی نے کہا: "ہمارے لیے تو کافی نہیں ہوتا۔"

حضرت عقیل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "ان کو تو کافی ہوتا تھا جو تجھ سے افضل تھے اور ان کے بال بھی تجھ سے زیادہ تھے، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم۔"

فائدہ: حضرت عقیل رضی اللہ عنہ کے اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ زیادہ پانی استعمال کرنے کا مقصد اگر طہارت اور صفائی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفائی پسند تھے۔ اگر احتیاط مطلوب ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ متقی تھے۔ اگر یہ خیال ہے کہ بال زیادہ ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال بھی تجھ سے کم نہ تھے، لہٰذا سائل کا زیادہ پانی استعمال کرنا محض شک اور وسوسے کی وجہ سے ہو سکتا ہے یا اسراف کی وجہ سے اور اس سے بچنا ضروری ہے۔

پاکیزگی کے بغیر نماز قبول نہیں

حضرت اسامہ بن عمیر ہذلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ پاکیزگی کے بغیر نماز قبول نہیں فرماتا اور خیانت کے مال میں سے (دیا ہوا) صدقہ قبول نہیں فرماتا۔" (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

1۔ "پاکیزگی" سے مراد وضو اور غسل ہے۔ نماز کے لیے شرط ہے کہ نمازی حدث اصغر، حدث اکبر اور ظاہری نجاست سے پاک ہو۔

2۔ ظاہری نجاست دھونے سے، حدث اصغر وضو سے اور حدث اکبر غسل سے دور ہوتا ہے۔

"حدث" سے مراد انسان کا ایسی حالت میں ہونا ہے جس سے وضو یا غسل کرنا ضروری ہو، جیسے باوضو شخص کی ہوا خارج ہو جائے یا وہ قضائے حاجت کر لے تو اس کا وضو برقرار نہیں رہتا۔ یہ حالت حدث اصغر کہلاتی ہے۔ اگر غسل کی حاجت ہو تو یہ حالت حدث اکبر کہلاتی ہے۔ ایسی حالت میں غسل ضروری ہے۔

3۔ قبول نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر ثواب نہیں ملتا اور اگر وہ فرض نماز ہے تو انسان کے ذمہ اس کی ادائیگی باقی رہتی ہے۔

4۔ "خیانت کے مال" کے لیے حدیث میں لفظ "غلول" استعمال ہوا ہے، اس سے مراد مال غنیمت میں کی ہوئی خیانت ہے، یعنی جہاد میں کافروں سے حاصل ہونے والے مال غنیمت کے مجاہدین میں باقاعدہ تقسیم ہونے سے پہلے اگر کوئی مجاہد اس میں سے کوئی چیز اپنے قبضے میں رکھتا ہے تو یہ مسلمان کے اجتماعی مال میں خیانت ہے جو بہت بڑا گناہ ہے۔ اس طریقے سے حاصل ہونے والا مال حرام کمائی میں شامل ہے لہٰذا اس کو اگر نیکی کے کسی کام میں خرچ کیا جائے تو وہ اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں یعنی جس طرح مال کو خرچ کرتے وقت حلال وحرام مصرف کا خیال رکھنا ضروری ہے اسی طرح مال کے حصول میں بھی حلال وحرام میں تمیز کرنا ضروری ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ پاکیزگی کے بغیر نماز قبول نہیں فرماتا اور خیانت کے مال میں سے صدقہ قبول نہیں فرماتا۔" (مسلم)

پاکیزگی، نماز کی کنجی ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"نماز کی کنجی، پاکیزگی ہے اور نماز کی تحریم (اس میں پابندیاں لگانے والی چیز) تکبیر ہے اور نماز کی تحلیل (اس میں پابندیاں ختم کرنے والی چیز) سلام ہے۔" (ابوداؤد)

فوائد ومسائل:

1۔ جس طرح کنجی کے بغیر تالا نہیں کھلتا، اسی طرح حدث اصغر اور حدث اکبر سے پاک ہوئے بغیر نماز میں داخل ہونا ممکن نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ طہارت نماز کے لیے شرط ہے۔

2۔ تکبیر یعنی اللہ اکبر کہنے سے نماز کے منافی تمام امور ممنوع ہو جاتے ہیں۔ اس لیے نماز میں داخل ہوتے وقت کہی جانے والی پہلی تکبیر کو تکبیر تحریمہ کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے نماز میں اس کی وہی حیثیت ہے جو حج میں "احرام" باندھنے کی ہے جس سے حاجی پر کچھ پابندیاں لگ جاتی ہیں۔

3۔ تکبیر تحریمہ سے لگنے والی پابندیاں اس وقت اٹھتی ہیں جب نمازی سلام پھیر کر نماز سے فارغ ہوتا ہے، اس لیے اسے "تحلیل" کہا گیا ہے، یعنی جو چیزیں نماز میں حرام اور ممنوع تھیں، اب وہ حلال اور جائز ہو گئیں۔

4۔ نماز میں داخل ہونے کا طریقہ تکبیر ہی ہے، اس کے علاوہ کسی دوسرے کلمے سے یا کسی دوسری زبان میں اللہ کا نام لے کر انسان نماز میں داخل نہیں ہو سکتا۔ بعض علماء کا یہ موقف درست نہیں کہ اللہ کا نام کسی طرح سے بھی لے لیا جائے نماز شروع ہو جاتی ہے، خواہ "اللہ اعظم" کہا جائے یا "اللہ کبیر" وغیرہ۔

بعض علما کی رائے ہے کہ نمازی، نماز کے باقی اعمال پورے کرنے کے بعد سلام کے بجائے کوئی ایسا عمل کر لے جو نماز کے منافی ہو تو نماز مکمل ہو جاتی ہے جبکہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز سے فارغ ہونے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے سلام۔

وضو کی حفاظت کرنا

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سیدھی راہ پر قائم رہو اور تم (کماحقہ) قائم نہیں رہ سکو گے اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارا بہترین عمل نماز ہے اور وضو کی حفاظت مومن ہی کرتا ہے۔"

فوائد ومسائل:

1۔ "سیدھی راہ پر قائم رہو" اس کا مطلب یہ ہے کہ دین اسلام پر قائم رہو، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام

اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اپنی اولاد کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ "تمہیں جب بھی موت آئے، اسلام پر آئے۔" (ترجمہ (البقرہ 132/2)

2۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ افراط وتفریط سے بچ کر راہ اعتدال پر قائم رہو۔ نہ ذکر وعبادت سے بے پروائی کرو، نہ خود پر اتنا بوجھ ڈال لو کہ اس پر کار بند رہنا دشوار ہو جائے۔ کوئی شخص اس انداز سے نیکی کی راہ پر قائم نہیں رہ سکتا کہ اس سے کوئی غلطی اور کوتاہی سرزد نہ ہو نہ یہ ممکن ہے کہ ذکر، شکر اور عبادت کا حق ادا کر سکے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ ہے۔ ترجمہ

"اسے معلوم ہے کہ تم پوری طرح نباہ نہ سکو گے۔" (المزمل 20/73)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔

"(اے اللہ!) میں تیری پوری پوری تعریف نہیں کر سکتا، تو ایسے ہی ہے جیسے تو نے اپنی ثنا فرمائی (صحیح مسلم، 486)

3۔ وضو کا قائم رہنا یا ٹوٹ جانا ایسی چیز ہے جس کا علم دوسروں کو عام طور پر نہیں ہوتا اور اس معاملے کو آسانی سے پوشیدہ رکھا جا سکتا ہے۔ اس کا اہتمام محض اسی یقین کی بنا پر ہو سکتا ہے کہ دوسرے جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے۔ وضو کی حفاظت کا مطلب اولاً سردیوں اور گرمیوں میں پوری طرح اعضاء کو دھونا ہے۔ ثانیاً وضو کرتے وقت اعضاء کو توجہ سے دھونا کہ کوئی حصہ خشک نہ رہ جائے اور ثالثاً زیادہ سے زیادہ اوقات میں باوضو رہنا بھی ہو سکتا ہے اور یہ کام ایمان کی قوت کے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا۔

نماز کی اہمیت

"ایمان ایک قلبی کیفیت ہے جس کا اظہار اعمال سے ہوتا ہے۔ اعمال میں اہم ترین عمل نماز ہے۔ فرض نماز تو اتنا اہم عمل ہے کہ اسے کفر اور ایمان کے درمیان امتیاز کے لیے ایک علامت قرار دیا گیا ہے۔ متقین کی سب سے اہم صفت اور اخروی فلاح و کامیابی کے لیے اولین شرط نماز کو قرار دیا گیا ہے۔ (سورۃ البقرہ: 2/2-5)

نفل نماز کی اپنی اہمیت ہے۔

جنت میں رفاقت

حضرت ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ نے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ وہ جنت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت چاہتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام کے حصول کا طریقہ بتایا اور فرمایا۔

"سجدوں کی کثرت کے ذریعے سے اپنے نفس کے خلاف میری مدد کرو۔" (صحیح مسلم 489)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے اپنے غلام پر کسی ایسے جرم کی حد لگائی جو اس نے کیا ہی نہیں یا اس کو طمانچہ مارا، تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کردے۔" (مسلم)

فائدہ:

قاضی عیاض فرماتے ہیں: اس پر اجماع ہے کہ آزاد کرنا واجب نہیں، صرف مستحب ہے، تاہم یہ آزادی گو اجر میں بغیر کسی سبب کے آزاد کرنے کے برابر نہیں ہے، مگر اس کی زیادتی کا کفارہ ضرور ہوگی۔

حضرت ہشام بن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ان کا ملک شام میں کچھ کاشت کار لوگوں پر سے گزر ہوا جنہیں دھوپ میں کھڑا کیا گیا تھا اور ان کے سروں پر زیتون کا تیل بہایا گیا تھا۔ انہوں نے پوچھا: یہ کیا ماجرا ہے؟ ان کو بتلایا گیا کہ انہیں خراج کی وجہ سے سزا دی جا رہی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ انہیں جزیے کی وجہ سے قید کیا گیا ہے۔ حضرت ہشام نے فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے۔ "اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں۔" پھر حضرت ہشام ان لوگوں کے گورنر کے پاس گئے اور انہیں یہ حدیث سنائی تو گورنر نے ان کی بابت حکم دیا اور انہیں چھوڑ دیا گیا۔ (مسلم)

☆☆

ورنہ ہم کراچی کا مسئلہ

انشا جی

ایک دیہاتی بزرگ کے متعلق مشہور ہے کہ شہر میں مہمان گئے تھے۔ وہاں میزبان نے انہیں کھانے کے بعد پان پیش کیا۔ تھوڑی دیر بعد انہیں پیک تھوکنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ میزبان نے ایک چمکیلا مراد آبادی اگال دان ان کے سامنے کر دیا۔ انہوں نے اسے ہاتھ سے پرے ہٹا دری کا کونا اٹھا کر پیک تھوک دی، دوسری بار پھر یہی ہوا کہ میزبان نے اگالدان آگے کیا اور انہوں نے اسے پرے ہٹا، دری کے کونے سے کام لیا۔ تیسری بار میزبان نے پھر یہی حرکت کی تو مہمان کے صبر کی تاب نہ رہی، بولے۔ ”یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تم ہر بار یہ برتن آگے کر دیتے ہو۔ اب کے کیا تو اسی میں تھوک دوں گا۔“

ہر چند کہ ہماری طبیعت میں صبر کی اتنی کمی نہیں، لیکن بندہ بشر ہے۔ ہر روز کراچی کے مسئلے پر اتنے بیان اور اتنے کالم آنے لگے ہیں کہ زچ ہو کر ہمارا ابھی ہنکارنے کو جی چاہتا ہے کہ ختم کرو یہ بیان بازی ورنہ ہم ابھی کراچی کا مسئلہ حل کر دیں گے۔

☆☆☆

دیکھا جائے تو کراچی کا مسئلہ کوئی ایسا بڑا مسئلہ بھی نہیں جس طرح ون یونٹ توڑنے پر سب ہی متفق ہو گئے ہیں۔ اسی طرح الحمدللہ زیادہ تر لوگوں کا اس بات پر اتفاق رائے ہو گیا ہے کہ سندھ اور کراچی کو یکجا ہونا چاہیے۔ لوگوں کے بیانات میں ایک بار ایک اور لطیف سا فرق البتہ ضرور نظر آیا وہ یہ کہ کراچی کو سندھ میں شامل ہونا چاہیے یا سندھ کو کراچی میں۔ ممکن ہے، ان دونوں باتوں میں کوئی فرق نہ ہو اور یہ محض لوگوں کے جی کا وسوسہ ہو کہ کسی کی نظر پیسے کی ریل پیل پر ہے اور کسی کی نوکریوں کے کوٹے پر۔ کچھ بھی ہو پاکستان کے دو علاقوں نے جھوٹوں ہی سہی ایک دوسرے میں مدغم ہونے کی بات تو کی، ورنہ تو ہمیں یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اب جو ہر شخص اور ہر علاقہ فرزند اپنی خودی پہنچاننے لگا ہے اور باقی ہر شے کو پہچاننے سے انکاری ہے تو کہیں کراچی کا شیرازہ بھی نہ بکھر جائے۔ یہاں مقامی اور باہر سے آئے ہوئے ہر علاقے کے لوگوں کا الگ محلہ اور پاڑہ ہے اور تنظیم ہے۔ انجمن مسلمانان چکوال ہے۔ بانٹوا میمن سوسائٹی ہے۔ حلقہ احباب پیلی بھیت ہے۔ ایسا نہ ہو کل روہیل کھنڈ ہاؤسنگ سوسائٹی والے کہہ دیں کہ ہمارا کلچر الگ ہے۔ ہماری سوسائٹی کو الگ صوبہ سمجھا جائے۔ برنس روڈ والے جہاں زیادہ تر دلی کے روڑے رہتے ہیں علیحدگی کی تحریک چلا دیں کہ جو شخص اردوئے معلیٰ نہ بولے اور نہاری نہ کھائے یہاں سے نکل جائے۔ جن لوگوں نے اپنے مردوں کو دفنانے کی گاڑی تک علاقہ وار الگ الگ رکھی ہیں۔ ان کا مل جل کر زندگی بسر کرنا بظاہر مشکل معلوم ہوتا تھا۔ خیر ہمارے اندیشے باطل ثابت ہوئے۔ کوئی محلہ شہر سے الگ نہیں ہوا۔ داخلی خود مختاری اور الگ کرنسی تک کا مطالبہ نہیں کیا۔

☆☆☆

کراچی اور سندھ آپس میں مل جائیں تو لامحالہ بہت عمدہ صوبہ بن جائے گا۔ دو اسمبلیوں، دو وزارتوں اور دو گورنریوں کا جھنجھٹ ہمیں پسند نہیں۔ انتظامی اخراجات میں بہت بچت رہے گی۔ اس پر ہمیں یاد آیا کہ قاضی عیسیٰ صاحب نے بھی پیش کش کی تھی کہ بلوچستان اور کراچی کو باہم ملا دیا جائے تو کیوں نہ کراچی، بلوچستان کو اپنے ساتھ لے کر سندھ میں شامل ہو۔ دیکھیے نا، ذرائع رسل و رسائل بھی ایک ضروری چیز ہیں۔ معیشت کے تقاضے بھی ہیں۔ چمن کا انگور اور سردا بھی سندھ اور کراچی ہی میں آ کر

بکتا ہے۔ سردیوں میں کوئٹہ سے ٹھنڈی ہوا بھی ادھر ہی کو آتی ہے۔ سندھ میں بہت سے بلوچ آباد ہیں۔ کراچی میں بلوچ میس نام کی ایک عمارت موجود ہے۔ بلوچستان، سندھ، کراچی، یہ ہمارے نزدیک ایک نہایت قدرتی وحدت ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ بلوچستان آج کل کے مہنگائی کے زمانے میں الگ اسمبلی، الگ حکومت وغیرہ کا بوجھ اٹھائے۔ ان تینوں علاقوں کے لیے ایک مشترکہ انتظامیہ کافی رہے گی۔

☆☆☆

ایک قباحت کو ہم البتہ نظر انداز کررہے ہیں۔ بلوچستان کے بعض علاقوں میں پٹھان بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ بولتے بھی پشتو ہیں۔ وہ لامحالہ چاہیں گے کہ دوسرے پٹھان بھائیوں سے الگ نہ رہیں۔ دیکھا جائے تو اس کا حل بھی مشکل نہیں۔ ہم نے سندھ کراچی اور بلوچستان کا جو مشترکہ صوبہ بنایا ہے اس کا دائرہ شمال کی طرف وسیع کیا جاسکتا ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان، بنوں، پشاور، کوہاٹ قبائلی علاقے یہ پورا قطعہ کوہاٹ تا کوئٹہ اور کوئٹہ تا کراچی، ایک ہی چیز ہے اور ایک ہی ہونا چاہیے۔ کراچی میں جو ہمارے لاکھوں پختون بھائی رہتے ہیں ان کی خوشی بھی یقیناً اسی میں ہوگی۔ روز روز تو دستوری تبدیلیاں ہوتی نہیں لہٰذا کیوں نہ ابھی سے اس صوبہ عظمیٰ کی داغ بیل ڈال دی جائے۔ ایسے ہی جذبے کے عالم میں تو علامہ اقبال نے مسلمانوں کے ایک ہونے کی خواہش کی تھی نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر، کراچی، سندھ، بلوچستان، سرحد، یہ صوبہ خاصا بڑا ہوجاتا ہے۔ لیکن سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی۔ کچھ اور بڑا ہوجائے تو کیا حرج ہے۔ اب لے دے کے پنجاب رہ جاتا ہے۔ کیوں نہ پنجاب سے بھی پوچھ لیا جائے کہ اس نئے صوبے میں شامل ہونا پسند کرے گا؟ مصلحت اس میں یہ ہے کہ دریا مل ملا کر پنجاب ہی سے آتے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ کل کلاں پنجاب اور اس نئے صوبے میں پانی پینے پلانے پر کوئی جھگڑا اٹھ کھڑا ہو۔

پنجاب والوں کا یہ فائدہ ہے کہ ان کا سارا مال جو دساور کو جاتا ہے سندھ ہی میں سے گزرتا ہے۔ تاندلیانوالہ وغیرہ میں خالص پنجاب کا گھی بنانے کے لیے ساری چربی کراچی ہی سے جاتی ہے اور بھی کئی باتیں مشترک ہیں۔ دور کیوں جایئے ہماری اپنی ذات کا بھی دونوں علاقوں سے تعلق ہے کہ رہنے والے پنجاب کے ہیں اور رہتے کراچی میں ہیں اور اس حقیقت سے پوری ذمہ داری سے یہ بیان دینے کو تیار ہیں کہ پنجاب اس نئے صوبے میں شامل ہونے کے لیے بخوشی تیار ہے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ ہم نے گھر میں بیٹھے بٹھائے خود بخود فیصلہ کرلیا ہے۔ جیسے لیڈر لوگ کرلیتے ہیں۔

☆☆☆

گویا صاحبان! اب یہ طے ہوگیا کہ ان سارے علاقوں کا جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ ایک صوبہ بن جانا چاہیے۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کا کیا نام ہو۔ ہمارے ذہن میں کئی نام آئے تھے۔ وسیع تر کراچی، عظیم تر سندھ، بڑا بلوچستان، سرحد عظمیٰ، پنجاب کبیر وغیرہ، ان سب تجویزوں کو رد کرنا پڑا کیونکہ بیک وقت ان سارے علاقوں کے لوگ اس پر متفق نہیں ہوپائے۔ ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ چونکہ پاکستان سے ان سب علاقوں کو محبت ہے لہٰذا اسے پاکستان ہی کیوں نہ کہا جائے۔ ہمیں یہ نام فی الحال اجنبی اور غیر مانوس سا معلوم ہوگا۔ لیکن شاید چل جائے۔ اب رہی یہ بات کہ اس کا صدر مقام کیا ہو؟ ہمارے خیال میں اس معاملے میں پنجاب کو کچھ فیاضی دکھانی چاہیے جیسی 1947 میں سندھ نے دکھائی تھی کہ پاکستان کے دارالحکومت کے لیے کراچی کی پیش کش کردی تھی۔ اب پنجاب والے لاہور کی پیش کش کریں۔ راولپنڈی یا اسلام آباد کی پیش کش کریں۔ ان کے پاس وسیع سکریٹریٹ بھی ہے۔ اور عمارتیں اور ادارے بھی ہیں۔ یہ سب اس نئے صوبے کے کام میں لائی جاسکتی ہیں۔ جس جس بھائی کو ہماری یہ تجویز منظور ہو، ہاتھ کھڑا کرے۔

نیا سال

سمیرا حمید

نیا سال، نئی امید، نیا یقین، کہتے ہیں ہر دس سال میں انسان بدل جاتا ہے۔ اس کی کیفیت، اس کی خواہشیں اور اس کی ضرورتیں، تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ہم بچے ہیں، ہمیں کھلونے چاہئیں۔ ہم بڑے ہو چکے ہیں، ہمیں، گھر، پیسہ کامیابی چاہیے۔

ہم زندگی میں آگے بڑھ چکے ہیں، سکون چاہیے، اچھی صحت اور تھوڑی قدر دانی چاہیے۔ زندگی کے ساتھ بدلنا، اور حالات کے مطابق ایڈجسٹ ہونا، انسان کا انسان ہوتا ہے۔

لیکن ایک چیز کی تبدیلی مجھے بہت تکلیف دیتی ہے، اور وہ ہے انسان کا اندر سے مردہ ہو جانا۔

ہم کتابوں میں پھول رکھتے ہیں، ایسے مرجھائے ہوئے پھول بھی پسند کرتے ہیں۔

لیکن مجھے مرجھائے ہوئے چہرے اداس کر دیتے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے خوابوں کو پھر سے جوڑا نہ جائے تو میں دکھی ہو جاتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ چاہے کچھ ہو جائے لیکن دل پھول کی طرح کھلے رہیں۔

ایک خاتون سے ملاقات ہوئی، کم عمری میں ان کی شادی ہو چکی تھی، فورٹی پلس تھیں کہ دادی بن گئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ”اب اور کیا کرنا ہے جی کر۔ اب بس موت کا انتظار ہے۔“

مجھے اچھا نہیں لگا۔ ہماری زندگیوں کے سارے کام نپٹ جائیں گے تو ہم موت کا انتظار کرنے لگیں گے، انسان کیا صرف کاموں کے لیے جیتا ہے؟ انسان، انسان ہے، مزدور نہیں۔ شادی، اولاد، پھر ان کی اولاد...... ایسے زندگی ختم؟

زندگی تو اتنی خاص ہے کہ یہ بیرونی حالات کے ساتھ سانس ضرور لیتی ہے لیکن دھڑکتی یہ انسان کی روح کے ساتھ ہے۔ آپ کو کیوں لگتا ہے کہ آپ نانی دادی بن چکی ہیں، بیوہ ہو چکی ہیں، شادی ناکام رہی، اکیلے بچے پال رہی ہیں، تو بس آپ کی زندگی ختم ہو گئی۔ آپ بچوں کے لیے جی رہی ہیں، لیکن اپنے لیے مر چکی ہیں۔ جبکہ آپ کو اپنے لیے سب سے پہلے جینا ہے۔

موت کی تیاری کی جاتی ہے، انتظار نہیں۔ اور تیاری بھی زندگی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ زندہ دلی کے ساتھ۔ کسی نے بڑی پیاری بات کہی ہے کہ ”کوشش کریں کہ جب موت آپ کے پاس آئے، تو اسے آپ زندہ ملیں۔“

یہ باتیں کہنے کا مقصد ہے، کہ آپ عمر کے کسی بھی حصے میں ہیں، زندگی کے کسی بھی مقام پر ہیں، خود کو زندگی سے ریٹائرڈ نہ کریں۔ جسم کی عمر ہوتی ہے، وہ جوان اور بوڑھا ہوتا ہے، روح کی نہیں ہوتی۔ جتنا روح کو زندگی کے قریب رکھیں گے وہ اتنا ہی مہکے گی۔

دوسری بات جو میں کہنا چاہتی ہوں کہ زندگی میں کوئی نہ کوئی مقصد ضرور رکھیں۔ میں سمجھتی ہوں مقصد ہمیں زندگی کی قوت دیتا ہے۔ وہ مقصد گھر کو جنت بنانے کا ہو، اولاد کی تربیت کا، پڑھنے لکھنے کا، یا پھر انسانیت کے لیے کچھ کرنے کا۔ معمول کی ذمہ داریوں کے علاوہ ایک ٹارگٹ ضرور سیٹ کریں۔ پھر اس ٹارگٹ کے حصول کے لیے کوشش کریں۔

ایک کتاب کو ہر حال میں اپنے ساتھ رکھیں۔ کتابیں ضرور پڑھیں۔ میں چاہتی ہوں آپ دنیا میں کہیں بھی رہیں، کہیں بھی جائیں، آپ علم میں پیچھے نہ ہوں۔ کچھ نہ کچھ سیکھتے رہیں۔ کسی کام کو معمولی نہ سمجھیں۔ کام کرنے کا انداز کام کو بادشاہ بنا دیتا ہے۔ وہ سوئی دھاگے سے رومال پر پھول کاڑھنا ہی کیوں نہ ہو۔ عمر کے کسی بھی حصے کو غیر اہم نہ جانیں کہ اب کیا فائدہ۔

مصر میں ساٹھ ستر سالہ عورتیں تاریخی کھدائیوں کو سپروائز کر رہی ہیں۔ ترکی میں جس گائیڈ کی عمر جتنی زیادہ ہوتی ہے، اس کی اتنی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔ سیاح بڑی عمر کے گائیڈ ہائیر کرنا پسند کرتے ہیں کہ ان کی معلومات اور تجربہ زیادہ ہے۔ عمر کا بڑھنا انسان کو ناکارہ نہیں بناتا۔ تجربات انسان کو کندن کرتے ہیں۔

آپ کندن ہیں، خود کو کوئلہ نہ سمجھیں۔

عمرے کے دوران مدینے سے مکہ واپسی پر مجھے ایک خاتون عائشہ ملیں۔ ان کا تعلق گاؤں سے تھا۔ ہم نے کافی باتیں کیں۔ وہ شوہر کی وفات کے بعد وراثت میں ملنے والا زمین کا ٹکڑا بیچ کر عمرہ کرنے آئی تھیں۔ جو پیسے بچ گئے تھے، ان سے بچوں کے لیے چیزیں خرید لی تھیں۔

"اور آپ نے اپنے لیے کیا لیا ہے؟"

"میں نے ان پیسوں میں سے صرف ایک آئس کریم لے کر کھائی ہے۔"

ان کے بچوں کے بھی بچے تھے، بہت بڑا خاندان تھا۔ تمام عمر شوہر نے کبھی ہتھیلی پر دو پیسے نہیں رکھے تھے۔ وہ ہاتھ پھیلانے سے شرم کرتی تھیں۔ پھر گاؤں کے گھر میں چھوٹی سی دکان کھول لی۔ اپنی ضرورت وہاں سے پوری کرتی رہیں۔ اولاد ہوئی، جوان ہوئی، لیکن اپنے لیے وہ دکان سے کماتی رہیں۔ کسی اولاد سے کچھ نہیں لیا۔ اولاد نے بھی نہیں دیا۔ بیٹا اتنی استطاعت رکھتا تھا کہ ماں کے حصے کی زمین خرید لی۔ لیکن ماں کو عمرے کے لیے پیسے نہیں دیے۔ وہ تاعمر اپنی غیرت کے سائے میں رہیں۔ ہاتھ پھیلایا تو اللہ کے آگے، اور اللہ نے انہیں اپنے گھر بلایا تو ان ہی کے حصے سے۔ جو اللہ کی طرف سے ان کے لیے طے تھا۔ اللہ نے اس غیرت مند بندے کو اپنے گھر بلا کر اعزاز دیا۔

اپنی زندگی کی کہانی سناتے ہوئے وہ کئی بار روئیں۔ ان کی آنکھیں ہمیشہ نم رہنے والی آنکھیں تھیں۔ گیلی اور دکھی۔ مجھے جب جب وہ یاد آتی ہیں، ان کا یہ جملہ کانوں میں گونجنے لگتا ہے۔

"میں نے صرف ایک آئس کریم لے کر کھائی ہے۔"

میں نے صفا مروہ میں اللہ سے دعا کی تھی کہ مجھے اپنے ان تین بندوں سے ملوا دیں، جو آپ کو عزیز ہیں۔ ماں جی عائشہ، انہی تین میں سے ایک تھیں۔ مجھے تب بھی یقین تھا، مجھے آج بھی یقین ہے۔

ہماری یہ مائیں...... یہ عام عورتیں تو نہیں ہیں......

جیسے سائرہ رضا کی والدہ۔ اگر وہ اپنی استطاعت کو اتنے اعلا مقام تک نہ لے جاتیں تو ان کے خاندان کی کہانی مختلف ہوتی۔

ان خواتین نے اپنا آپ قربان کر کے اپنی نسلوں کے بیڑے پار لگائے ہیں۔ یہ عورتیں اللہ کو عزیز نہیں ہوں گی تو کون ہوں گی۔

ہمیں اپنی خواتین کو ساس، بہو، نند، بھابھی کے تناظر میں دیکھنے کے بجائے، ان کی شخصیت کے آئینے میں دیکھنا چاہیے۔ ان کی قربانیوں کی قدر کرنی چاہیے۔

ماں جی عائشہ جیسی خواتین سے میں یہ درخواست کرتی ہوں، اپنے لیے صرف آئس کریم نہ لیں، وہ گرم شال بھی لے لیں جو آپ کو پسند ہے اور آپ اسے بچوں کی فیس میں ٹال رہی ہیں۔ بیٹیوں کا جہیز جمع کر رہی ہیں، ضرور کریں، لیکن وہ سوٹ خرید لیں، جسے کئی بار مارکیٹ میں دیکھ کر چھوڑ آئی ہیں۔ وہ سونے کی چین ہے یا بندے، اسے خرید لائیں اسے پہن لیں۔

شاید آپ پہاڑوں پر جانا چاہتی ہیں، سمندر دیکھنا چاہتی ہیں، لیکن کبھی اتنے پیسے جمع نہیں ہوئے، کبھی فرصت نہیں ملی۔ لیکن گھوم آئیں۔ اپنا دل نہ ماریں۔ آپ کی اولاد کا آپ پر حق ہے، کچھ حقوق خونی رشتوں کے بھی ہیں، لیکن ان سب سے کہیں پہلے آپ کا خود پر بھی حق ہے۔ ہم کہتے ہیں، ہم سب کے حقوق کے بارے میں سوال ہوں گے۔ ضرور ہوں گے۔ لیکن ہم سے ہمارے حق کا سوال بھی تو ہوگا۔

اپنا حق خود کو ادا کر دیں......

اپنا حق خود ہی غصب نہ کریں......

اس نئے سال میں، اپنے لیے نئی خوشیوں کا اہتمام ضرور کریں۔ اگر اندر کہیں زندگی مردہ ہو چکی ہے تو اسے زندہ کرنے کی کوشش کریں۔

میری طرف سے آپ سب کو نیا سال اور زندگی کی ہر ساعت مبارک!

''عرفان موتی والا سے باتیں''

شاہین رشید

1 ''اصلی نام؟''
''عرفان موتی والا۔''

2 ''پیار کا نام؟''
''کچھ بھی نہیں۔''

3 ''تاریخ پیدائش/سال؟''
''30 اگست 1971ء۔''

4 ''قد/ستارہ؟''
''5.7 فٹ/ورگو۔''

5 ''مادری زبان؟''
''میمنی...... مگر بولتے ہم اردو ہی ہیں۔ اپنی زبان سمجھ میں آجاتی ہے۔ مگر بولنی نہیں آتی۔''

6 ''تعلیمی قابلیت؟''
''گریجویٹ۔''

7 ''شادی/بچے؟''
''جی شادی ہوئی۔ بیگم کا 2015ء میں انتقال ہو گیا اور بچے دو ہیں ایک بیٹی ایک بیٹا، بیٹی کی شادی ہو گئی ہے اور بیٹا ماسٹرز کر رہا ہے۔''

8 ''شوبز میں آمد/گھر والوں کا ردعمل؟''
''مجھے شوق تھا پاپا کی وجہ سے آیا کیونکہ انہوں نے مجھے بہت سپورٹ کیا۔ امی کو بھی بہت شوق تھا کہ میں شوبز میں آؤں۔ پاپا کا انتقال بھی 2007ء میں ہو گیا تھا۔''

9 ''بہن بھائی/آپ کا نمبر؟''
''میں بڑا ہوں۔ پھر پانچ بہنیں ہیں اور پھر ایک چھوٹا بھائی ہے۔''

10 ''بچپن کی بری عادت جو مشکل سے گئی؟''
''کوئی ایسی عادت نہیں تھی جو مستقل عادت بن گئی ہو۔''

11 ''بچپن میں کس سے ڈر لگتا تھا؟''
''بچپن میں بھی ڈر لگتا تھا اور اب بھی لگتا ہے لال بیگ سے۔''

12 ''زندگی کی پہلی کمائی کس عمر میں کی اور کس کے ہاتھ میں رکھی؟''
''سولہ، سترہ سال کی عمر میں کی اور امی کے ہاتھ میں رکھی۔''

13 ''زندگی کی سب سے بڑی اچیومنٹ؟''
''کچھ بھی نہیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے مجھے۔''

14 ''اپنے ہر کام کے لیے کس سے مشورہ کرتے ہیں؟''
''پہلے اپنی بیگم سے کرتا تھا۔ اب وہ دنیا میں نہیں ہیں تو اپنی بیٹی سے کرتا ہوں۔''

15 ''گھر میں کس کا رعب ہے؟''
''گھر میں ایک بیٹا اور امی ہیں۔ تو رعب کس پر۔''

16 ''آپ کی صبح اور رات کب ہوتی ہے؟''
''شوٹ کے حساب سے کبھی صبح چھ بجے تو کبھی صبح دس بجے اور جب چھٹی ہوتی ہے تو نیند پوری کرتا ہوں۔''

17 ''صبح کیا نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی اور رات کیا نہ ملے تو رات نہیں ہوتی؟''
''صبح چائے نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی اور رات کو اپنی دن کی نمازیں پوری کرتا ہوں اور نہ کر سکوں تو بے چینی ہوتی ہے۔''

18 ''بھوک میں آپ کی کیفیت؟''
''کچھ خاص نہیں۔ جب بھوک لگتی ہے تو کچھ نہ کچھ کھا لیتا ہوں۔''

19 ''پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟''
''بہت کچھ سوچتا ہوں اور پاکستان کے لیے ہی تو سوچتا ہوں اور کس کے لیے سوچنا۔''

20 ''کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟''

"کسی بھی ملک کی نہیں ...... مجھے کئی ممالک کے چانس ملے لیکن پاکستان کو نہیں چھوڑ سکتا خواہ کیسے بھی حالات ہوں۔"

21 "اسپورٹس سے لگاؤ۔ آپ کا پسندیدہ کھیل؟"

"کرکٹ اور شوبز کی طرف سے کھیلا بھی ہوں۔ اب لگاؤ بھی نہیں رہا اور مصروف بھی بہت رہتا ہوں۔"

22 "گھر میں ضدی اور آرام طلب کون ہے؟"

"گھر میں تین چار افراد ہیں تو کیا ضد اور کیا آرام طلبی۔"

23 "پہلی بار کیمرے کا سامنا کرتے وقت کیا کیفیت تھی؟"

"پہلی بار نہیں بلکہ جب بھی کسی سیریل کا پہلا سین کرتا ہوں وہی کیفیت ہوتی ہے جو پہلی بار ہوئی تھی کہ پتا نہیں کیا ہو، کیسا ہو۔"

24 "سیاست میں کون پسند ہے؟"

"وہی...... جو سب کو پسند ہے۔"

25 "کس سیاست دان کا رول کرنے کی خواہش ہے؟"

"آپ کی خواہش سے کچھ نہیں ہوتا۔ آپ کو جو کردار پسند آتا ہے آپ کو وہی کرنا ہوتا ہے۔ جو مل جائے پھر اسی کو کرنے میں مزہ آتا ہے۔"

26 "شوبز میں کیا اچھا ہے کیا برا ہے؟"

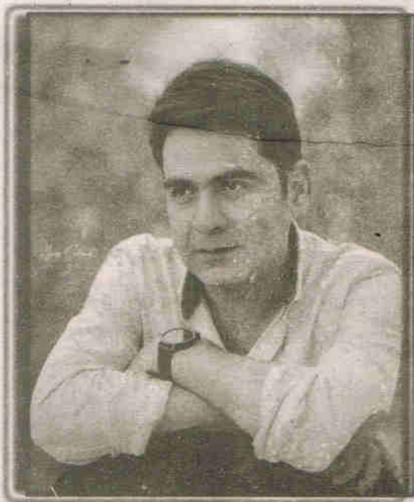
"آپ چاہیں تو سب اچھا ہے۔ آپ چاہیں تو سب برا ہے مجھے شوبز میں چوبیس سال ہو گئے ہیں۔ جو کام کیا ایمان داری کے ساتھ کیا۔"

27 "کس بات پر آپ کی آواز اونچی ہو جاتی ہے؟"

"میری آواز تیز نہیں ہوتی صرف کردار کرتے وقت اگر کردار ایسا ہو تو آواز تیز ہو جاتی ہے ورنہ نہیں۔"

28 "کیا کیا چیزیں خریدنا آپ کا خواب ہے؟"

"اس فیلڈ میں رہتے ہوئے خواب دیکھتا ہوں



ایوارڈ کے لیے اور انٹرنیشنل طور پر کام کے لیے۔"

29 "کس کی خاطر فیلڈ چھوڑ سکتے ہیں؟"

"کسی کی بھی خاطر نہیں...... یہی میرا ذریعہ معاش ہے اگر یہ چھوڑ دوں گا تو پھر کیا کروں گا۔"

30 "خاندان میں کون جلدی ناراض ہو جاتا ہے؟"

"چونکہ میں کسی سے امیدیں نہیں لگاتا اس لیے مجھ سے کوئی ناراض بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی میں کسی سے ناراض ہوتا ہوں۔"

31 "ایک اچھی عادت جو آپ چاہتے ہیں کہ مجھ میں بھی آجائے؟"

"اللہ کا شکر ہے کہ میں اپنی عادتوں سے خوش ہوں۔"

32 "زندگی میں کچھ واپس ملنے کا چانس ملے تو کیا لینا چاہیں گے؟"

"صرف ایک چیز، ایک شخصیت اور وہ ہے میری بیوی جو 2015ء میں چھوڑ کر چلی گئی اس دنیا سے۔"

33 "دل کا ٹوٹنا قابل برداشت ہے یا موبائل کا؟"

"جیسا زمانہ چل رہا ہے اس حساب سے موبائل کا ٹوٹنا قابل برداشت نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں بہت کچھ

محفوظ ہوتا ہے۔“

34 ”گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟“

”اپنے بیڈ پر۔“

35 ”بیمار ہونے پر بیماری کو سیریس لیتے ہیں؟“

”نہیں...... کیونکہ سب کچھ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔حتیٰ کہ نزلہ زکام بھی۔“

36 ”اس فیلڈ میں کیا کیا کر چکے ہیں؟“

”کافی کچھ کر چکا ہوں۔بہت کام کیے ہیں۔“

37 ”کردار کون سے پسند ہیں نیگیٹو یا پوزیٹو؟“

”مجھے زیادہ تر نیگیٹو پسند ہیں کیونکہ اس میں پرفارمنس کا مارجن زیادہ ہوتا ہے۔پوزیٹو تو سیدھا سادہ کردار ہوتا ہے۔“

38 ”پہلا ڈرامہ وجہ شہرت؟“

”کوئی ایک ڈراما نہیں ہے۔کافی ہیں...... اور پھر کوئی نہ کوئی کردار بھی وجہ شہرت بن جاتا ہے۔“

39 ”اپنی کمائی کا کتنے فیصد بچا لیتے ہیں؟“

”بچا نہیں سکتا میں ...... پیسے اکاؤنٹ میں آتے ہیں اور پھر جلدی خرچ بھی ہو جاتے ہیں۔میرا اس بات پر یقین ہے کہ جب آنے ہوں گے آ جائیں گے۔بچا کر کیا کرنا ہے۔“

40 ”کچن سے لگاؤ۔کبھی شیف بننے کا خیال آیا؟“

”کبھی نہیں — انڈا کے علاوہ کچھ نہیں بنا سکتا لہٰذا شیف کیسے بن سکتا ہوں۔“

41 ”کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟“

”الحمدللہ کوئی فیصلہ غلط ثابت نہیں ہوا اور اگر ہوا بھی ہوگا تو اس کو میں نے پوزیٹو ہی لیا ہوگا۔“

42 ”کس شخصیت پر چاہتے ہوئے بھی غصہ نہیں کر سکتے؟“

”بیٹی اور بیٹے پر۔“

43 ”کس تہوار کا انتظار رہتا ہے؟“

”رمضان اور عید۔“

44 ”ملک کی ترقی کی راہ میں کون رکاوٹ ہے؟“

”دونوں ہی۔ووٹ کی کوئی وقعت نہیں رہی کیونکہ ڈالو کسی کو اور نکلتا کسی کا ہے۔“

45 ”کھانے کی ٹیبل پر کیا ہونا ضروری ہے؟“

”میں بہت صبر و شکر والا بندہ ہوں۔لیکن پھر بھی اچار ہو تو کیا ہی بات ہے۔“

46 ”کبھی غربت میں وقت گزارا؟“

”اللہ کا شکر ہے کہ ایسا وقت نہیں آیا کہ فاقہ کرنا پڑا ہو ہاں کام میں مندی تیزی آتی رہتی ہے۔تو یہ تو زندگی کا حصہ ہے۔“

47 ”ڈاکٹر حکیم اور ہومیو پیتھک کس پر اعتبار ہے؟“

”ڈاکٹر۔“

48 ”آج کے دور کا پسندیدہ اینکر؟“

”محسن عباس، ساحر لودھی، یہ دونوں بہت بلکہ بہت اچھے لگتے ہیں۔“

49 ”دنیا کا سب سے بورنگ کام؟“

”جب میں فری ہوتا ہوں۔یعنی ڈیٹ فری ہوتی ہے۔ہر وقت مصروف رہنا چاہتا ہوں۔“

50 ”کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں؟“

”شوٹ پر۔“

51 ”وقت کی پابندی کے کتنے قائل ہیں؟“

”میں وقت کا بہت پابند ہوں۔اگر کسی نے دس بجے بلایا ہے تو دس منٹ پہلے ہی پہنچ جاؤں گا۔“

52 ”گھر کا کون سا کام کرنا پسند نہیں؟“

”ویسے میں گھر کا کوئی کام کرتا نہیں ہوں۔اس لیے پسند ناپسند کچھ بھی نہیں ہے۔امی جو کہتی ہیں وہ کر لیتا ہوں۔“

53 ”کس کیڑے اور جانور کو دیکھ کر آپ کی چیخیں نکل جاتی ہیں؟“

”صرف لال بیگ اور وہ بھی اڑنے والا۔آپ شیر لے آئیں مگر مچھ لے آئیں شاید اتنا نہیں ڈروں گا

جتنا لال بیگ سے ڈرتا ہوں۔"

54 "کس طرح کے کردار ریجیکٹ کر دیتے ہیں؟"

"ایسا کردار جس کو کرنے کے باوجود اسٹوری میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کو کرنے سے انکار کر دیتا ہوں۔"

55 "کون سی تاریخیں یاد رہتی ہیں؟"

"صرف ایک تاریخ یاد رہتی ہے جب میری بیوی کا انتقال ہوا تھا۔"

56 "کوئی کردار جو دوبارہ کرنا چاہیں گے؟"

"میں نے ایک کردار کیا تھا بلکہ ٹائٹل رول تھا "میرے چھوٹے میاں" اور ایک کردار کیا تھا "پاگل" کا یہ دوبارہ کرنا چاہوں گا۔"

57 "غصے کے وقت آپ کی کیفیت؟"

"مجھے غصہ نہیں تھا اور جب آتا ہے تو وہ غصہ نہیں ہوتا بلکہ میرے دل کی بھڑاس ہوتی ہے۔"

58 "اپنا ڈرامہ بار بار دیکھتے ہیں؟"

"بار بار تو نہیں دیکھتا لیکن ایک بار ضرور دیکھتا ہوں۔ تاکہ اپنی غلطیوں کا ازالہ کر سکوں۔"

59 "گھر میں کون پڑھاکو تھا؟"

"اب کی بات کرتے ہیں۔ میرا بیٹا پڑھاکو ہے ماسٹرز کر رہا ہے۔"

60 "مشکل میں کس کو کال کرتے ہیں؟"

"اللہ کو ...... کیونکہ مشکل کشا رب کی ذات ہی ہے۔"

61 "بچپن میں کس وجہ سے مار کھاتے تھے؟"

"شرارتی تھا تو امی کی مار پڑتی تھی۔ چپل سے مارتی تھیں امی۔"

62 "اگر کبھی کوئی شو ہوسٹ کریں تو پہلا مہمان کون ہوگا؟"

"سلیم معراج ان سے میری بہت دوستی ہے۔ فیصل قریشی بھائی کو۔ بہت سارے لوگ ہیں مگر پہلا مہمان سلیم معراج ہی ہوگا۔"

63 "کن چیزوں پر زیادہ خرچ کرتے ہیں؟"

"میری عادت بہت بری ہے جب پیسے جیب میں



ہوتے ہیں تو خرچ ہی کر دیتا ہوں۔ دوستوں پر، اپنے آپ پر، اپنے بچوں پر۔"

64 "کون سا کردار کرنے کی خواہش ہے؟"

"خواہش تو بہت سارے کردار کرنے کی ہے۔ یہ تو ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بہت ہے۔ تو ابھی تو بہت سے کردار ہیں جو نہیں کیے میں نے۔"

65 "گھر میں بچت کی عادت کس کو ہے؟"

"کسی کو بھی نہیں ہے۔"

66 "کس سیاست دان کا رول کرنے کی خواہش ہے؟"

"یہ بڑا مشکل سوال ہے۔ سوائے قائداعظم کے کوئی رول ماڈل سیاست دان نہیں ہے۔"

67 "کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟"

"ہاں...... مگر سیریس ہو کر نہیں بلکہ مذاق میں مگر کوئی بات صحیح نہیں ہوتی۔"

68 "کس کام کو کرنے کے لیے بہت سوچتے ہیں؟"

"سوچتا تو ہر بات ہوں مگر اسکرپٹ کو لے کر اور اپنے کردار کو لے کر بہت سوچتا ہوں۔"

69 "کس سے بلا جھجک ادھار مانگ لیتے ہیں؟"

"ایک دو دوست ہیں۔ بہت اچھے کبھی چیک دیر سے ملے تو پھر مانگنے پڑ جاتے ہیں۔"

70 "کس کے روٹھ جانے پر پریشان ہو جاتے ہیں؟"

"کوئی بھی روٹھ جائے میں پریشان ہو جاتا ہوں کہ جانے میں نے کیا کہہ دیا ہوگا۔ اور غلطی نہیں ہوتی تو بھی سوری کرتا رہتا ہوں۔"

71 "پسندیدہ موسم؟"

"بہار کا۔ جنوری، فروری، مارچ۔ بہترین موسم ہوتا ہے۔"

72 "گھر میں کس کی زبان کو بریک لگانا مشکل ہے؟"

"گھر میں تین ہی تو لوگ ہیں ان کی زبان کو کیا بریک لگانا۔"

73 "آپ کے گھر میں کون حاتم طائی ہے؟"

"میں خود ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میمن کنجوس ہوتے ہیں وہ مجھ سے مل لیں ذرا۔"

74 "کبھی چھپ کر دوسروں کی باتیں سنیں؟"

"شرارت کی حد تک سنی بہت بار۔"

75 "یوٹیوب پر آپ کا پسندیدہ چینل؟"

"کوئی خاص چینل نہیں ہے۔ وی لاگ دیکھ لیتا ہوں۔ یا پھر ٹاک شو کے چینل۔"

76 "دنیا کی خطرناک مخلوق آپ کی نظر میں؟"

"سوائے لال بیگ کے کوئی خطرناک نہیں ہے۔"

77 "شادی کی کن رسموں کے خلاف ہیں؟"

"جہیز۔"

78 "کون سا کھانا مشکل سے کھاتے ہیں؟"

"ایسا کوئی کھانا نہیں ہے۔ چل جاتا ہے۔ صبر و شکر کے ساتھ کھا لیتا ہوں۔ البتہ یہ جنکس فوڈ مجھ سے نہیں کھائے جاتے۔"

79 "فیملی میں کون مزاج کا گرم ہے؟"

"کوئی نہیں الحمدللہ۔ سب ٹھنڈے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی امی گرم ہو جاتی ہیں۔"

80 "مہینے میں کتنی بار گھر سے باہر کھانا کھاتے ہیں؟" "ہم کسی پارٹی وغیرہ میں تو نہیں جاتے۔ البتہ دوستوں کے ساتھ ضرور عیاشی کرتے ہیں اور مہینے میں آٹھ دس بار ضرور کھانا باہر کھاتے ہیں۔"

81 "کھانا کھانے کا مزہ کہاں آتا ہے۔ ڈائننگ ٹیبل پر اپنے بیڈ پر یا چٹائی پر؟"

"پہلے میں بیڈ پر بیٹھ کر کھاتا تھا۔ تو اب چٹائی پر کھاتا ہوں یا امی کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر کھا لیتا ہوں۔"

82 "اچھی یا بری خبر سب سے پہلے کس کو سناتے ہیں؟"

"اپنی بیٹی کو۔"

83 "کن باتوں سے موڈ خراب ہو جاتا ہے؟"

"پہلے جب ڈیٹ کینسل ہو جاتی تھی یا کردار دے کر منع کر دیتے تھے تو، جب سے میرا اس بات پر یقین ہوا ہے کہ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے میرا موڈ خراب نہیں ہوتا۔ اور رزق لکھا ہوا ہوتا ہے۔"

84 "کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟"

"چائے اور اسموکنگ ...... اگرچہ اسموکنگ بری عادت ہے پر کیا کریں۔ عادت ہو گئی ہے۔"

85 "کیا چیزیں لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"

"موبائل، چابیاں اور والٹ۔"

86 "پسندیدہ جانور؟"

"بلی، کتا۔"

87 "کیا آپ کے اندر بھی ایک ولن ہے؟" "جی ولن بھی ہے۔ ہیرو بھی ہے۔ اداکار ہونے کا یہ فائدہ ہے کہ اپنے اندر کا ولن بھی نکال لیتے ہیں۔ اور ہر طرح کا کردار کر سکتے ہیں۔"

88 "آپ کے گھر میں کون اس فیلڈ میں آنا چاہتا ہے؟"

"کوئی بھی نہیں آنا چاہتا۔ بیٹے کو اجازت ہے کہ وہ آنا چاہے تو آ جائے۔ فیلڈ تو میری نظر میں بری نہیں ہے۔"

89 ”غصے میں پہلا لفظ؟“
”چپ ہو جاؤ بس ......اور پھر غصے کو ضبط کرتا ہوں۔“
90 ”پہلی ملاقات میں شخصیت کی کس چیز کا جائزہ لیتے ہیں؟“
”میں کوئی خاص جائزہ نہیں لیتا کہ عادت نہیں ہے۔“
91 ”شوبز میں آنے کی بنیادی وجہ؟ کس نے متعارف کرایا؟“
”شوق تھا اور کسی نے متعارف نہیں کرایا خود ہی جدوجہد کے بعد آیا ہوں۔“
92 ”مطالعہ کرتے ہیں؟“
”شوق بہت ہے مگر کر نہیں پاتا کہ وقت نہیں ملتا۔“
93 ”اگر سوشل میڈیا نہ ہوتا تو؟“
”تھوڑا نقصان ہوتا۔ سوشل میڈیا کا فائدہ ہم فنکاروں کو زیادہ ہے۔“
94 ”پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟“
”برنس روڈ......اب تو بہت ساری ہو گئی ہیں۔“
95 ”آپ کے موبائل پر صبح وسویرے پہلا میسج کس کا آتا ہے؟“
”بیٹی لندن میں ہے بیٹا یہاں ہوتا ہے۔ جو پہلے اٹھ جاتا ہے وہ کر دیتا ہے۔ اور اگر میں پہلے اٹھ جاؤں تو میں کر دیتا ہوں۔ ویسے تو گڈ مارننگ کے بہت میسج آتے ہیں۔“
96 ”اگر آپ اپنا ریسٹورنٹ کھولیں تو کون سی ڈش کبھی نہ پکنے دیں؟“
”میں نے لوگوں کے لیے کھولنا ہے تو لوگوں کی پسند کا خیال کروں گا۔ اپنی پسند کا خیال کیوں کروں۔“
97 ”اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟“
”مجھے نہیں لگتا کہ میں نے شہرت حاصل کی ہے اور زوال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ویسے بیلنس رکھ کر چلیں تو زوال نہیں آ سکتا۔“

☆☆

معروف مصنفہ

امت العزیز شہزاد سے ملاقات

شاہین رشید

امت العزیز شہزاد کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے جب جب لکھا، انہیں قارئین نے پسند کیا۔ ان کی تحریروں میں جو گہرائی ہے۔ اس میں تجربہ سے زیادہ ان کا مشاہدہ ہے کیونکہ وہ جتنی کم عمر ہیں اور انہوں نے جتنے پیچیدہ کرداروں پہ لکھا ہے۔ اس عمر میں مشاہدہ ہی ہوسکتا ہے۔ تجربہ نہیں۔ زندگی کے دوسرے فرائض کی انجام دہی، گھر کی ذمہ داری اور بچوں کی پرورش کی مصروفیات کے باوجود انہوں نے قلم سے ناتا جوڑے رکھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جتنی باصلاحیت ہیں۔ ابھی تک ان کی پوری صلاحیتیں سامنے نہیں آئیں۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ امت العزیز بہت اچھا لکھ سکتی ہیں، بہت اچھا لکھیں گی (ان شاءاللہ)

"کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمدللہ بالکل ٹھیک ٹھاک۔"

"ایک ڈیڑھ سال قبل ...... تم بہت بیمار ہوگئی تھیں اور بہت ٹائم لگا تھا صحت یابی میں...... ہوا کیا تھا؟"

"دراصل طبیعت کی خرابی کی ابتداء سال ڈیڑھ سال پہلے نہیں ہوئی تھی بلکہ لاک ڈاؤن سے کچھ دن پہلے ہوئی اور پھر لاک ڈاؤن تک سلسلہ جاری رہا۔ وقت گزرتے پتا نہیں چلتا مگر مجھے اپنا یہ کڑا وقت کبھی نہیں بھولے گا۔

لاک ڈاؤن سے کچھ ہی دن پہلے ایک صبح طبیعت میں خرابی پیٹ میں ناقابل برداشت درد سے ہوئی تھی۔ تین دن تک مختلف ٹیسٹ ہوتے رہے۔ بالآخر پتا چلا کہ بھئی پتے میں پتھری ہے بلکہ پتھری نہیں بلکہ پورا پہاڑی سلسلہ تھا، جس سے نجات کی واحد صورت آپریشن تھا جو کہ نہیں ہوسکتا تھا کہ لاک ڈاؤن ہوگیا تھا۔

خیر آپریشن تو کروانا ہی تھا سو لاک ڈاؤن کے خاتمے کے بعد پہلی فرصت میں کروالیا گیا اور آپریشن کے کچھ ہی دن بعد امبیلیکل ہرنیا کے ساتھ ساتھ تیسری بار پرامید ہونے کی خبر دل پر دھچکا بن کر گری۔

اس وقت میں نے کراچی کی ہر گائناکولوجسٹ کے در



پر حاضری دے ڈالی تھی اور سب کا یہی کہنا تھا کہ چونکہ تمہاری دو بیٹیاں ہیں اور امبیلکل ہرنیا کے آپریشن کے بعد فیملی میں مزید اضافہ ممکن نہیں ہوگا تو جو ہو گیا ہے اسے ہونے دو۔ سو کہتے ہیں نا کہ ”سر منڈاتے ہی اولے پڑے“ تو بس آنے والے کی تیاری شروع کر دی رو دھو کے ...... مگر آزمائش ابھی باقی تھی۔ اصل میں ڈاکٹروں کی غفلت سے دوران سی سیکشن ڈاکٹر سے کوئی اوزار لگ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے بار بار پیٹ میں خون بھر جاتا تھا۔ ڈیڑھ ماہ میں تین بار آپریشن تھیٹر کا منہ دیکھنا پڑا۔ چار ماہ بس بستر پر سیدھی لیٹی رہی۔ بچے، گھر، نظام زندگی سب ڈسٹرب ہو گئے زندگی تھی تو بچ گئی۔ خیر بہت کڑا وقت تھا جو گزر گیا۔ اللہ نے تیسری بار رحمت سے نوازدیا۔“

”آپ کے نام کا کیا بیک گراؤنڈ ہے؟“

”نام کا بیک گراؤنڈ کچھ یوں ہے کہ میرے والد کو ایک بزرگ سے نسبت تھی۔ میری پیدائش پر میرے والد صاحب نے ان بزرگ سے میرا نام رکھنے کی درخواست کی ”امتل عزیز“ ان بزرگ کی والدہ کا نام تھا جو انہوں نے میرا رکھ دیا ”امتل“ کے معنی بندی کے ہیں اور عزیز اللہ کا صفاتی نام ہے تو یوں میرے نام کا مطلب ہوا ”اللہ کی بندی“ لیکن اکثریت عزیز کو میرے والد کا نام سمجھتی ہے جبکہ میرے والد کا نام معین الدین ہے۔

اکثر لوگ میرا نام پوچھ کر اور جواب سن کر چونک جاتے ہیں کہ آپ کا نام پوچھا ہے، تو میں یہی کہتی ہوں کہ میرا نام ہی ”امتل عزیز“ ہے تو نام کے حوالے سے اکثر بڑے مزے کی صورت حال بن جاتی ہے۔

جب لکھنا شروع کیا، تب تک میں نکاح شدہ ہو چکی تھی تو بڑے معصومانہ انداز سے شہزاد کا نام بھی ساتھ لگا دیا اور یوں نام ضرورت سے زیادہ لمبا ہو گیا۔“

”ہماری مدیرہ امت الصبور ہیں اور آپ امت العزیز کبھی کنفیوژن ہوا؟“

”کنفیوژن تو ایک آدھ ہی کوئی ہوا ہوگا ورنہ جو بھی ملتا ہے وہ پورے وثوق سے کہتا ہے کہ آپ امت الصبور ہیں۔ اور اس نام کی وجہ سے مجھے بہت مزے مزے کے تجربات ہوئے ہیں کچھ نے کہا آپ بہت اچھی ہیں کچھ نے کہا آپ روڈ ہو جاتی ہیں۔ آپ اللہ سے ڈریں۔ آپ جواب نہیں دیتیں۔ خوار کراتی ہیں اور کچھ نے بہت تعریف کی کہ آپ کی وجہ سے ڈائجسٹ کی مقبولیت قائم ودائم ہے...... اور جب میں بتاتی ہوں تو کچھ تو شرمندہ ہو کر معذرت کر لیتے ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ آپ چھپا رہی ہیں ہم سے۔ ہم آپ کے ”ان باکس“ میں اپنی کہانیاں بھیجیں گے اور اب تو ان بکس میں یا انسٹاگرام میں اس طرح کا کوئی میسج آتا ہے تو میں جواب ہی نہیں دیتی۔ اور یہ بات میں امتل صاحبہ سے شیئر کر چکی ہوں اور کہتی ہوں کہ آپ کی ہمت کو داد دیتی ہوں کہ آپ کیا کیا برداشت کرتی ہیں۔ ایک آدھ رائٹر سے تو میں نے امت الصبور بن کے بات کی اور جب انہوں نے امتل کو فون کیا تو امتل نے کہا کہ میں نے تو آپ سے بات ہی نہیں کی۔ تو اس طرح کے چھوٹے موٹے مذاق تو ہوتے رہتے ہیں۔“

”فیملی بیک گراؤنڈ؟“

”جی میں کراچی سے تعلق رکھتی ہوں 20 فروری 1985ء میں۔ مجھ سے بڑے ایک بھائی ہیں پھر میں ہوں۔ اور آپ کو بتاؤں کہ ہماری دادی کا گھر کافی بڑا تھا اور ہر وقت خاندان کے لوگوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی اور قیام بھی ...... اور میں نے اپنے ہوش میں دادی چچا چچی، پردادی کے بھائی کی بیٹیاں دادی کے بھائی کے بچے جو اکثر ہمارے ہی گھر میں رہ رہے ہوتے تھے۔ سب کزن تھے اور اس وقت یہ سب ٹین ایجر ہی ہوں گے تو جب میری، پیدائش کا وقت آیا تو میری پیدائش کا سن کر سب ہی مجھے دیکھنے اسپتال آئے۔ اور فیملی میں چونکہ بہت وقت کے بعد کوئی بچہ پیدا ہوا تھا تو سب نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور امی بتاتی ہیں کہ سب نے میری

بہت خدمتیں کیں......اور پھر فیملی میں مزید اضافہ ہوا اور میرے بعد چار اور اس دنیا میں آئے جن میں دو بہنیں اور دو بھائی......اور یوں ہم ٹوٹل چھ بہن بھائی ہو گئے۔ یعنی تین بھائی تین بہنیں میرا نمبر دوسرا ہے۔

میرے والد کا تعلق اجمیر سے ہے اور امی کا بمبئی سے حالانکہ دونوں کزن ہیں۔ پھوپھی ماموں کے بچے ہیں۔ میرے والدین۔ امی نے بمبئی یونی ورسٹی سے ہی اپنی تعلیم مکمل کی۔ امی بزم ادب کمیٹی کی ممبر تھیں۔ انہیں اردو ادب سے گہرا لگاؤ تھا کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا اور انہی سے یہ شوق ہم میں منتقل ہوا ہے۔ میرے نانا افغانستان سے مائیگریٹ کر کے آئے تھے وہ پٹھان تھے۔

میری شادی میری کم عمری میں ہی ہو گئی تھی جب میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی میرا نکاح ہو گیا تھا اور دو تین سال کے بعد رخصتی ہوئی تھی اور اپنی بقیہ تعلیم شادی کے بعد مکمل کی۔ اور ”آئی آر“ میں ماسٹرز کیا ہے اور میری تین بیٹیاں ہیں زینب، زویا اور وجیہہ۔ بڑی آٹھ سال کی ہے دوسری چھ سال کی اور میری آخری پیس دو سال کی ہے۔ وہ 28 دسمبر کو دو سال کی ہو گئی ہے۔

اور لکھنے پڑھنے کے حوالے سے فی الحال کوئی مصروفیات نہیں ہے کیونکہ دو ماہ قبل ہی ”والعصر“ ختم ہوا ہے۔ بہت سی چیزیں چل رہی ہیں پائپ لائن میں۔ دیکھیں ان کا کیا بنتا ہے۔

بچپن تو میرا الگ بھگ ایسا ہی گزرا جیسا کہ آج کل کے بچوں کا اور ہمارے دور کے بچوں کا گزرتا ہے۔ بچپن میں شرمیلی تھی مگر سگھڑ نہیں تھی۔ شرارتی تھی مگر تخریب کار نہیں تھی یعنی نقصان کرنے والی شرارتیں نہیں کرتی تھی۔ مگر ایک بار یہ دیکھنے کے لیے لالٹین جلتی کیسے ہے کام کیسے کرتی ہے میں نے اس کی ناب لگا دی تھی لیکن اللہ کا شکر ہے کہ بروقت چاچا نے دیکھ لیا تھا تو پانی دے کر آگ بجھا دی تھی۔ ڈانٹ پڑی تھی اور مار پڑنے سے پہلے ہی دادی اور پردادی بچانے کے لیے آ جاتی تھیں۔

ابا بہت اچھے تھے مگر غصے کے تیز تھے......اور بچپن میں کیا چیز تھی جو میں نہیں بنی، نائی، حلوائی، قصائی سب کے کردار میں نے نبھائے، فقیر پیر بابا بھی بن چکی ہوں اور میرے چھوٹے بہن بھائی میرے پیچھے پیچھے ہوتے تھے اور کزنوں کو بھی ملا لیا کرتی تھی۔ ہر شرارت میں سب کو لیڈ کر رہی ہوتی تھی اور کھیل کود بہت کیا کیونکہ گھر کی چھت بڑی تھی تو تمام کھیل چھت پر ہی کھیل لیتے تھے۔ بچپن سے ہی رابن ہڈ بننے کا شوق تھا اور چاہتی تھی کہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دوں کہ سب حیران رہ جائیں۔ میرے اندر یہ جذبہ بھی تھا کہ میں دوسروں کی مدد کروں۔

ٹیچر بننے کا شوق تھا تو ٹیچر بھی بنی۔ پتا نہیں کیا کیا، کیا میں نے...... پتنگ بھی اڑائی۔ کرکٹ بھی کھیلی۔ لائیو کوکنگ شو بھی بچپن میں کیا۔ بہت ڈانٹ پڑی اماں سے کھڑکی کے باہر بیٹھ کر کچن میں کوکنگ کی اور بہن کو کچا کھانا کھلا دیا۔

ایک دفعہ میں نے سوچا کہ ڈاکو والا کھیل کھیلتے ہیں۔ فرضی گھوڑے دوڑا دیے تھے مغرب کے وقت اور چھوٹی بہن کو چھت پر چھوڑ کر تالا لگا کر واپس آ گئی۔ بعد میں امی کو اس کے رونے کی آواز آئی تو میں نے بتایا۔ امی نے بھائی کو کہا کہ جاؤ اسے لے کر آؤ۔ بس اس پر بھی بہت ڈانٹ پڑی۔

دس سال کی عمر میں ہم الگ گئے، دادی مجھے اپنے ساتھ لے گئیں اور ان کے پاس چار پانچ سال رہی تو مجھ میں کافی چینج آ گیا، پھر کتابیں تھیں اور میں تھی لکھنا پڑھنا میری زندگی کا حصہ بن گئے۔ بس وہ لڑکپن کا دور بہت اچھا گزرا۔

پڑھائی میں کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے صبح جلدی اٹھنے سے نفرت تھی۔ نفرت ہے اور نفرت رہے گی۔ مجھے صبح اٹھنا بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ سب سے بری بات مجھے یہ لگتی تھی کہ صبح اٹھ کر اسکول جاؤ اور وہاں کھڑے ہو کر ترانے پڑھو......اور پھر کلاس میں بیٹھ جاؤ۔ مجھے روٹین لائف سے نفرت ہے کہ کیا روز ایک جیسا کام کرو۔

اسکول میں کسی سے زیادہ دوستی نہیں تھی...... اور اسکول کی چھٹی تو میں اکثر ہی کر لیتی تھی۔ پہلی سے پانچویں تک میری پوزیشن آئی اور پھر میٹرک میں آئی۔ مجھے میرے ٹیچرز پسند کرتے تھے کہ تم اچھا پڑھتی ہو۔ مگر توجہ نہیں دیتی ہو پڑھائی میں...... تو پتا نہیں کیوں نہیں توجہ دیتی تھی میں شاید صبح اٹھنا اچھا نہیں لگتا تھا۔

ابو کو بہت شوق تھا کہ میری اولاد اعلا تعلیم حاصل کرے اور چونکہ امی کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا تو ابو نے ہمارے لیے بھی نونہال، پھول، تعلیم و تربیت لے کر آتے تھے۔ بڑے بھائی کو شاعری سے لگاؤ تھا تو ان کے پاس شاعری کی کتابیں ہوتی تھیں۔ تو صرف ہمارے ہی گھر میں کتابیں ہوتی تھیں باقی کسی کے پاس نہیں ہوتی تھیں۔ باقی سب کو فلمیں دیکھنے اور گانے سننے کا شوق تھا اور جب میں باشعور ہوئی تو میں نے دیکھا کہ سب کی ڈیڑھ انچ کی مسجد ہے۔ تو سب کا اپنا حساب کتاب تھا۔ جس کو جو اچھا لگتا تھا وہ وہی کرتا تھا۔

چونکہ دس سال کی عمر میں، بہن بھائیوں سے الگ ہو گئی تھی تو ان سے ایسی باؤنڈنگ نہیں ہوئی کہ جس کا ذکر کیا جائے۔ دوستی والی بات نہیں ہوتی۔ بس میری اپنی ایک دنیا ہوتی تھی جس میں میگزین ہوتے تھے، ڈائریاں ہوتی تھیں۔ پین اور رجسٹرڈ ہوتے تھے اور میں ہوتی تھی تو دادی کے گھر میری اپنی ایک دنیا ہوتی تھی۔ انیس سال میں میری شادی ہو گئی تھی۔ اب جبکہ والدین اس دنیا میں نہیں ہیں تو بہنوں بھائیوں سے میل ملاپ رہتا ہے اور جب وہ کہتی ہیں کہ تم تو ہمارے پاس نہیں رہیں تمہیں کیا پتا تھا کہ کیا ہوتا تھا۔"

"والدین سے دور کیوں ہو گئی تھیں آپ؟"

"دراصل ہم سب دادا دادی کے گھر میں رہتے تھے۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ سب کی فیملیز الگ الگ گھروں میں شفٹ ہونے لگے تو دادی اور پردادی اور چھوٹے چاچا جن کی شادی نہیں ہوئی تھی یہ الگ گھر لے رہے تھے اور چونکہ میں گھر میں سب کی لاڈلی تھی تو پردادی اور دادی کو بھی مجھ سے بہت انسیت تھی، جب ہم جوائنٹ فیملی میں تھے۔ تب بھی میں ان ہی کے کمرے میں رہتی تھی اور چاچا تو جہاں جاتے تھے مجھے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ مجھے جب اتنا پروٹوکول ملتا تھا تو میں نے ان ہی کے ساتھ جانا تھا اور وہ بھی اپنی خوشی سے مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور امی ابو نے بھی اجازت دے دی۔ امی ابو کو بھی اتنا اندازہ نہیں تھا کہ یہ فیصلہ کیسا ہوگا۔ بہرحال زندگی تو بہت سکھ کی گزاری مگر اپنے سگے بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ ریلیشن میں گیپ آگیا۔ اب تو خیر اللہ کا شکر ہے کہ یہ گیپ کافی حد تک کم ہو گیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ والدین کو کسی ایک بچے کے ساتھ زیادہ پیار ہوتا ہے۔ میں بھی ان کی لاڈلی شاید ان سے دور چلی گئی تھی تو میرے بہن بھائیوں کو بھی لگتا تھا کہ امی ابو کو، اجمل کے ساتھ زیادہ پیار ہے کہ اسے گفٹ بھی دیتے ہیں اور اس کی سالگرہ بھی اہتمام سے مناتے ہیں۔ تو سب کو یہ شکوہ تھا......

خیر پھر ایک وقت آیا کہ چھوٹا بھائی امی کے قریب ہو گیا۔ ابو تو بہت جلدی چلے گئے تھے اس دنیا سے...... اور مجھے یاد ہے کہ جب میں چار سال کی تھی تو میری بسم اللہ تھی اور اسی دن مجھے دمہ کا اٹیک ہوا۔ اس وجہ سے بھی مجھے زیادہ توجہ ملنے لگی کہ میں تھوڑی بیمار رہنے لگی تھی اور جب استھما کا اٹیک ہوتا تھا بہت خطرناک صورت حال ہو جاتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے بھی زیادہ چاہی جاتی تھی۔ لیکن پھر مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ یہ میرا وہم تھا، ورنہ والدین تو سب کو ہی ایک جیسا پیار کرتے ہیں کیونکہ میں ماں ہوں تو میں تو سب کو ایک جیسا پیار اور توجہ دیتی ہوں۔"

"اب آجائیں آپ لکھنے کی طرف...... تو لکھنے کا سلسلہ کب سے شروع ہوا؟"

"آپ کو میں نے بتایا کہ رسائل پڑھنے کی عادت تو بچپن سے ہی ہو گئی تھی کیونکہ امی پڑھا کرتی تھیں۔ خواتین اور شعاع بچپن سے ہی ہمارے گھر

آتا تھا۔ ڈائجسٹ پڑھنے سے زیادہ مجھے افسانوں کے ساتھ جو اسکیچ بنے ہوئے تھے وہ مجھے بہت متاثر کرتے تھے تو میں شروع شروع میں ان جیسی تصاویر بنانے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ پینٹنگ کا مجھے بچپن سے شوق تھا وہ بھی کیا کرتی تھی۔ اور لکھنے کا معاملہ یہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے مضامین لکھا کرتی تھی اور عنوان دے کر لکھا کرتی تھی جیسے پانچ ارکان پر لکھا۔ مائی سیلف پر لکھا اور پھر کہانیاں لکھنے لگی۔

کبھی کسی نے سراہا نہیں، کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ آپ میں صلاحیت ہے۔ بس ہم تو خود رو پودے کی طرح بڑے ہوئے۔ ہاں دوستوں کو معلوم تھا کہ میں لکھتی ہوں تو انہیں جب کسی سچویشن پر لکھوانا ہوتا تھا تو وہ میرے پاس آ کر کہتی تھیں کہ اصل، اس سچویشن پر لکھ دو تو میں لکھ دیتی تھی۔ پیروڈی بھی لکھ دیتی تھی۔

میں نے ایک رجسٹر بنایا ہوا تھا جس پر لکھا کرتی تھی وہ رجسٹر آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ جب میچور ہوئی تو کرن پڑھنا شروع کیا۔ یعنی ٹین ایج سے پہلے۔ اس زمانے میں نبیلہ ابر راجہ کی کہانیاں لگنا شروع ہوئی تھیں تو وہ میں نے پڑھیں اور عمر کے حساب سے بہت اچھی لگیں۔ پھر میں نے خواتین ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا۔ پھر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک دو کہانیوں کے بارے میں امی کہتی تھیں کہ انہیں پڑھو۔ پھر خواتین ڈائجسٹ میں کتابوں پر تبصرہ اور اقتباس دیکھ کر وہ کتابیں بھی خرید کر پڑھنا شروع کیں۔ پڑھتے پڑھتے پھر میں نے شفیق الرحمٰن کو پڑھا۔ ابن انشاء کو پڑھا اور دیگر مصنفین کو بھی پڑھا اور ان کو پڑھ کر کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں بھی ایسا لکھ سکتی ہوں۔ بالکل بھی نہیں، ہرگز بھی نہیں۔

اور میں بہت توجہ کے ساتھ بہت لگن کے ساتھ فائزہ افتخار کو، راحت جبیں کو، فاخرہ جبیں کو، ثمرہ بخاری کو، ان کو میں بہت اولین ترجیح کے ساتھ پڑھتی تھی اور یہ ہمیشہ سے میری پسندیدہ رہی ہیں اور ابھی بھی ہیں۔

پھر ہوتا یہ تھا کہ کوئی چیز مجھے پریشان کرتی تھی میرے مزاج سے ہٹ کے اور جوں جوں میں بڑی ہوتی گئی، مجھ پر یہ انکشاف ہوتا گیا کہ جو میرے اردگرد رہتے ہیں یا میں جہاں موجود ہوں وہ ذہنی طور پر مجھ سے مطابقت نہیں رکھتے۔

یہ میرے لیے ایک تکلیف دہ انکشاف تھا۔ اچھا یہاں پر غلط صحیح والی بات نہیں تھی، وہ اپنی جگہ ٹھیک ہوں گے اور میں اپنی جگہ...... کیونکہ میری اپنی ایک سوچ تھی۔ ہاں تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ اگر مشرق تھے تو میں مغرب تھی۔ تو جب آپ کی بات سننے والا اردگرد میں کوئی نہیں ہوتا تو بہت گھٹن ہوتی ہے۔ پھر جو چیز مجھے ڈسٹرب کرتی تھی پھر میں اس کو لکھتی چلی جاتی تھی ڈائری بھی لکھ دی۔ رجسٹر بھی بھر دیا اب کیا کریں۔

اچھا میری یہ عادت ہے کہ جب میں سونے کے لیے لیٹتی ہوں تو مجھے فوراً نیند نہیں آتی بلکہ میرا ذہن چلتا رہتا ہے اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات کر رہا ہوتا ہے تو میرے ذہن میں علیحدہ ایک گفتگو چل رہی ہوتی تھی کہ میں اس کو یہ جواب دوں اور میں جواب دے نہیں پاتی تھی اس زمانے میں...... بعد میں خیال آتا تھا کہ مجھے تو یہ کہنا چاہیے تھا۔

خیر پھر ہوا یہ کہ میرا نکاح ہو گیا۔ نکاح کے بعد دو سال اپنے گھر میں رہی۔ وہ بھی ایک الگ قسم کا مشکل کا دور تھا، پھر ایک دن ایسا ہوا کہ لیٹے لیٹے کچھ ڈائیلاگ میرے ذہن میں آئے ایک کے بعد ایک دو بدو...... تو میں نے سوچا کہ اس کو تو میں کہانی کی طرح لکھ سکتی ہوں، یہ بات ہے 2005ء کی ذہن میں آئی اس بات کا ذکر میں نے اپنے میاں صاحب سے اور گھر کے دیگر افراد سے نہیں کیا اور سب سے چھپ کے میں نے ایک افسانہ لکھا جو کہ بہت ہی ناپختہ سا تھا لکھ کر میں نے کرن میں بھیج دیا۔ کہانی یا افسانہ ناقابل اشاعت ہو گیا۔ تین ماہ بعد میں نے ریحانہ علی کو کرن میں فون کیا۔ انہوں نے بڑے اچھے طریقے سے بات کی اور معذرت کی اور کہا کہ "مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے مجھے کوئی ڈنڈے سے مار رہا

ہے تم نے ایسا لکھا ہے......" مجھے ان کے یہ جملے آج تک یاد ہیں۔ میں بہت شرمندہ ہوئی مگر انہوں نے کہا کہ تم کچھ اور لکھ کر بھیجو۔

میں نے معاشرے کا ایک جلتا چبھتا سنگین موضوع لیا اور لکھ دیا...... پھر معذرت ہو گئی ناقابل اشاعت...... پھر میں نے تیسری بار لکھا۔ وہ بھی ریجیکٹ ہو گیا۔ اور اس چکر میں 2007ء آ گیا...... اور 2007ء میں میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ تو لکھنے میں اور بھی گیپ آ گیا۔

خیر میں نے پھر کرن میں کچھ لکھ کر بھیجا تو ریحانہ نے مجھ سے تفصیل سے بات کی اور کہا کہ "تمہارے اندر صلاحیت تو ہے تم لکھ سکتی ہو اور تم ایسا کرو کہ کسی ہلکے پھلکے موضوع پر لکھ کر بھیجو تو میں اسے شائع کر دوں گی۔"

میں نے کہا چلیں ٹھیک ہے تو میں نے پھر ایسے بچوں کی کہانی یا افسانہ لکھا جن کو دنیا نظر انداز کرتی ہے یعنی "کم روح" بچے جن کے اندر بھی چاہت کی ایک رمق ہوتی ہے اور جب دنیا انہیں نظر انداز کرتی ہے تو ہم پر کیا گزرتی ہے۔ افسانے کا نام "سرابوں کا سفر" تھا۔ وہ شائع ہو گیا۔ میں نے سوائے اپنے میاں صاحب کے کسی کو نہیں بتایا تو انہوں نے کہا کہ اچھا پڑھاؤ تو سہی کہ تم کیا لکھتی ہو۔ میں نے پھر بھی ان کو نہیں دکھایا پڑھایا۔ آپ کو ایک مزے کی بات بتاؤں کہ انہی دنوں میں نے نیا نیا عبایا اور اسکارف پہننا شروع کیا تھا اور اس سے پہلے میں صرف دوپٹہ پہنتی تھی۔ جب میں ہاکر کے پاس گئی اور کرن میں لسٹ میں اپنا نام دیکھا میں نے اچھلنا شروع کر دیا۔ بچوں کی طرح سے۔

تو ہاکر ہنسنے بھی لگا اور عجیب نظروں سے بھی دیکھنے لگا میرے ساتھ میری جو بہن تھی حیران ہو کر پوچھنے لگی کیا ہوا۔ میں نے کہا کہ میرا افسانہ چھپا ہے اس کو یقین ہی نہیں آ رہا۔ ہاکر سے ہمارے گھر کا راستہ پیدل کا تھا تو جب گھر آ کر میگزین کھول کر دکھایا تو تب امی کو اور بہن کو یقین آیا کہ میں نے لکھا ہے۔

2008ء میں میری رخصتی ہو گئی اور میرے لکھنے میں پھر گیپ آ گیا۔ 2010ء میں، میں نے دوبارہ لکھنا شروع کیا اور اب کی بار میں نے اپنی تحریر ڈائریکٹ امت الصبور کو بھیج دی اور یہ بات ہے 2012ء کی...... امتل کو جو افسانے بھیجے وہ چھپ گئے تھے۔ ہاں ایک ناول مجھے امتل نے واپس بھیجا کہ اس کو ٹھیک کر کے بھیجو ان کے حساب سے کچھ تبدیلیوں کی ضرورت تھی اور میں نے تبدیل کر کے دیا۔ مگر اس کو بھی دو تین سال لگ گئے۔

2012ء میں، میں اپنے میاں کے پاس باہر چلی گئی اور وہاں کچھ عرصہ رہی...... اور جب 2014ء میں واپس آئی۔ جو ناول امتل نے صحیح کرنے کے لیے بھیجا تھا وہ میں نے دوبارہ امتل کے ساتھ ساتھ پاکیزہ ڈائجسٹ کو بھی بھیج دیا۔ اب مزے کی بات یہ ہوئی کہ پاکیزہ والوں نے تو پڑھا ہی نہیں۔ میرا ناول کہاں گیا مجھے کچھ پتا ہی نہیں۔

خیر جب میرا "شہر آشوب" چھپ گیا بلکہ ابھی چل ہی رہا تھا کہ پاکیزہ کے آفس سے فون آیا کہ آپ امتل بات کر رہی ہیں میں نے کہا جی تو کہنے لگیں کہ افسانوں کے ڈھیر میں سے آپ کا ایک افسانہ ملا ہے یہ نام ہے (نام مجھے ابھی یاد نہیں آ رہا) تو میں نے کہا کہ جی جی۔ یہ میرا ہی افسانہ ہے۔ تو کہنے لگیں کہ اگر یہ افسانہ کہیں نہیں لگا تو ہم لگا دیں۔ میں نے کہا جی لگا دیں تو وہ کب لگا، نہیں لگا مجھے کچھ نہیں معلوم۔ پھر میں نے سوچا کہ جہاں آپ کی تحریریں عزت کے ساتھ لگ رہی ہیں تو پھر آپ وہیں یعنی انہی کے لیے لکھیں۔ پھر میں نے اپنی تحریریں کرن، شعاع اور خواتین کے علاوہ کسی کو نہیں بھیجیں۔"

"افسانوں اور ناولز کے نام رکھتے وقت ذہن میں کیا بات ہوتی ہے؟"

"پوری کہانی لکھنا ایک طرف اور کہانی کا عنوان لکھنا ایک طرف...... میں بہت سوچ بچار کے بعد نام رکھتی ہوں کہ کہانی سے مطابقت رکھتا ہو، کچھ

ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے کہانی لکھی اور کھٹ سے نام ذہن میں آ جاتا ہے کہ اس کا تو یہ عنوان ہونا چاہیے۔ جیسے میں نے ایک افسانہ لکھا تو اس کا عنوان ہی ہی ہی (جو کھسیاہٹ زدہ ہنسی ہوتی ہے) اور ایک افسانے کا عنوان تھا ''ٹک ٹک'' تو میں اس طرح کے مختصر نام رکھتی ہوں تا کہ لوگ فوری طور پر میری تحریر اور پھر میری کہانی کی طرف متوجہ ہوں۔ میں موضوع کے حساب سے ہی نام رکھتی ہوں اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ نام کچھ اور ہو اور کہانی کچھ اور ہو اور نام میں ہی رکھتی ہوں اپنی تحریروں کا...... ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے نام بدل دیا ہو یا تجویز دی ہو کہ یہ نہیں یہ نام رکھو۔''

''لکھنے کے کیا اوقات ہیں آپ کے؟''

''جب میں سنگل تھی تو میں پوری رات جاگ کر لکھا کرتی تھی اور پھر فجر کی نماز پڑھ کر سو جاتی تھی۔ لیکن جب شادی ہوئی اور بچے ہو گئے تو روٹین بالکل بدل گئی۔ پھر میں جب ٹائم ملتا تھوڑا تھوڑا کر کے لکھ لیتی تھی ...... اور جب میں ''والعصر'' لکھ رہی تھی تو رات بارہ بجے تک بچوں کو سلا کر لکھنے لگ جاتی تھی اور صبح چھ سات بجے تک لکھ کر سو جایا کرتی تھی۔ اب میری یہ ٹائمنگ سیٹ ہو گئی ہے تو اسی پہ لکھتی ہوں۔

اور جناب پلاٹ کا کیا ہے۔ کبھی بھی کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ ایک منظر دیکھ رہے ہیں تو وہ منظر پلاٹ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کسی کا منافقانہ رویہ دیکھ رہے ہوتے ہیں تب بھی پلاٹ ذہن میں آ جاتا ہے۔ میں نے ایک ڈائری بنائی ہوئی ہے اور میں پلاٹ کا ون لائنر اس میں لکھ لیتی ہوں اور عنوان کے ساتھ لکھ لیتی ہوں۔

اب تک کیا کیا لکھ چکی ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ افسانے تو کافی سارے لکھے ہیں مگر ناولز کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ یہی کوئی چار پانچ ہوں گے۔ ان میں شہر آشوب ''والعصر'' قسط وار شائع ہو گئے۔ ناولٹ بھی چھ سات ہی ہوں گے البتہ افسانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ کتابی شکل میں شہر آشوب۔ من دیپک راگ محبت یہ ناولوں کا مجموعہ ہے اور ''والعصر'' کتاب تو تیسری ہے مگر پبلشر نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ بس تو فی الحال یہی ہے۔

کرن میں میرا جو افسانہ شائع ہوا تھا اس کا اعزازیہ تو مجھے نہیں ملا تھا البتہ اصل نے جو میرا افسانہ شائع کیا تھا اس کا اعزازیہ ہزار روپے تھا۔ کرن کا مجھے یاد نہیں آ رہا کہ دیا تھا یا نہیں۔''

''گوگل پہ اپنا نام دیکھ کر کیسا لگتا ہے؟''

''2014ء کی بات ہے میں نے پہلی بار جب گوگل پہ اپنا نام دیکھا تو بہت خوشی ہوئی۔ میرا ایک ناولٹ شائع ہوا تھا ''بارش روٹھ بھی جائے'' کے نام سے اور اتفاق سے اپنا نام دیکھا۔ میں گوگل پہ کوئی چیز سرچ کر رہی تھی تو ایک دم سے مجھے اپنا نام لکھا نظر آ گیا اور جب سرچ کیا تو میری کہانی شائع ہوئی تھی۔

اور یہ آپ کو بتا دوں کہ گوگل پہ جو تعارف دیتے ہیں وہ سب کے لیے ایک ہی الفاظ لکھے ہوتے ہیں اس لیے زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہاہاہا ...... لیکن اس بات سے قطع نظر مجھے اس وقت بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔ میری ایک جیٹھانی جو میری تحریریں بڑے شوق سے پڑھتی ہیں تو انہوں نے مجھے بتایا کہ تمہارا نام گوگل پہ ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ بھی شائع ہوئے ہیں۔ جب میں نے دیکھا تو مجھے حیرت ہوئی کہ اچھا میں نے اتنا کچھ لکھ لیا ہے اور یہ میں بالکل کسی زعم میں نہیں کہہ رہی کیونکہ جتنی میں سست ہوں اور جتنی میں غیر مستقل مزاج ہوں اس نے یہ سب کچھ کیسے کر لیا۔ تو اس وقت میں نے اپنے آپ کو شاباش دی کہ واہ میں نے اتنا کچھ لکھ لیا ہے۔''

''آپ کے اپنے افسانے یا ناول میں کسی جیتے جاگتے انسان کا عکس ہے؟ اور جب اس نے پڑھا ہو تو سوچا ہو کہ یہ تو مجھ پر لکھا ہے۔''

''ہاہاہا...... اس کا جواب یہ ہے کہ

جاری ہے۔



نادیہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37۔اردو بازار کراچی۔
Email:Info@khawateendigest.com

فرحانہ مہناز......اسلام آباد

جنوری کا خواتین سادہ سے ٹائٹل کے ساتھ بہت اچھا لگا۔ پیاری آپی! پچھلے سولہ سال سے آپ کے ادارے میں لکھ رہی ہوں اب تو اتنی عادت ہوگئی ہے کہ خط آنکھیں بند کر کے لکھ لوں لیکن پتا نہیں کیوں ایسے لگتا ہے کہ اب خط لکھنے کا انداز بھولنا شروع ہوگیا جبکہ میری نئی آنے والی قارئین بہت مزے کے اور دلچسپ خط لکھتی ہیں۔ پڑھ کر سکون اور خوش گوار کیفیت ہوتی ہے۔ آپی میں پچھلے چوبیس سالوں سے ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں ،پلیز اب تو مجھے بھی رائٹر بننے میں مدد کریں۔

اب آتے ہیں خواتین ڈائجسٹ جنوری کے سروے کی طرف ،سب قاری بہنوں نے بہت اچھے اور منفرد جواب دیے،سب کی ڈائجسٹ سے محبت اور اپنے گھر کے افراد اور اپنے دوستوں سے اپنائیت ان کے خطوط سے ثابت ہوتی ہے۔ میرا سروے میرے موبائل اسٹیٹس سے پڑھ کر میری پرانی دوستوں نے رابطہ کیا کہ آپ نے کالج کا زمانہ یاد کروادیا اور ساتھ رلا بھی دیا۔ آپ کا جذباتی سا سروے بہت اچھا لگا۔ گوجرانوالہ سے میری دوست حفصہ سعید سے اتنے عرصے بعد بات ہوئی تو کہنے لگی فرحانہ ماشاء اللہ تمہاری اردو کتنی اچھی ہوگئی ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ڈائجسٹ پڑھنے کا کمال ہے۔

''احد'' ناول اختتام پذیر ہوا۔ بہت اچھا رہا صوفیہ جی نے سب کرداروں کے ساتھ انصاف کیا۔ اسود نے احتل کے لیے اپنی محبت کو چھوڑ دیا جبکہ مہرتاب کی محبت اسے سونپ دی کہ کوئی تو اپنی محبت پالے۔ عہد الہادی کے لیے تو یہی بہت تھا کہ اسے لاریب پر پختہ یقین ہوگیا۔ محبت نہ بھی ملتی تو خیر تھی پھر اگر وہ اسود کو مل جاتی تو کیا تھا۔ یہ میرا خیال ہے باقی اس سے متفق ہوں ضروری نہیں۔

مالا کے بارے میں کیا کہوں پلیز نمرہ جی مالا کو لمبا نہ کریں۔ پردیس اچھا جا رہا ہے۔ لیکن پردیس میں زیادہ نہیں رہا جا سکتا۔ ''انگنا پھول کھلیں گے'' اف راحت جی آپ کے میاں اسلم صاحب کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا، اللہ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آپ کے میاں کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں مقام عطا فرمائے۔ آپ کی خوب صورت روانی میں لکھی تحریروں کی تو میں بہت قدر کرتی ہوں شاید آپ نے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ 2004 میں آپ کی شادی ہوئی تو پھر ازدواجی تعلق بہت کم رہا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر دے۔ شازیہ جمال طارق کا سنا تو دلی افسوس ہوا۔ دن تیزی سے گزر رہے ہیں اور دنیا کا کھیل تماشا اپنے سفر کی طرف رواں ہے۔

پیاری فرحانہ! فرزانہ چیمہ کی رحلت کے بارے میں ماہنامہ عفت سے پتا چلا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے بہت اچھا لکھتی تھیں۔

آپ کا افسانہ ایک یاد مل گیا ہے۔ فرحانہ آپ میں صلاحیت ہے۔ آپ کہانی اور کردار نگاری پر توجہ دیں خصوصاً کلائمکس پر، آپ بہت اچھا لکھ سکتی ہیں۔

عائشہ لطیف......مظفر گڑھ

اللہ تعالیٰ کی ذات کے بعد والدین کے علاوہ کسی کو

مخلص، ہمدرد اور رہنما پایا ہے تو وہ ہیں عمیرہ احمد۔ سمجھ میں نہیں آرہا خط کیسے لکھوں۔

آپ تک پہنچتا ہے یا نہیں۔ اپنی زندگی کے جتنے سال ہیں وہ میں نے پڑھنے کا شوق کو پورا کرنے میں گزارے ہیں۔ میں نے سب سے پہلے عمیرہ احمد کا ناول "یہ جو اک صبح کا تارا ہے" پڑھا تھا۔ میرے کچے ذہن پر اتنا اثر ہوا کہ آج تک نہیں بھولا اور کئی دن تو میں روتی رہی۔

امی کے علاوہ نہ کوئی سہیلی، نہ بہن، نہ کزن، ایک خالہ اور ایک پھوپھی جن کا ساتھ آج تک نہ ملا۔ جتنی عمر گزری اک دوست کی کمی میں گزری جس کا اثر یہ ہوا کہ میں نے ہر دفعہ ان شماروں کو پایا۔ بہرحال اپنی کہانی لمبی ہے۔

جس چیز نے مجھے مجبور کیا ہے خط لکھنے پر وہ محرک بھی عمیرہ احمد ہیں۔ ان کا ایک ناول "من سلویٰ" شاید 2007 میں شائع ہوا تھا۔ 2007 سے میں نے ہر ماہ شمارہ لینا چھوڑ دیا۔ اور اس کی آخری قسط مجھے نہیں ملی میں نے اب نیوز ایجنسی سے اکٹھے لینے شروع کیے ہوئے ہیں۔ آپ اندازہ لگائیں آج 2025 میں مجھے اس کی آخری قسط ملی ہے۔ آخری صفحات پڑھے تو یقین کریں۔ میں روئی تو نہیں لیکن بہت اداس ہوں۔

30 سال سے قاری ہوں۔ گھر کی مصروفیات ماشاءاللہ بچوں کی دن رات کی دیکھ بھال ان کے مستقبل اور پڑھائی کی فکر، یہ سب کچھ جان جوکھوں کا کام تھا۔ اللہ کا شکر ہے سب ٹھیک ہے اور میرے اتنے محنتی اور لائق فائق بچے ہیں میں چاہتی ہوں کہ وہ خاندان کا نام روشن کریں حالانکہ وہ پاکستان کا نام روشن کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

دو بیٹے سی اے کر رہے ہیں اور ماشاءاللہ ابھی تک کوئی بھی پیپر ریپٹ نہیں ہوا اور بڑی شان سے پاس ہو رہے ہیں۔ اور بیٹی ابھی فرسٹ ایئر میں ہے اور میڈیکل کے لیے کوشش کر رہی ہے۔

گھر میں سب ہی کچھ نہ کچھ پڑھتے ہیں۔ میں ڈائجسٹ، بچوں میں کسی کو فزکس، کسی کو میتھس سے دلچسپی ہے کتابیں اٹھائے پڑھتا نظر آئے گا۔ میری بیٹی کو فزکس میں بہت دلچسپی ہے اور اس نے بیٹا فزکس کو کوانٹم فزکس کی۔ ماسٹر لیول کی بکس اپنے کالج کی لائبریری سے ابھی اٹھا کے پڑھ لی ہیں، بچوں کے والد تفسیر سیرت نبویؐ، اقبالیات اور اس قسم کی دوسری کتب پڑھتے ہیں۔ اخبار تو گھر میں سب ہی پڑھتے ہیں۔ گھر کا ماحول علمی و ادبی ہے۔

بات کہاں نکل گئی قسط وار پہلے والے سب ہی پڑھے ہوئے ہیں لیکن اب نمرہ احمد کی تحریریں تھوڑی مشکل ہوتی ہیں۔ رخسانہ نگار عدنان بھی اچھا لکھتی ہیں قسط وار اب تھوڑے مشکل ہوتے ہیں۔ سب رائٹرز تھوڑا آسان لکھا کریں تاکہ ہم جیسی گھریلو عورتیں بھی پڑھ سکیں۔ اگر تخلیقی سفر میں مصنف اور قاری ہم آہنگی سے آگے بڑھیں تو آسانی ہوتی ہے۔

دوسروں کو خوش رکھنے کے لیے خود کو بھلانا پڑتا ہے یہ تکلیف اب تک جھیل رہی ہوں۔ جو کسی اور کی وجہ سے ناخوش رہتے ہیں۔ انہوں نے خوش رہنے ہی نہیں دیا۔ اک اذیت ہے۔ جو شاید نصیب کا لکھا ہے۔

اپنے لیے اپنے رب سے ہمیشہ ہدایت اور صبر مانگا ہے۔ میری لکھائی بھی ٹھیک نہیں ہے یہ تو میں لکھنا ہی بھول گئی کہ میں نے 18 جنوری 1985 کو ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی اور یہ قدرتی بات ہے کہ میری عادتیں شاہانہ تھیں میری دادی (اللہ جنت میں جگہ دے)، میری ماں کو کہتی تھیں کہ اس نے کسی بادشاہ کے گھر پیدا ہونا تھا۔ غریب کے گھر پیدا ہو گئی اس کو نہ بگاڑو۔ کہیں اس کی عادتیں خراب نہ ہو جائیں۔

لیکن اللہ کا شکر ہے جیسا اس نے مزاج دیا ویسا ماحول بھی دیا۔ کہتے ہے نا، ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے تو قیمت بھی بذات خود بڑی چکائی۔ کس بہن نے کیا خوب کہا ہے کہ سسرال میں پہلے تختہ اور پھر تخت ملتا ہے اس سے سو فیصد متفق ہوں۔

ثنا کنول...... لاہور

ایک پٹھان فیملی سے تعلق رکھتی ہوں ہمارے خاندان میں ان خطوط اور کتابوں کے ساتھ اس طرح گہرا

تعلق اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ جب ہم کشمیر میں تھے تو وہاں سب کزن باقاعدگی سے ڈائجسٹ سے جڑی رہیں لیکن جب سے لاہور آئے ہیں۔ تو تعلق ٹوٹ سا گیا ہے میں نے بارہ سال کی عمر سے ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا تب صرف مسکراہٹیں وغیرہ پڑھا کرتی تھی۔ اب میں اکیس سال کی ہوگئی ہوں اور یہ تعلق وقت کے ساتھ ساتھ اور گہرا ہوتا گیا۔ ہمارے گھر میں لڑکیوں کا فون وغیرہ استعمال کرنا ممنوع ہے بلکہ سخت پابندی ہے۔

میرے بڑے بھائی جو غصے کے کافی تیز ہیں، وہ آج بھی ایک کڑا اصول رکھتے ہیں۔ لیکن ہمارے پیارے بابا ہمیں منع نہیں کرتے اور بلا روک ٹوک ہر ماہ ڈائجسٹ لے آتے ہیں۔ وہ پڑھ نہیں سکتے ہیں اس لیے لاتے ہوئے ہمیشہ کوئی غلطی کر دیتے ہیں۔ اور میں ہنس کے ان سے لے لیتی ہوں کیوں کہ میرے لیے یہی بہت ہے کہ وہ لے کر تو آجاتے ہیں۔ میں شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں اس پیارے سے ادارے کا جو جانے ہم جیسی کتنی لڑکیوں کے لیے گھر بیٹھے اتنے عمدہ اور بہترین رسالہ کا بندوبست کرتے ہیں، آج تک میں نے جو سیکھا ہے اس ڈائجسٹ سے، میں واقعی ممنون ہوں کہ اس ڈائجسٹ کے ساتھ تعلق نے ہمارے ظاہر اور باطن دونوں کو سنوارا ہے۔

مالا پر تبصرہ کرنا چاہوں گی نمرہ جی واقعی دل توڑا ہے آپ نے ہم سب کا۔ حقیقی زندگی میں ہم کھوئے ہوئے رشتوں کا غم ابھی دل میں ہی لیے ہوئے ہیں کہ آپ نے مالا کو مار کر ایک اور زخم دے دیا۔ واقعی یہ اس سال کی سپرہٹ تحریر تھی۔ پر پھر بھی ویلڈن نمرہ جی۔

پیاری آپی میں نے ایک تحریر بھیجی ہے اس خط کے ساتھ بہت محنت اور دل سے لکھی ہے۔

ج: پیاری ثنا خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ خط تو آپ نے بہت اچھا لکھا ہے تحریر میں روانی ہے۔ باقی کہانی پڑھ کے ہی بتا سکتے ہیں۔ مالا کا غم نہ کریں مالا زندہ بھی ہوسکتی ہے۔

ناہید اسماعیل...... کراچی

ہماری پیاری رائٹر راحت جبیں کے شریک حیات اور شازیہ جمال طارق کی وفات کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ میری صدق دل سے دعا ہے اللہ پاک جانے والوں کی مغفرت فرمائے اور متعلقین کو صبر و جمیل عطا فرمائے آمین۔ ٹائٹل خوب صورت لگا خصوصاً ماڈل کا ہیر اسٹائل فرنٹ سے خاصا گھریلو اور پیچھے بیک کومبنگ یعنی سادگی و پرکاری ساتھ ساتھ۔ کرن کرن خوشبو میں قرض سے متعلق مسائل اور اجر و ثواب آسان انداز میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا۔

احد بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا نہ کوئی کسک نہ تشنگی (سوائے احتل کی ماں کی حالت کے) کہانی کو بہت سکون اور خوب صورتی سے سمیٹا گیا صوفیہ بٹ کو بہت مبارک باد۔ کوتا کی کہانی کا ہم نے ابھی سے انتظار شروع کر دیا ہے۔ مالا میں ہیر بل نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے لیکن ماہر بہت اسمارٹ ہے۔

پردیس کے دکھ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے مشعل کو یقیناً اس کی فیملی کے انا پرست اور سفاک مردوں نے قتل کروا دیا ہے۔ مگر امید باقی ہے کہ شاید حالات ہمارے اندازوں کے برعکس نکلیں۔ روشن کا کردار شاید ختم ہوگیا لیکن اس کے بارے میں تجسس ختم نہیں ہوا کہ وہ اپنی ماں سے مل سکی یا نہیں اور آگے اس کے حالات کیسے رہے۔

نعیمہ ناز نے حسب سابق زبردست لکھا۔ کہانی اور کردار دلچسپ و پرلطف رہے ہماری پسندیدہ ہیروئنوں کی اقسام میں سے ایک قسم رامین کی بھی ہے مجھے ایسی سگھڑ سلیقہ شعار اور اپنے پیروں پر کھڑی ہیروئن بہت پسند ہے۔ دادی کا کردار بہت اچھا لگا۔ نعیمہ ناز کا انٹرویو بھی لاجواب تھا۔ ان کا مزاج اور ذاتی گھر کے حوالے سے ان کی خواہش مجھے اپنی خواہش سے ملتی جلتی لگی۔

سفید گلابوں کا سال گلاب ہی کی طرح کھلا کھلا اور مہکتا لگا۔ دیا شروع میں کچھ معصوم لگی تھی مگر بعد میں اصلیت کھلی۔ دروازے کھلے رکھو بہت پیاری تحریر، جس میں بھائی بہن کی محبت کی خوشبو نے دل کو مہکا دیا۔ حنا بشریٰ کی کہانی چھوٹی تھی پر سبق بڑا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ساس کو بہو کی طرف سے مان اور عزت کی خواہش ہوتی ہے مقام و مرتبے کے لحاظ سے یہ بالکل جائز اور فطری ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں کی اجازت لے لینا یا کسی بھی کام میں ساس کی رائے لے لینا اس میں کوئی حرج

نہیں۔ فاطمہ ہارون کا مختصر افسانہ اچھا لگا بے شک بزرگوں کا وجود خیر و برکت کا باعث ہوتا ہے۔

اللہ کافی ہے ہاجرہ ریحان کے قلم خاص سے نکلی ایک منفرد تحریر دل کو چھو گئی۔ مرنے والی شوہر کے دل کی مکین تھی اور کہانی سنانے والی یقیناً اس کہانی کی ولن جس کی باتیں اور خیالات ہمیں غم و غصہ میں مبتلا کرنے کو کافی تھے۔ اس چڑیل کا بھی انجام دکھانا چاہیے تھا وہ بھی بھیانک۔ آہ کی راہ، فہرست میں شازیہ الطاف ہاشمی اور اندرونی صفحات میں قرۃ العین خرم ہاشمی کا نام ہے انداز سے شازیہ الطاف لگیں مانا کہ زینت پھوپھو کے برا بننے کی وجہ ان کے بھائی اور باپ کی ضد وانا تھی لیکن یہ ان کی کم ظرفی تھی کہ وہ سمجھوتا کرنے کے بجائے ساری زندگی بغض و کینہ اور عناد پالتی رہیں۔

انشا جی کے خطوط دلچسپ و پر لطف لگے، کیسے کیسے نایاب لوگ ہم سے جدا ہو گئے۔ عمر اقبال سے باتیں کچھ خاص پسند نہیں آئیں، اپنے جس پروگرام کے بارے میں فخریہ بتا رہے تھے اس کے چند سین اتفاقاً نظر سے گزرے تھے اور اتنے چھچھورے لگے کہ ہم نے کبھی اسے دیکھنے کے قابل نہیں سمجھا۔ سروے لاجواب رہا مسز آصف خان سلمیٰ اپنے اندر رائٹر بننے کی تمام صلاحیتیں رکھتی ہیں انہیں اس طرف ضرور توجہ دینی چاہیے۔ باقی تمام بہنوں کے جوابات بہت پسند آئے جبکہ سوال نمبر دو اور تین کے جوابات تقریباً ساری بہنوں کے افسردہ کر گئے۔

ہمارے نام، رسالے کی جان ہے۔ ریحانہ چوہدری پھر سے غیر حاضر ہیں عینا عمر کہاں ہیں بھئی۔ صائمہ گل کے گاؤں کا ذکر بڑا پر کشش لگا، میں بھی صائمہ سے متفق ہوں انگنا پھول کھلیں منے کی دادی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ رضوانہ وقاص اللہ آپ کو کلی شفا عطا فرمائے آمین۔

باورچی خانہ اس بار نہیں تھا، موسم کے پکوان بنانے کا دل بہت چاہتا ہے لیکن سوئی سدرن والے ہر گز نہیں چاہتے کہ ہم اتنی محنت کریں۔ خاتون کی ڈائری میں تمام بہنوں کا انتخاب پسند آیا خصوصاً انعم طلحہ اور سحر سہیل کی ڈائری بہت اچھی لگی۔ بیاض بھی ٹھیک ٹھاک رہی۔ نظمیں غزلیں دل کو چھو گئیں۔ نفسیاتی الجھنیں میں اللہ پاک شبینہ فیروز کی والدہ کو صحت یابی عطا کر دے دوسری بہن کے حق میں بھی آسانیاں عطا فرمائے۔ آمین

آپی آپ نے اپنی کھانسی کا ذکر کیا ایک گھریلو ٹوٹکا جو میری بہن شازیہ نے بتایا کہ دن میں کسی بھی وقت تھوڑے سے پستے کھا لیے جائیں تو کافی آرام ملتا ہے آزمانے میں حرج نہیں۔ ان شاء اللہ افاقہ ہوگا۔

پیاری ناہید! آپ کے تبصرے کی سب سے بڑی خوب صورتی یہ ہے کہ آپ کہانی کے ساتھ ساتھ کرداروں کی نفسیات ان کی فطرت پر بھی تبصرہ کرتی ہیں۔ آہ کی راہ شازیہ الطاف ہاشمی نے ہی لکھا تھا۔

اطمینان رکھیں۔ مالا کا انجام آپ کی حسب منشا ہی ہوگا۔

زاہدہ شوکت......ساہیوال

کافی عرصے کے بعد آپ سب سے بات کر رہی ہوں۔ کچھ ذاتی مصروفیات اور طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے آپ سے تعلق ختم تھا۔ شکر الحمد للہ اب ٹھیک ہوں، خواتین ڈائجسٹ کے بغیر میں نامکمل ہوں۔ اتنی اچھی باتیں کرن کرن روشنی، افسانے، ناول، غزل، سب کے سب بہت ہی اچھے ہوتے ہیں۔ تنہائی کا ساتھی رسالہ ازل سے ابد تک پسند ہے۔ حاضری قبول کریں۔ باقی تبصرہ آئندہ خط میں حاضر ہوگا۔ سب کو سلام

ج: پیاری زاہدہ، بہت شکریہ کہ آپ نے اتنی مصروفیت میں بھی ہمیں یاد رکھا۔ خواتین آپ کو پسند آیا۔ ہماری محنت وصول ہو گئی۔

فرخندہ سلیم......ملتان

خواتین کا سرورق بس بہتر تھا۔ ایسا پہلے بھی لگ چکا ہے جو بہت مصنوعی سا تھا۔ ابن انشا کا منفرد انداز میں سلسلہ اس بار اچھا رہا۔

خطوط میں چلو تو رضوانہ میرا اتنی سے رابطہ ہے تو تصویریں انہیں سینڈ کی تھیں۔ میرا تو بہت دل ہے کہ ڈائجسٹ میں اپنی تصویریں دوں ہر سروے میں مگر شوہر نے منع کیا ہے۔ سلمیٰ مسرت، ام ہادیہ، زینب نور بھی حاضر ہو جائیں۔

نعیمہ ناز سے ملاقات کا دوسرا حصہ بہت شاندار رہا جس کو پڑھ کر اپنا پن سا نظر آیا اب ناہید چوہدری سے بھی ملاقات کروا لیجیے۔ بہت ہی خوب صورت لکھتی تھیں۔ ناہید لمبا سا انٹرویو دیں اور ساری اپنی اور رخ کی یادیں بیان

کریں کتنا اچھا لگے گا۔

سال نو سروے بے حد پسند آیا کہ کتنے خوب صورت سوال تھے جو سب کے دل کی آواز تھے واقعی سوال نامہ بہت عمدہ تھا جواب سب کے الگ الگ تھے پڑھ کر اچھا بہت لگا۔

عدنان بھائی اور آخری سلسلہ بہت اہم ہے سب کے لیے جو سب کا پسندیدہ ہے۔

نعیمہ ناز کا ناول کافی دلچسپ اور ہلکا پھلکا رہا جو طویل تھا مگر کردار اچھے سے لکھے گئے خاص کر شایان امین اور رائٹر دادی کا کردار بہت پسند آیا وہیں رشتے کے لیے آئی ہوئی خواتین پر حیرت ہوئی جو واقعی سوالات کا انٹرویو کرنے بیٹھ گئی تھیں۔

احد جیسے لازوال ناول کے دلکش اختتام پر صوفیہ کو بہت مبارک باد کہ بہت ہی اچھا ناول تھا جو دلچسپی وروحانیت سے بھرپور تھا اور آخر میں سب صحیح ہو گیا۔ بہت خوب آپ نے اتنے اچھے ناول کو شامل کیا۔

حمیرا شفیع کا سال نو کی مناسبت سے ناولٹ پیارا تھا جس کے آخر میں ہیرو ہیروئن کا ملن ہوا۔ برکت افسانہ ایک سبق آموز تحریر تھی۔

آہ کی راہ افسانہ جیسے کو تیسا کے مصداق کی عملی تفسیر تھی کہ جو دوسرے کے لیے برا سوچتے ہیں زینب جیسے وہ کبھی اپنی ہی کھائی میں گرتے ہیں ہاں ہاشمی بہن کا طویل دو قسطوں کا انٹرویو مجھے ابھی تک یاد ہے کہ رائٹر نے بہت دلچسپ شاہین کو انٹرویو دیا تھا۔

حنا بشریٰ کا افسانہ سب سے ٹاپ پر رہا کہ بہت ہی مثبت پیغام افسانے میں دیا گیا تھا اور حنا کے کسی طویل مکمل ناول کا بھی انتظار ہے یہ اور بشریٰ ماہا دونوں ہی خوب لکھتی ہیں۔ ہاجرہ ریحان کچھ دن بعد اپنے مخصوص انداز میں آئیں اور خوب تر انداز میں معیاری افسانے کے سنگ حاضری اچھی رہی۔

پیاری فرخندہ! آپ نے ڈراموں کے بارے میں جو لکھا، وہ ہمارے دل کی آواز ہے۔ رومانس ڈھکا چھپا ہی اچھا لگتا ہے۔ خواتین آپ کو پسند آیا۔ بہت شکریہ۔ آپ کے تبصرے کی کیا تعریف کریں ہمیشہ ہی بہت خوب ہوتے ہیں۔ گوشی جمال...... منڈی یزمان

نیا سال اپنی شروعات کر چکا مگر میری دسمبر میں طاری افسردگی جوں کی توں برقرار ہے۔ شروعات سے میرے خطوط کی انفرادیت کو ادارہ اور قارئین بہنوں نے بہت سراہا۔ مگر 2024ء میں میرے لیے اداسیوں کا سال رہا۔ پہلے ادارہ نے میرے خطوط کے دلچسپ حصے ایڈٹ کرنا شروع کیے جو کہ میرے خطوط کی اصلی پہچان رہے وجہ شاید صفحات کی کمی ہو جبکہ کچھ بہنوں کے خطوط اسی طوالت سے ابھی بھی لگ رہے ہیں۔ مجھے ادارہ نے گائیڈ کیا کہ خطوط سے نکل کر افسانہ نگاری میں ایسے کردار واقعات کو بیان کروں۔ ناتا جوڑا کے سلسلے میں شمولیت اختیار کی۔ حالانکہ اس درجہ صاف گوئی کا مظاہرہ پر ہم جیسے مڈل کلاس گھرانے بہت برا محسوس کرتے ہیں لیکن میں نے بڑی آپا سے اجازت طلب کر کے یہ معرکہ سر کر لیا۔

پھر کہانیوں کی طرف دھیان لگایا۔ سارا دن دکان داری اور راتوں کو جب لوگ مزے سے میٹھی نیند مزے لے رہے ہوتے ہیں میں نے منہ پر پانی کے چھینٹے مار مار کر قلم کو رات رات بھر گھسایا ۔ تین مختلف تحاریر ''مسیحا، '' نام سے اپنے بھائی جس کو ہمیشہ اپنا آئیڈیل مانا اماں ابا کی وفات کے بعد ان کی خدمات کا احسان ہم مرتے دم تک ادا نہیں کر پائیں گے۔ سچائی پر مبنی تحریر رقم کی۔ دوسری تحریر ''روشن ستارہ'' جو بالکل مختلف آزادی کے پس منظر میں لکھی اب اس میں جمال ہاؤس کی کسی خاتون کا کارنامہ نہیں تھا۔ اتنے پرانے ماڈل جمال ہاؤس میں موجود نہیں ہیں۔ اماں 1971ء میں بیاہ کر جمال ہاؤس آئی تھیں اور شادی کے چار سال بعد گڈی آپا منظر عام پر آئیں۔

سات سال سے ادارہ خواتین سے ناتا جوڑ رکھا ہے۔

آپ سے اس درجہ حوصلہ شکنی کی امید نہیں تھی۔ دو ماہ سے شعاع میں ارسال کردہ خطوط کو لگانے کی زحمت نہیں گوارا کی۔

جب سے میرے خطوط کو ایڈٹ کرنا شروع کیا قارئین اور خود آپ کو بھی میرے خطوط پھیکے لگنے لگ گئے ہیں۔ حالانکہ اس کی ذمہ داری بھی ادارہ کے سپرد ہے۔

لیکن وہی ڈھاک کے تین پات نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ اب تو کسی خط میں میرے خطوط کی رنگینی اور دلچسپی کا

بقیہ صفحہ نمبر 204 پر

راحت جبیں

آنگنا پھول کھلیں گے

چھبیسویں قسط

"بس کرو عبید۔" باپ کا دل تڑپا، اسے پیروں سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"یہ میں نے کیا کر دیا۔ میں نے کیسے ثانیہ کی ہر بات پر اعتبار کر لیا۔" وہ تاسف سے اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔ آنکھوں سے بہتے آنسو آسیہ کے دوپٹے میں جذب ہوتے رہے۔

"میرا دل کہتا تھا۔ ایسا نہیں ہے مگر پھر نجانے کیا ہوا؟ نجانے کیا؟"

"کوئی بات نہیں ہو جاتا ہے۔" توفیق نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"امی! میں آپ کا بھی گناہ گار ہوں۔" وہ ماں کی طرف پلٹا..... سرخ آنکھیں آنسوؤں سے بھیگا چہرہ، ماں نے ماتھا چوم لیا۔

"لو میں نے تو کب سے دل صاف کر لیا۔ ماں کا دل اس بات کا انتظار کہاں کرتا ہے کہ اولاد معافی مانگے۔"

آسیہ نے جتاتی نظروں سے توفیق کو دیکھا۔ وہ سمجھ کر مسکرا دیے۔ صاف ان پر طنز تھا۔

"لیکن میں ثانیہ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔" عبید کے اندر غصے کی لہر اٹھی۔

"اس نے ہم سب کو ایک دوسرے کے خلاف کر دیا۔ ہر رشتے میں دراڑ ڈالی۔" اب باتیں کھلی تھیں تو آسیہ نے باقی ہر بات بھی بتا دی تاکہ بیٹے کا دل صاف ہو۔

"جھوٹ، سازش، بدگمانی اس نے کیا نہیں کیا۔"

"اس کی یہ خصوصیات ہمیں پہلے سے پتا تھیں۔ تم تھے جس نے آنکھیں بند کی تھیں۔"

"تم ثانیہ کو الزام نہیں دے سکتے عبید۔" توفیق نے سنبھل کر ٹیک لگائی۔

"وہ جیسی بھی تھی۔ بدگمان کون ہوا تھا۔ اس کے جھوٹ اور سازش کا شکار کون بنا تھا۔" عبید نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

"تم ہمارا خون تھے عبید۔ تمہیں ہم پر، اپنی بہن پر اعتبار ہونا چاہیے تھا۔ اعتبار نہیں بھی تھا۔ تب بھی تم وضاحت مانگ سکتے تھے۔" ان کا لہجہ سنجیدہ اور سخت تھا۔

"تم ہماری اولاد تھے، تمہارا تعلق ہم سے مضبوط ہونا چاہیے تھا دل ثانیہ نے نہیں دکھایا۔ دل تم نے دکھایا تھا۔ ثانیہ نے اتنی تکلیف نہیں پہنچائی۔ جتنی تم نے پہنچائی تھی۔"

"اب بس بھی کریں۔" آسیہ نے فوراً ٹوکا۔ اب اس سے زیادہ بیٹے کی شرمندہ صورت کہاں برداشت ہونا تھی۔

”کیوں بھئی موقعہ ملا ہے تو سارے حساب بے باق کروں گا۔“ وہ شرارت سے مسکرائے۔

☆☆☆

کھول کھول کر ثانیہ آدھی رہ گئی۔ ابھی تک ماں کے گھٹنے سے لگا بیٹھا ہے۔ احساس ہی نہیں کہ میں گھر میں اکیلی ہوں۔ اس نے کھولتے بڑبڑاتے کال ملائی۔ دوسری طرف سے کال کاٹ دی گئی تھی۔

”اب تو آجاؤ عبید...... حشر اٹھادوں گی۔“ اس نے سامنے سے موبائل بیڈ پر پھینکا پھر خود بھی بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بے چینی کے بعد دوبارہ نمبر ملایا۔ کال پھر سے کٹ گئی۔ اب غصے کی جگہ تشویش نے لے لی۔

”بات کرلو۔ وہ پریشان ہورہی ہوگی۔“ توفیق صاحب نے نرمی سے کہا۔

”مجھے اب بھی اس کی پریشانی کا احساس ہوگا۔“ عبید نے تلخی سے پوچھا۔

”ہونا چاہیے تمہاری بیوی ہے۔“ وہ مسکرائے۔ عبید نے چڑ کر ماں کو دیکھا وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئیں۔ اندر کی عورت شر پھیلا رہی تھی۔ یہی تو وقت تھا ثانیہ سے سارے بدلے لینے کا۔

مگر بولیں تو لہجہ مدھم تھا۔

”تمہارا دل ہماری طرف سے صاف ہوگیا یہی کافی ہے۔ آئندہ کے لیے اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔ یہاں کی باتیں یہیں چھوڑ جاؤ۔ اپنا گھر خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ کھڑی ہوگئیں۔ توفیق صاحب بیوی کو دیکھ کر مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ فخر، ناز اور پیار سے لبریز تھی۔ اس عورت نے انہیں کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔

عبید نے ماں کی ساتھ بیٹھ کر بجٹ بنایا۔ ایک لمحے کو آسیہ کو تشویش لاحق ہوئی۔ ان کے بیٹے نے کیا کیا بکھیڑے اپنی جان کو لگا لیے تھے۔

”اب گھر کا خرچ ثانیہ کے حوالے نہیں کرنا۔“ عبید نے فیصلہ کرلیا تھا۔

☆☆☆

کھانا بناتے، لگواتے ارم کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہونے لگا۔ یہ بڑا سا گھر یہ ساری آسائشات بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ نظر، وہ التفات...... وہ محبت۔ عفان کا ارم کو نظر انداز کرنا، بے اعتنائی برتنا اس سے برداشت



نہیں ہو رہا تھا۔ عفان نے کرسی کھینچی۔ بیٹھا اور بغیر کسی کی طرف دیکھے کھانا شروع کر دیا۔
ارم نے ابھی تک اپنی پلیٹ میں کچھ نہیں نکالا تھا۔ اسے پوچھنا چاہیے تھا وہ کیوں نہیں کھا رہی۔ ارم کو جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔
بی بی جان نے نظریں چرا لیں۔ وہ میاں بیوی کے معاملے میں دخل دینا نہیں چاہ رہی تھیں۔ عفان مزید ضد میں آ جاتا۔ (کچھ دن منہ پھلائے گا پھر ٹھیک ہو جائے گا)
"عفان......" ارم نے بے اختیار پکارا۔ عفان نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔
کوئی اتنی بے رخی سے بھی دیکھتا ہے۔
"جب سے آئی ہوں کبھی بھی میکے میں نہیں رکی۔ کچھ دن امی ابو کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔" لہجہ صاف تھا مگر واضح نہیں۔ وہ اجازت مانگ رہی تھی یا بتا رہی تھی۔
بی بی جان نے بے چینی سے اسے دیکھا۔ ارم کے اندر کہیں گمان تھا۔ وہ غصے اور ناراضی سے سہی مگر کہے گا۔ وہ نہیں جا سکتی۔ اس کے بغیر گھر کیسے چلے گا۔
مگر شاید کسی کے بھی جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کاروبار حیات تو چلتا رہتا ہے۔ انسان کو لگتا ہے ساری دنیا اس نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھی ہے۔
"ٹھیک ہے۔" آہ...... دو لفظ...... ارم کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔
عفان نے یہ بھی نہیں پوچھا وہ کتنے دنوں کے لیے جا رہی ہے اور اپنا کھانا ختم کر کے چلا گیا۔ ارم کی پلیٹ خالی کی خالی رہی۔
"کھانا کھا لو بیٹا۔" بی بی جان کی مدھم آواز نے ارم کے وجود پر چھائے سکوت کو توڑ ڈالا۔ اس نے شاکی نظروں سے بی بی جان کو دیکھا۔
"وہ مجھے روک سکتا تھا۔"
"رشتوں کو آزماتے نہیں ہیں۔ بھرم ٹوٹ جاتے ہیں۔" ان کے لہجے میں اداسی تھی۔
"آزمائے بغیر ان کی گہرائی کا کیسے پتا چلے۔" ارم کا لہجہ تلخ تھا۔
"بھاگ جانے سے معاملات درست نہیں ہوتے ارم......" بی بی جان نے روکنا چاہا۔
"میں تھک گئی ہوں۔ تھوڑا سکون چاہتی ہوں۔ آپ کا بیٹا بہت مشکل ہے۔ اس مشکل کو جھیلنے کے لیے مجھے ہمت بھی تو چاہیے۔"
"اب میں نہیں روکوں گی۔ تو تم کہو گی۔ بی بی جان نے بھی نہیں روکا۔" وہ ذرا سا مسکرائیں۔ تو ارم بھی مسکرا دی۔
"آپ سے شکوہ نہیں ہے بی بی جان۔ مان تو محبت کرنے والے شوہر پر ہوتا ہے۔" اس نے آخری جملہ دل سے کہا۔
"جاؤ آفس کے لیے نکل رہا ہے۔ خدا حافظ کہہ دو۔"
"کیا فرق پڑتا ہے۔" ارم کا دل نہیں تھا۔
"فرق پڑتا ہے ارم۔" بی بی جان کے لہجے میں سختی در آئی۔ ارم کو بادل نخواستہ کمرے میں آنا پڑا۔ وہ اپنا سامان اٹھا رہا۔ گھڑی، چابیاں، موبائل۔ اس نے ارم کو آتے دیکھا۔ مگر ان دیکھا کر دیا۔ ارم نے خوانخواہ بستر درست کرنا شروع کر دیا۔
عفان نے والٹ سے کچھ رقم نکال کر سائیڈ میز پر رکھی۔

"یہ لے لینا......" ارم نے سر اٹھا کر پیسوں کو پھر عفان کو دیکھا۔
"یہ کس لیے......"
"کچھ دن رکو گی تو ضرورت پڑ سکتی ہے۔"
ارم نے پاس آ کر رقم اٹھائی۔ پھر مڑ کر عفان کی شرٹ کے سامنے والی جیب میں ڈال دی۔
"میرے ابو کے گھر میں پیسوں کی کمی نہیں ہے۔" عفان کی پیشانی شکن آلود ہوئی۔ وہ اب بھی سر اٹھائے اسی کو دیکھ رہی تھی۔
"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی......" وہ خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ ارم کا دل مزید برا ہو گیا۔

☆☆☆

"کہاں رہ گئے تھے عبید۔ تمہیں اندازہ بھی ہے میں کتنی پریشان ہو گئی تھی۔" ثانیہ دروازہ کھولتے ہی شروع ہو گئی۔ اپنے غصے کو دبا کر لہجہ پریشانی اور محبت کی شیرینی سے لبریز تھا۔ وہ محبت کی ماری تھی۔ یہ ثانیہ کا خیال تھا مگر محبت جب مکڑی کا جالا بن کر آپ کے حواس سلب کرنے لگے تو تقدیر صفائی کا انتظام خود بخود کر دیتی ہے۔
"اکیلے گھر میں کتنا دل گھبرا رہا تھا۔ تم میری کال بھی نہیں لے رہے تھے۔ اتنے وسوسے......" اس کے الفاظ درمیان میں گم ہو گئے۔
عبید کے ہاتھوں میں گروسری کے تھیلے تھے۔ وہ دروازہ کھلا ہی چھوڑ کر سیدھا کچن کی طرف بڑھ گیا۔ حیران پریشان ثانیہ نے تیزی سے دروازہ لاک کیا۔ اور پیچھے آئی۔
"یہ کیا تم خود ہی شاپنگ کر آئے۔ حد ہے عبید، تمہیں کیا پتا؟ کیا لینا تھا کیا نہیں۔"
عبید تھیلے رکھ کر مڑا۔ وہ عین اس کے عقب میں کھڑی تھی۔ میرون کرتا ٹراؤزر۔ بالوں کی اونچی سی پونی بنائے۔ دوپٹے سے بے نیاز۔ اس کا خوب صورت سراپا آج بھی حشر ڈھاتا تھا۔ مگر اس کا خوب صورت چہرہ عبید نے اس کے چہرے پر وہ خوب صورتی تلاشی جس کا وہ اسیر تھا۔ مگر اسے ماننا پڑا۔ خوب صورتی خدوخال میں نہیں۔ کردار میں ہوتی ہے۔ بے ریا سوچ اور پاکیزہ روح کی ہوتی ہے۔ جو چہرے کے خدوخال سے چھلکنے لگتی ہے۔
"کیا ہوا؟" ثانیہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی۔
"کچھ پوچھ رہی ہوں۔ تمہیں کیا پتا۔"
"مجھے نہیں لیکن امی کو پتا تھا۔ دو افراد کے لیے گھر میں کتنا اور کون کون سا سودا چاہیے۔" عبید کا لہجہ سپاٹ تھا۔
ثانیہ کو دھچکا لگا۔ عبید اس سے کترا کر کچن سے نکلا۔
"ویٹ آ منٹ۔" ثانیہ بھاگ کر سامنے آئی۔ عبید کو رکنا پڑا۔
"میرے گھر کی خریداری اب تمہاری امی کیا کریں گی۔"
"ہاں کیونکہ تم سے مینج نہیں ہو پا رہا۔" عبید نے آرام سے کہہ کر اسے سامنے سے ہٹایا۔
"اور دوسری بات یہ پورے مہینے کا راشن ہے۔ سبزی گوشت روز کا روز آ جائے گا اور اب اگلی پے آنے تک اسی میں گزارہ کرنا ہے۔ اور یقین جانو۔ اتنا کم نہیں ہے کہ دو افراد اس میں گزارہ نہ کر سکیں۔"
وہ ہکا بکا اسے بیڈ روم میں جاتا دیکھتی رہی۔ وہ پیچھے جانا چاہتی تھی۔ مگر رک گئی۔ ایک گہری سانس لی۔
کام ڈاؤن ثانیہ غصہ نہیں ابھی تو وہاں سے پمپ ہو کر آیا ہے۔ ابھی نہیں۔ اس نے کھولتے ہوئے مڑ کر کچن کاؤنٹر پر دھرے تھیلوں کو دیکھا۔
"دیکھ لوں گی سب کو۔ کان بھر بھر کے عبید کو میرے خلاف کر دیا ہے۔ ثانیہ کے گھر کا کچن اس کی ساس

چلائے۔ اس سے پہلے ثانیہ مرنہ جائے۔"

☆☆☆

"اچھا دل تھوڑا نہ کرو۔ یہ تو زمانے کی ریت ہی بن گئی ہے۔" بہت دیر شبیر کے دکھڑے سننے کے بعد آصفہ نے بھائی کو تسلی دی۔ فرخ نے موبائل سے نظریں ہٹا کر ماں کو دیکھا اور مسکراہٹ دبائی، دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔

دادی بھی خاموش، بے زاری سینے تک کمبل اوڑھے کبھی آنکھیں کھول کر انہیں دیکھتیں۔ کبھی بے زاری سے بند کر کے اونگھنے لگتیں۔

"میری تو کمر ہی ٹوٹ گئی ہے۔ بہو کے مزاج نہیں ملتے۔ نادرہ الگ منہ پھلائے پھرتی ہے۔ وسیم پہلے تو ہر ہفتے آجاتا تھا۔ اب کہہ دیتا ہے وقت نہیں ملتا۔ بیوی کا جب دل کرتا ہے اس سے جا کر مل آتی ہے۔"

"جب دوسروں کے پیروں سے زمین کھینچو گے تو اپنی کمر بھی ٹوٹے گی۔ اب نادرہ آہیں بھرتی ہے۔" آصفہ نے کینو کی پھانک منہ میں رکھ کر چسکا لیا۔

"تب ثانیہ کو ہلاشیری دیتی تھی کہ شوہر کو لے کر الگ ہو جاؤ۔ اس کی ماں نے آہیں نہ بھری ہوں گی۔ بد دعائیں نہ دی ہوں گی۔"

"آپا! میں اپنا دل ہلکا کر رہا ہوں آپ نے طعنے شروع کر دیے ہیں۔" شبیر نے دکھی لہجے میں کہا۔ نتاشا میکے گئی تھی۔ اس لیے راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ بھائی کا شکوہ سن کر آصفہ نے تسلی دینی شروع کر دی۔

دادی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ تو توجہ ادھر مرکوز ہو گئی۔

"اماں اٹھ کر بیٹھیں...... میں تو آپ کا حال پوچھنے آئی ہوں۔"

"میرا حال پوچھنے کون آتا ہے؟ اپنے چسکے پورے کرنے آتی ہو۔" دادی نقاہت سے مگر چڑ کر بولی۔ فرخ کو ہنسی آ گئی۔

"یہ نہیں کہ ماں چار دن کی مہمان ہے کچھ اس کی سن لے۔ میرے سرہانے بیٹھ کر پٹر پٹر بولے جا رہے ہیں۔"

"میں دیکھوں۔ نادرہ نے سالن بنا لیا ہوگا۔" شبیر بہانے سے کھسک گئے۔

"ارے نانی ابھی کہاں؟ ابھی تو آپ نے میری شادی دیکھنی ہے۔" فرخ نے موبائل ایک طرف رکھا۔

"تیری ماں کو فکر ہو تب نا......"

"لو مجھے فکر نہیں ہے۔" آصفہ تڑپ اٹھیں۔

"تو پھر کر لوں لڑکی پسند......" فرخ نے موقعہ غنیمت جانا۔ نمرہ کا ذکر کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

"یہ دیکھ۔" آصفہ نے فٹ سے ہاتھ جوڑ دیے۔ "اب تو مرنی مر جاؤں تمہاری پسند نہ لاؤں گی۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" فرخ بے چین ہوا۔

"خوب دیکھ بھال کر بہو لاؤں گی۔ گھر بنانے والی، سجانے والی، مجھے نہیں چاہیے، نہ امیر نہ خوب صورت۔"

"تو کسی بھکارن سے کریں گی۔" وہ بلبلا اٹھا۔

"تم سے مشورہ نہیں مانگا۔ جہاں کرنی ہوگی کر دوں گی۔" آصفہ نے بے نیازی سے کہا اور کینو کھانے لگیں۔

فرخ تھوڑا پریشان سا ہو گیا۔ نمرہ کو ماں سے ملوائے تو کس طرح۔ دادی نے ایک پھانک منہ میں رکھ کر

چوسنا چاہا کہ کھانسی شروع ہوگئی۔ فرخ نے تیزی سے اٹھ کر سر اونچا کیا۔
''بس اسی طرح ماں کھانس کھانس کر مر جائے گی۔ پر کسی کو خیال نہ آئے گا۔'' دادی کے دم میں دم آیا تو دہائی دینے لگیں۔ کبھی کبھی ساری ساری رات کھانستی تھیں۔ مگر کمروں کے بند دروازے اپنے اپنے بستروں میں دبکے پرسکون نیند لیتے گھر کے کسی فرد تک ان کی آواز نہ جانے دیتے۔
نجانے دروازے بند تھے یا کان۔
''نانی! آپ ہمارے ساتھ ہمارے گھر چلیں۔ رابعہ آپی آپ کا بہت خیال رکھیں گی۔'' آصفہ نے گھور کر فرخ کو دیکھا۔ بیمار ماں کو سنبھالنا آسان تھوڑی تھا چوبیس گھنٹوں کی ڈیوٹی تھی۔ اب رابعہ گھر دیکھے گی، بچوں کو سنبھالے گی۔ یا بیمار دادی کا خیال رکھے گی۔ وہ ابھی مناسب الفاظ ہی ڈھونڈ رہی تھیں کہ دادی چمک کر بولیں۔
''میں کیوں آخیر عمر میں اپنا گھر چھوڑوں۔ بیٹی کے در پر دم نکلے۔ لوگ میرے بیٹے پر تھو تھو نہ کریں گے۔ کہ بوڑھی ماں کو گھر سے نکال دیا۔ وہ بیٹی کے گھر جا کر مری۔''
آہ یہ مائیں۔ ''بیٹے بھلے پورا دن کمرے میں نہ جھانکیں۔ مگر بیٹے کی جگ ہنسائی نہ ہو۔ اس ڈر سے اپنے لیے آرام بھی ٹھکرا دیں گی۔''
آصفہ نے سکون کا سانس لے کر فوراً اماں کی ہاں میں ہاں ملائی۔
☆☆☆
ڈھلتی شام کے پس منظر میں گرتے پتوں کی آہٹیں اور ہوا کی سرگوشیاں بتاتی تھیں کہ بہار اب زیادہ دور نہیں ہے۔ ستون سے لپٹی بیلیں اپنے وجود میں پنپتی نئی کلیوں کی سرسراہٹوں سے مخمور تھیں۔
وہ بیلوں میں اٹکے خشک پتے الگ کر رہی تھی۔
''کیا کر رہی ہو؟'' اس کے کانوں میں چند مہینے پہلے گزرا لمحہ سرگوشی کرنے لگا۔
''میری بیلیں میرے بغیر اداس ہو رہی تھیں۔ ابھی سے راز و نیاز چل رہے ہیں۔''
''تمہارا شوہر بھی تمہارے بغیر اداس ہو رہا ہے اور تمہارے راز و نیاز ......'' اس کے شرارتی سے لہجے پر ارم نے بات ہی مکمل نہ کرنے دی۔
''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''
''بہت مس کر رہا ہوں۔ لینے آجاؤں۔''
''ابھی۔'' بڑی ناز بھری حیرت تھی۔
''ہاں۔''
''جی نہیں۔''
''میں آرہا ہوں۔''
''کیا چل رہا ہے بھئی۔'' عقب سے عبید نے اس کے سر پر چپت لگائی۔ تو ارم چونک کر مڑی۔ اپنی اداسی اور بے چینی کو ہٹا کر دیکھتی تو یہ چند دن بہت خوب صورت گزرے تھے۔ عبید ہر روز دو ایک گھنٹوں کے لیے آجاتا۔ آسیہ نت نئے کھانے بناتیں۔ توفیق بھی آفس سے جلدی اٹھ آتے۔ گھر جیسے پھر سے مکمل ہو گیا تھا۔ اس نے ساری بات آسیہ سے شیئر کی تھی۔
''ہاجرہ نے بالکل درست فیصلہ کیا۔ کون چاہتا ہے۔ اس کی بیٹی زندگی کی ہر خوشی سے منہ موڑ کر بیوگی کی زندگی گزارے۔'' آسیہ نے ہاجرہ کے اس عمل کو بہت سراہا تھا۔
''مگر زارا کی خوشیاں اب بھی ادھوری ہیں۔ وہ دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔''

"تمہیں عفان کو سمجھانا چاہیے تھا۔"

"انجام دیکھ تو لیا ہے۔ اس لیے کچھ دنوں کے لیے منظر سے ہٹ گئی ہوں۔ امی میں نے ٹھیک کیا نا۔" ارم متذبذب تھی۔

"بعض اوقات خاموشی سے جگہ چھوڑ دینا بھی اپنا دفاع ہوتا ہے۔" انہوں نے بیٹی کے فیصلے پر تنقید نہیں کی تھی۔

"میکے کے گھر میں کتنا سکون ہوتا ہے عبید۔"

"یہ تو ہے جو خوشی یہاں بیٹھ کر ملتی ہے۔ وہ کہیں اور نہیں ملتی۔" عبید نے نظر بھر کر گھر کے گوشے گوشے کو دیکھا۔ سکون آمیز احساس رگِ جاں میں اتر گیا۔

"ہاں اب تو تمہارا بھی میکہ ہے۔" ارم مسکرائی تو عبید نے ناراضی سے بہن کو دیکھا۔

"اڑا لو مذاق......" وہ آفس سے آیا تھا۔ بازو کہنیوں تک فولڈ کیے ہاتھ منہ دھو کر آیا تھا۔ ارم نے انگلیوں سے اس کے بکھرے بال سنوارے۔

"مذاق نہیں اڑا رہی میرے بھائی۔ بتاؤ زندگی کیسی ہے؟"

"کھینچا تانی ہے۔ شکنوں بھری چادر ہے ایک طرف سے نکالو تو دوسری طرف پڑ جاتی ہیں۔" ماں باپ کے سائے میں پرسکون زندگی جینے والوں کے لیے ایسا ہی تھا۔ جیسے خوب صورت پگڈنڈی پر چلتے چلتے خاردار جھاڑیوں میں اتر گئے ہوں۔ اب نکلنا تھا۔ اپنی عقل و فراست...... محدود تجربے اور ماں باپ کی تربیت کے سہارے۔

"ہاں لیکن بری بھی نہیں ہے۔" ارم نے دیوار پار نظر آتی امرود کی شاخوں پر پھدکتی چڑیوں کو دیکھا۔

"ہمیں اپنے حصے کے دکھ سکھ اٹھانے ہی پڑتے ہیں۔ خواہ وہ اپنے فیصلوں کا نتیجہ ہوں یا ماں باپ کے......" عبید نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

"دادی کا کیا حال ہے؟ سنا ہے طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی ہے۔" ارم نے پوچھا۔

"پتا نہیں میں بھی گیا نہیں۔"

"تمہارا تو سسرال ہے کم از کم دادی سے تو مل آیا کرو۔ تمہیں دیکھ کر خوش ہو جاتی تھیں۔"

"بچوں آجاؤ کھانا لگ گیا ہے۔" آسیہ کی آواز پر عبید خاموش ہو گیا۔

"چلو کھانا کھاتے ہیں۔" ارم نے بھائی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

☆☆☆

"آج جلدی گھر آجانا۔ مارکیٹ جانا ہے۔ مجھے کچھ ضروری چیزیں لینی ہے۔" گرما گرم آملیٹ عبید کے سامنے رکھتے ثانیہ نے کہا۔ عبید نے بغیر اس کی طرف دیکھے نوالہ توڑا اور سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"امی کی طرف سے ہو کر ہی آؤں گا۔" ثانیہ نے اندر ابلتے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے گہری سانس بھری۔

"روز روز جانا ضروری ہے میرا مطلب ہے۔" وہ عین اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی۔

"میں گھر میں اکیلی ہوتی ہوں۔ سارا دن تمہارا انتظار کرتی ہوں۔"

"تم گھر پر ہوتی ہو؟" عبید نے تحیر سے اسے دیکھا۔

ثانیہ تلملا کر رہ گئی۔ وہ نائس ہونے کی کوشش کر رہی تھی اور عبید کا رویہ اسے تاؤ دلا رہا تھا۔

"میں نے تو جب بھی کال کی تم گھر سے باہر ہی ہوتی ہو کبھی امی کی طرف کبھی فرینڈز کے ساتھ۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" ثانیہ کا ضبط جواب دینے لگا۔

''چوبیس گھنٹوں میں سے صرف دو گھنٹے اپنے ماں باپ کے لیے نکالتا ہوں۔ تمہیں وہ بھی گوارہ نہیں...... اور اگر زیادہ بور ہوتی ہو تو گھر کے کام کاج میں دل لگاؤ۔ پڑھائی شروع کر دو۔''

''تم جو کہنا چاہتے ہو ایک ہی بار کھل کر کیوں نہیں کہہ دیتے۔''

''میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔'' عبید نے بحث سے بچنے کے لیے ناشتہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''لیکن میں سب سن رہی ہوں۔ جو تمہارے دل میں بھرا جا رہا ہے۔ چند دن ہوئے تمہیں وہاں جاتے ہوئے اور تمہارے انداز ہی بدل گئے ہیں۔'' عبید نے پلیٹ کھسکائی اور کھڑا ہو گیا۔

''اس گھر میں سکون سے ناشتہ کرنا بھی محال ہے۔''

(یا اللہ! یہ عبید ہے ثانیہ کا عبید......) ثانیہ ہکا بکا اسے جاتے دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ بیرونی دروازہ زور سے بند ہو گیا۔ ثانیہ کو رونا آ گیا۔ عجیب بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ کھل کر بولے تو ثانیہ کھل کر لڑ بھی لے۔ یہاں تو چوہے بلی کا کھیل جاری تھا۔ موبائل کی بیل پر اس کے آنسو تھمے۔ فرخ کا نام دیکھ کر غصہ ہی آ گیا۔

''کیا ہے۔''

''تم دو دن سے میری کال کیوں نہیں لے رہیں۔'' دوسری طرف وہ بھی غصے سے بھرا ہوا تھا۔

''میری مرضی۔'' ثانیہ نے غصے سے اپنے گال رگڑ کر آنسو صاف کیے۔

''تمہیں نمرہ سے بکواس کرنے کی کیا ضرورت تھی۔'' وہ چلایا۔

''ایسا کیا کہہ دیا۔ تمہاری چہیتی کو۔''

''اسے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ کہ میں کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا۔'' سامنے ہوتی تو کچا چبا جاتا۔

''میں نے کون سا جھوٹ بولا۔'' ثانیہ نے ڈھٹائی سے کہا۔

''تو یہ بھی بتا دیتیں کہ وہ لڑکی تم تھیں۔''

''یہ تم پر چھوڑ دیا ہے۔'' ثانیہ نے اسے چڑایا۔ پھر ذرا مدھم لہجے میں بولی۔ یاد آ گیا تھا کہ وقتاً فوقتاً وہی اس کے کام آتا ہے۔

''میری نیت بری نہیں تھی۔ کل کو اسے کسی اور سے پتا چلے تو برا لگے گا۔ رشتے سچائی پر قائم ہوتے ہیں۔ جھوٹ رشتوں کا حسن برباد کر دیتا ہے۔''

''اوہو۔ تو فلاسفر صاحبہ عبید کو بھی بتا دو کہ تم اور میں رابطے میں ہیں۔'' فرخ نے طنزاً کہا تو ایک لمحے کو ثانیہ گڑبڑا گئی۔ پھر قصداً لاپرواہی سے گویا ہوئی۔

''یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے۔''

''اگر تمہاری وجہ سے میرے اور نمرہ کے رشتے میں کوئی دراڑ آئی تو میں تمہارا جینا حرام کر دوں گا۔'' اس نے دھمکی دے کر کال کاٹ دی۔

''بھاڑ میں جاؤ تم بدتمیز انسان۔'' ثانیہ نے فون پھینک دیا۔ دھیان پھر سے عبید کی طرف چلا گیا۔

''وہ کیسے عبید کا وہاں جانا بند کروائے۔''

☆☆☆

عبید دروازہ کھول کر اندر آیا۔ وہ لاؤنج پر صوفے پر لیٹی تھی۔ ایک بازو آنکھوں پر رکھا ہے۔ آہٹ پر بھی نہیں اٹھایا۔

''طبیعت ٹھیک ہے۔'' عبید نے شاپر سامنے میز پر رکھا۔

''میری طبیعت کو کیا ہونا ہے۔'' ثانیہ نے بازو ہٹا کر میز پر پڑے شاپر کو دیکھا۔

"امی نے پلاؤ بنایا تھا۔ تو تمہارے لیے بھجوادیا۔" عبید نے اس کی نگاہوں کا جواب دیا۔
"اتنی محبت...... ہاں بھئی بیٹا تو واپس ہتھیالیا ہے۔ اس کے سامنے اچھی تو بنیں گی۔"
"وہ تو ہمیشہ سے کرتی ہے۔" عبید نے وہیں کھڑے کھڑے سنسان پڑے کچن کا جائزہ لیا۔
"تم نے کچھ پکایا نہیں۔"
"تم تو وہاں سے کھا آتے ہو۔ میں نے کس کے لیے پکانا تھا۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کل والے لباس میں ملبوس وہ مرجھائی مرجھائی سی لگی۔ لگتا تھا آج کہیں باہر بھی نہیں گئی۔ عبید نے پاس بیٹھ کر ریموٹ اٹھالیا۔
"سنا ہے ارم آئی ہوئی ہے؟"
"ہوں۔" عبید نے ٹی وی آن کیا۔
"تبھی اتنا دل لگتا ہے۔ بھائی بہن کی باتیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔" ثانیہ کا لہجہ حسد اور جلن میں بجھا تھا۔
"بھائی بہن کی باتیں تو ایسی ہی ہوتی ہیں۔" وہ چینل بدلنے لگا۔
"مجھے کیا پتا۔ وسیم نے کب مجھ سے بیٹھ کر باتیں کی ہیں۔" ثانیہ کے لہجے میں حسرت در آئی۔ عبید نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔
"میرے خلاف تو خوب بولتی ہو گی۔" عبید زیر لب مسکرایا۔
"ہماری تو آپس کی باتیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔" عبید کے جملے نے جلتی پر تیل چھڑکا۔
"کیا ناراض ہو کر آئی ہے۔"
"کیوں......؟" عبید نے حیرت سے پوچھا۔
"بہت دنوں سے یہاں ہے۔ پہلے تو کبھی اتنے دن نہیں رکی۔"
"تمہیں اتنا تجسس ہے؟"
"تجسس کیسا۔ ویسے ہی پوچھ لیا۔ تم نہ بتاؤ۔"
"روز تو اپنی امی کے گھر جاتی ہو۔ ایک چکر پڑوس میں بھی لگالینا۔ پتا چل جائے گا۔ گھر میں کیا کیا چل رہا ہے۔" عبید نے اطمینان سے کہہ کر آواز اونچی کرلی۔
"مجھے کیا ضرورت ہے۔" وہ غصے سے کہہ کر اٹھ گئی۔
"یہ پلاؤ تو لیتی جاؤ۔"
"مجھے نہیں کھانا۔"
"اچھا رکھ دو۔ میں رات کو کھالوں گا۔"
اس کی کسی بھی بات کا اب عبید پر اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ تسلی اور اطمینان سے سارے کام سرانجام دیتا۔ اس کے طنز، طعنے، جذباتی میلنگ۔ حسن کے جلوے کچھ بھی اثر نہ ہوتا۔
زندگی معمول کی طرح گزر رہی تھی۔
وہی معمول...... جس کے بارے میں ثانیہ کہتی تھی کہ مجھے گزارنی پڑے تو مر ہی نہ جاؤں۔

☆☆☆

کچن میں ہوتی کھٹ پٹ سے ان کے دل میں کھد بد ہو رہی تھی۔ خوشبو بھی خوب اٹھی تھی۔
"نجانے کیا پکائے جا رہی ہے۔"
تجسس میں اٹھ کر کچن میں جھانکا۔ بانو ڈونگے میں سالن نکال رہی تھی۔ بھنا چٹپٹا گوشت اور اس کی خوشبو۔
"شکر ہے گھر میں کچھ ڈھنگ کا پکا۔" اچھا سالن دیکھ کر نادرہ کی بھوک چمک گئی۔ سبزی دال کھا کھا کر منہ کا

ذائقہ۔ خراب ہو گیا تھا۔
پھر ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ جب بانو نے ڈونگا ڈھک کر ایک طرف رکھا اور پتیلی میں پانی ڈال کر آنچ تیز کر دی۔
''ہائے ہائے...... یہ گھڑا پانی کا کیوں انڈیل دیا۔'' نادرہ تڑپ کر آگے ہوئیں۔
''کیا ہوا؟ آپ نے تو ڈرا دیا۔ آپ لوگوں کے لیے سالن بنا رہی ہوں۔'' بانو بیچ میں اس اچانک چھاپے پر ڈر گئی تھی۔
''ہمارے لیے؟ اور یہ کس کے لیے نکالا ہے۔'' انہوں نے ڈونگے کا ڈھکن اٹھایا تو بانو کے لبوں پر شرارتی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے ڈھکن نادرہ کے ہاتھ سے لے کر دوبارہ رکھا۔
''یہ تو نتاشا بی بی کے لیے ہے۔ وہ شوربے والا سالن نہیں کھاتی ہیں۔'' نادرہ کے تو سر پر بجھی...... اسی لمحے ثانیہ آ گئی۔
''دیکھو...... جو بلا ہمارے سر بٹھائی ہے۔ اس کے کرتوت...... سارا گوشت نکال کر چار ہڈیوں میں پانی ڈال دیا۔ ہم جانور ہیں۔ جو بھی گھاس پھونس پکا کر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے تو کبھی کچا پانی......'' صحن میں دھوپ میں لیٹی دادی کی بند آنکھوں میں بہت سے منظر گھوم گئے۔ بوڑھے لبوں پر بوسیدہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وقت بدل گیا۔ لوگ بدل گئے۔ لیکن نہ حالات بدلے، نہ کردار، اختیار اور بے بسی کا کھیل صدیوں سے جاری تھا۔
''کس بات پر شور ہے۔ اب آپ کی عمر ہے بھنا گوشت کھانے کی۔'' نتاشا کی آنکھیں نیند سے لبریز تھیں۔
ثانیہ نے کھا جانے والی نظروں سے اس گھر کی نئی ملکہ کو دیکھا۔
''جو مل رہا ہے۔ صبر شکر کر کے کھا لیں۔ کہیں اس سے بھی ہاتھ نہ دھونے پڑ جائیں۔''
''کہنا کیا چاہتی ہو؟'' ثانیہ کی پیشانی شکن آلود ہوئی۔
''ظاہر ہے تمہاری طرح میں بھی اپنے شوہر کی کمائی سسرالیوں پر لٹانے تو نہیں دوں گی۔'' نتاشا کو بغیر تیلی کے آگ لگانا آتی تھی۔
''وہ میرا بیٹا ہے۔'' نادرہ نے دانت کچکچائے۔
''بہت کر لی۔ اپنے بیٹے کی کمائی پر عیش۔ اب اپنے شوہر سے کہیں۔ اپنی پینشن بھی ہلا لیں۔ ہم نے اپنی فیملی بھی پلان کرنی ہے۔''
''تم خود کو سمجھتی کیا ہو۔ کیا لگتا ہے تمہارا جو دل چاہے گا تم کرتی جاؤ گی اور کوئی تمہیں روکنے والا نہیں ہو گا۔'' ثانیہ بھپر کر سامنے آئی۔
''کون روکے گا تم؟'' نتاشا نے استہزائیہ انداز میں اسے سرتاپا دیکھا۔
''وہی روکے گا جس کے بل بوتے پر تم اچھل رہی ہو۔ تمہارے حسن کا جادو کتنے دن چلے گا۔ ایک نہ ایک دن خود ہی حقیقت سامنے آ جائے گی۔ وسیم اتنا بھی بے وقوف نہیں ہے۔'' ثانیہ اپنے لفظوں پر خود ہی ششدر رہ گئی۔
''وہ عبید سے کہیں زیادہ بے وقوف ہے۔ اور میں وہی جو کر رہی ہوں تو تم نے کیا۔ پھر مجھ پر اتنا غصہ کیوں ہو رہی ہو۔''
''میں نے تمہارے جیسی گھٹیا حرکتیں نہیں کی تھیں۔''

''جو تم نے کیا اس کے لیے لفظ گھٹیا بھی کم لگتا ہے۔'' نتاشا ہنسی۔
''کس کے منہ لگ رہی ہو۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔''
''اس کی زبان تو میں کاٹوں گی۔'' ثانیہ بپھر کر آگے بڑھی۔ نادرہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ کچھ بعید نہ تھا کہ دونوں یہیں گتھم گتھا ایک دوسرے کے بال نوچ رہی ہوتیں۔
''مجھے دھمکیاں دے کر اپنے پیروں پر کلہاڑی مت مارو ورنہ عبید کو تمہارے سارے کرتوت بتا دوں گی۔ اس کے پیٹھ پیچھے کیا کرتی پھر رہی ہو۔'' نتاشا نے شرربار نگاہوں سے گھورتے دانت پیستے ہوئے بات مکمل کی۔
''کیا بکواس کر رہی ہو؟''
نتاشا نے جواب دینے کے بجائے موبائل کھولا۔
سارے لفظ بے معنی ہو جاتے ہیں۔ جب انسان کے سامنے اس طرح کے منظر آ جائیں۔ نتاشا نے موبائل کا رخ ثانیہ کی طرف کیا۔
ثانیہ کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ خود نادرہ نے لبوں پر انگلیاں رکھ لیں۔
''عبید بے وقوف تو ہو سکتا ہے۔ بے غیرت نہیں۔ تمہاری بدقسمتی جب تم اپنے پرانے عاشق کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھی لنچ کر رہی تھیں۔ میں بھی وہاں موجود تھی۔ اب بتاؤ کس کو بھیجوں؟ وسیم کو یا عبید کو......''
''جھوٹ مت بولو۔ میں وہاں اس کے ساتھ اکیلی نہیں تھی۔'' ثانیہ کی زبان لڑکھڑا گئی۔
''ثابت کیسے کرو گی؟'' نتاشا نے موبائل اس کی نظروں کے سامنے لہرایا۔ جہاں وہ اور فرخ بیٹھے تھے اور نمرہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔
''الزام لگانا آسان ہوتا ہے۔ مگر خود کو بے قصور ثابت کرنے میں عمریں گزر جاتی ہیں۔ تم نے ارم کے ساتھ یہی تو کیا تھا۔ اس لیے مجھ سے بہتر جانتی ہو۔ سو مس ثانیہ، میرے گھر کے معاملات سے دور رہو۔ ورنہ پیروں تلے سے زمین کھینچ لوں گی۔ بانو، میرا کھانا کمرے میں لے آؤ۔'' ثانیہ گم صم سی نتاشا کی فاتحانہ چال دیکھتی رہی۔ نادرہ نے دو ہتڑ اس کے بازو پر مارے۔
''تم فرخ کے ساتھ کہاں کہاں گھومتی رہی ہو۔''

☆☆☆

وہ بہت عجیب دن تھا۔ دھوپ دادی کے اوپر سے غائب ہو کر شام کا لبادہ اوڑھ گئی اور شام تاریکی میں ڈھلنے لگی۔ کمروں میں گھسے نفوس اور فضا میں اترتی خنکی۔ دادی کو کپکپی چڑھنے لگی۔ تو نحیف آواز میں شور مچانے لگیں۔ نادرہ غصے میں بھری کمرے سے نکلیں۔ کھینچ کھانچ کر اندر والے پلنگ پر پٹخا۔ آج تو شبیر بھی نجانے کہاں رہ گیا تھا۔
''بھوک سے تو نہ مار نادرہ......'' ان کی کپکپاتی آواز پر ایک لمحے کو نادرہ ٹھٹکیں۔
نجانے انہوں نے کتنے عرصے کے بعد ان کا نام لیا تھا۔ نادرہ نے مڑ کر ساس کو دیکھا۔ تکیے پر سر رکھے وہ انہی کو دیکھ رہی تھیں۔ خالی آنکھیں...... اتنی خالی کہ نادرہ کا دل دہل سا گیا۔ کسی عجیب سے احساس نے چٹکی سی لی۔
''آج میرے پاس ہی سو جا۔''
گرما گرم شوربے میں چند نوالے روٹی کے بھگو کر لائیں تو دادی نے فرمائش کر دی۔
''مجھے یہاں نیند نہیں آتی......''
''ٹھیک ہے۔'' دادی نے روکھا لہجہ شوربے کے گھونٹ کے ساتھ اپنے اندر اتار لیا۔ مگر انہیں لگا سب

کچھ باہر آ جائے گا۔
انہوں نے پیالی میز پر دھر دی۔ نادرہ دروازہ بند کر گئی تھیں۔
کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ نیم تاریکی میں وحشت کچھ آہٹیں...... کچھ سرسراہٹیں۔
پتا نہیں کیوں؟ اندر کلیجہ کٹ سا رہا تھا۔ ٹانگوں سے جان نکلی جا رہی تھی۔ ان کا دل چاہا سارے ان کے پاس آ جائیں۔ وحشت کے ان لمحوں میں اکیلا پن اذیت ناک تھا۔ حلق میں کچھ اٹک سا گیا۔ انہوں نے پکارنا چاہا۔ اور شاید پکارا بھی۔ مگر آواز ان کا پلنگ بھی نہ ٹاپ سکی۔ بند دروازہ کیسے کھولتی۔ انہوں نے اپنی ماں کو دیکھا۔ پھر اپنے باپ کو...... انہوں نے اپنے ان بچوں کو دیکھا۔ جوان کی کوکھ میں ہی دم توڑ گئے تھے۔
پیٹ میں اینٹھن ہونے لگی۔ ان کا دل چاہا۔ کوئی انہیں گود میں بھر کے بھینچ لے۔ درد بڑھتا گیا۔ زندگی گھٹتی گئی۔ وہ موت کیسی ہوتی ہے۔ جس میں آپ کا کوئی بھی اپنا آپ کے پاس نہ ہو۔

☆☆☆

صحن میں جنازہ رکھا تھا۔
لوگ آتے میت کا چہرہ دیکھتے دکھ کا اظہار کرتے پھر دور بیٹھ کر اپنے اپنے دکھ یاد کر کے رونے لگتے۔ ماجرہ اور عفان بھی آئے تھے۔ ظاہر ہے وہ ارم کی بھابھی کی دادی تھیں۔ سب سے زیادہ عجیب کیفیت رابعہ کی تھی۔ وہ کھل کر رو بھی نہیں رہی تھی۔ بس ٹکر ٹکر میت کا چہرہ دیکھتی رہی۔ جنازہ اٹھنے کے بعد بھی اس کی یہی کیفیت تھی۔
سہیل کہہ کر گیا تھا۔ مہمان خواتین کو کھانا کھلانا ہے۔ کھانا عبید کے گھر سے آیا تھا وہ تب بھی اٹھ نہ پائی ارم اور آسیہ نے سب معاملات سنبھالے۔ دادی کے جنازے کے بعد سے ثانیہ ارم کا چہرہ ہی ٹٹولتی رہی۔ وہ بار بار جا کر اپنی ساس کو پوچھ رہی تھی۔ جو جنازے کے تھوڑی دیر بعد ارم کا ماتھا چوم کر چلی گئی تھیں۔
ساس بہو کی یہ محبت اسے دکھاوا ہی لگی۔
"جب فوت ہوئیں۔ تم پاس تھیں۔"
کوئی نئی آنے والی پوچھ رہی تھی۔ نادرہ نے خشک آنکھوں پر پلو رکھ کر ہچکی لی۔ کوئی ناپسندیدہ ہستی کے لیے کتنا رو سکتا ہے۔ جو خون کا رشتہ تھا۔ اس پر چار آنسو بہا کر وہ خالی ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔
"ہاں...... ہاں میں سرہانے ہی تو بیٹھی تھی۔ مجھے کہا بھی جا کر سو جاؤ۔ میں نہیں گئی۔ طبیعت گری گری تھی۔ آخری نوالہ میں نے اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔ پانی کا گھونٹ پلایا۔ وہ دیکھو ابھی بھی پلنگ کے کنارے پیالی دھری ہے۔ ساس تھوڑی تھی۔ میری تو ماں تھی۔"
رابعہ نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔
صبح صبح جب سارا گھر نیند کے مزے لے رہا تھا۔ نادرہ کی کال آ گئی۔
"چپکے سے نکل آ۔ کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ تیری دادی ٹھیک نہیں ہے۔" نادرہ کے ہاتھ پیر پھولے تھے۔ آواز لرز رہی تھی۔ وہ بتائے بغیر کیسے آتی۔ سہیل کو جگایا۔ بچوں کا خیال رکھنے کو کہا۔
"ہسپتال لے جانے کی ضرورت ہوئی تو بتانا۔" پہلے بھی ایک دو بار دادی کی طبیعت ایسے ہی خراب ہوئی تھی۔
مگر دادی کو دیکھ کر رابعہ کے لبوں سے چیخ نکل گئی۔ نادرہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
"ویلا (وقت) سنبھال بعد میں روتی رہنا۔" نجانے کس پہر خون کی قے آئی تھی۔ نجانے کس لمحے

جان نکلی ہوگی۔ لرزتے کانپتے ہاتھوں سے ماں بیٹی نے ویلا سنبھال لیا۔ کہ گھر میں موجود نتاشا کو بھی خبر نہ ہوئی۔ جس لمحے صاف ستھرے بستر پر صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس دادی کی میت صحن میں رکھی۔ تب سینے پر دوہتڑ مارتی نادرہ چلائیں۔

''ہائے میری ماں۔''

''رابعہ آپی اٹھ جائیں۔ دو نوالے کھالیں۔'' ارم نے بہت پیار سے رابعہ کو اٹھایا اور ثانیہ سے بھی آنے کو کہا۔ نتاشا جنازے کے بعد اپنے رشتے داروں کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

شام تک سارا ہنگامہ سمٹ گیا۔ ایک ناپسندیدہ ایک فالتو وجود سے گھر خالی ہوگیا۔ امرود کے درخت پر چڑیاں شور مچاتی رہیں۔ اور تخت پر بیٹھے شبیر کو دیکھتی رہیں۔ جو بار بار آہ بھرتے تاسف سے سر ہلاتے تھے۔

ماں پاس ہو...... تو پاس بیٹھنے کا وقت نہیں ملتا۔ مگر ماں مر جائے تو بہت یاد آتی ہے۔

☆☆☆

دادی کے کمرے سے پرانا سامان دنوں میں غائب ہوگیا۔ نیچے قالین بچھ کر نیا بیڈ بھی آ گیا۔ صاف ستھرا کمرہ روشن اور ہوادار تھا۔ وہاں سے دادی ہی نہیں ہر نشانی دنوں میں رخصت ہوگئی تھی۔

نادرہ نے سکھ کا سانس لیا۔ ایک بڑی ذمہ داری ایک بوجھ سر سے اتر گیا تھا۔ اب وہ اس گھر کی بڑی تھیں۔ معتبر جگہ پر تھیں۔

بس اسی زعم میں بانو کو ٹوک بیٹھیں۔ جو مشین کے گندے پانی میں شبیر کے سفید کپڑے ڈال رہی تھی۔ بانو کے مزاج کہاں ملتے تھے۔

''بس باجی، میں کام نہیں کرسکتی۔ مجھے واپس بھیج دیں۔''

''اب کیا آفت آ گئی۔'' نتاشا نے موبائل سے نظریں ہٹا کر بانو کو دیکھا۔

''اتنی روک ٹوک۔ کھانا ایسے نہیں پکانا۔ کپڑے ایسے نہیں دھونے۔ صفائی بھی پسند نہیں آتی۔''

ڈرامے کرنے بانو کو بھی خوب آ گئے تھے۔

''ایسا کیا غلط کہہ دیا میں نے۔ ڈھنگ سے کام تو کیا کرے۔''

نادرہ کچھ بے چین ہوکر پیچھے ہی چلی آئیں۔ وسیم چھٹیوں پر گھر آیا ہوا تھا۔ اگرچہ ابھی کسی دوست کی طرف گیا تھا۔

''آپ کو اگر نوکروں سے کام لینے کی عادت نہیں ہے تو چپ کر کے ایک کونے میں کیوں نہیں بیٹھ جاتیں۔''

یا اللہ! ابھی تو ساس مری تھی۔ ابھی تو مکمل اختیار ہاتھ میں آیا تھا۔ بہو آتے ہی انہیں ہر معاملے سے نکال باہر کررہی تھی۔ وہ نتاشا سے گھبراتی تھیں۔ مگر اس وقت غصہ آ گیا۔

''کیوں بیٹھ جاؤں۔ میرا گھر ہے۔ کچھ غلط ہوتا دیکھوں گی تو ٹوکوں گی نا۔''

''لگتا ہے عزت راس نہیں ہے آپ کو۔ نہ سکون سے خود رہیں گی نہ مجھے رہنے دیں گی۔'' نتاشا نے موبائل پٹخا اور سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔

''بات سنو بی بی! میں نے بڑا برداشت کرلیا۔ اب اور نہیں کروں گی۔ یہ میرا گھر ہے۔ کمیٹیاں ڈال ڈال کر ایک ایک چیز میں نے بنائی ہے۔ اس لیے نہیں کہ سارا کچھ تمہارے حوالے کر کے ایک کونے میں بیٹھ جاؤں۔ تمہارا نہیں گزارا تو جاؤ اپنے ماں باپ کے گھر میں رہو۔''

پتا نہیں نادرہ کے اندر ایسی جرات کہاں سے آ گئی تھی کہ وہ اس گھر پر اپنی حاکمیت اور حق جتا سکیں۔

''ٹھیک ہے تو سنبھالیں اپنا گھر۔ بانو آج کے بعد تم کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاؤ گی۔'' نتاشا نے کہا تو بانو نے جھٹ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''نہ لگائے۔ میرے ہاتھ نہیں ٹوٹے میں کر سکتی ہوں۔'' نادرہ بڑبڑاتی ہوئی واپس آ گئیں۔

☆☆☆

''نہ مجھے بتا دیں میری اس گھر میں حیثیت کیا ہے۔ ساری زندگی تمہاری ماں اور بہن کے ہاتھوں ذلیل ہوئی ہوں۔ اب بہو آ گئی ہے۔ جو مجھے کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ نوکرانی کے سامنے اتنی دفعہ بے عزتی۔''

نادرہ رو ہی پڑیں۔ رابعہ نے تسلی دینے والے انداز میں ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ثانیہ نے شاکی نظروں سے باپ کو دیکھا۔ وہ ساتھ دیتے تو کس کی مجال تھی۔ ماں کی اتنی بے عزتی کرتے۔

''میرا حق کس پر ہے پہلے سسرال تھا اب بیٹے کا گھر ہو گیا ہے۔ میں کہاں ہوں؟ میرا گھر کون سا ہے۔ میرا اختیار میری خوشی کہاں ہے؟ میں نے دل مار کر روپیہ روپیہ جوڑ کر ایک ایک چیز بنائی ہے۔ اور آج نہ میرا اولاد پر حق رہا نہ گھر پر۔ کسی اور کو چھوڑو۔ میں ایک نوکرانی کو بھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

''حد ہی ہو گئی ہے۔'' شبیر زیر لب بڑبڑائے۔

''سب آپ کی شہہ ہے ابا! آپ گھر کے سربراہ ہیں۔ آپ کے ہوتے اس گھر میں اتنا کچھ ہو رہا ہے۔''

ثانیہ کا لہجہ تلخ مگر آواز مدھم تھی۔ براہ راست نتاشا کے مقابل آنا نقصان دہ تھا۔

''ہاں ابا کچھ کریں تو شاید......'' اس نے قائل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

کچھ شبیر بھی گھر کے حالات سے اکتائے ہوئے تھے۔ تبھی بیوی کے آنسو دل پر اثر کر گئے۔

''بلاؤ ان کو آج کھل کر بات ہو ہی جائے۔''

''ابا!'' رابعہ نے باپ کو دیکھا۔ ''تحمل سے، ورنہ مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ دلوں میں دوریاں بڑھ جائیں گی۔ وسیم بدظن ہو جائے گا۔ پیار محبت سے بٹھا کر سمجھائیں۔'' ثانیہ تڑپ کر سیدھی ہوئی۔

''ابا ہرگز نہیں۔ وہ اس قابل نہیں کہ اس کے ساتھ پیار محبت سے بات کی جائے۔ دوٹوک بات کریں۔ کب تک اماں کی بے عزتی کرواتے رہیں۔ آپ کا گھر ہے آپ سربراہ ہیں۔ باپ ہیں۔ دب کر بات کریں گے تو اسے اور شہہ ملے گی۔''

''ثانیہ! اس طرح بات بگڑ جائے گی۔'' رابعہ گھبرا گئی۔

''بگڑنے کو رہ کیا گیا ہے۔ بس اتنا کہ وہ ہمارا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دے اور ہم جا کر کسی دارالامان میں رہ لیں۔ کچن کو تالے لگ گئے۔ سودا سلف اس کی مرضی سے آتا ہے۔ خرچہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ بتاؤ اب ہم کیا خودکشی کر لیں۔'' نادرہ تڑپ کر بولیں۔

''خوامخواہ بہت ہو گیا۔ بلاؤ وسیم کو آج کھل کر بات ہو گی۔''

ٹھنڈے دودھ میں ابال آ ہی گیا۔ نادرہ کے کلیجے میں ٹھنڈ سی پڑ گئی۔ ثانیہ نے ڈٹے رہنے کا اشارہ دیا۔

☆☆☆

کمرے میں صرف شبیر کی آواز تھی۔ اگرچہ جوان بیٹے کے سامنے بیٹھنے پر آواز میں وہ گھن گرج نہ رہی تھی۔ پھر بھی انہوں نے بات کی۔

وسیم خاموشی سے سنتا رہا۔ درمیان میں ایک لقمہ تک نہ دیا۔

پہلو میں بیٹھی ثناشا تیوری چڑھائے ایک ایک کو گھورتی رہی۔ اس کے اطمینان پر نادرہ کو بے چینی سی ہوئی۔ ثانیہ موبائل کھول کر بیٹھ گئی۔ یعنی اس پورے قصے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ثناشا سے نظریں ملتیں تو رابعہ خوامخواہ مسکرانے لگتی۔ شاید ماحول کی تلخی کم کرنے کو۔

''ایک ایک بات تمہیں کھل کر بتادی ہے۔ گھر کے بڑے سمجھنا تو ایک طرف ہمیں تو ردی مال کی طرح کونے میں پھینک دیا گیا۔ نہ کھانا ڈھنگ کا۔ نہ لباس صاف۔ کچن کی چیزیں الماریوں میں بند۔ تالے لگے ہوئے ہیں۔ یہ بچیاں آجائیں تو یہاں رونے پڑ جاتے ہیں۔'' انہوں نے ذرا وقفہ لے کر ثناشا کو دیکھا۔

''یہ شریف گھرانے کی بہو بیٹیوں کے طریقے ہوتے ہیں۔ یہ تمہاری ماں بھی تو تھی۔ دیکھا نہیں تھا کس طرح ساس کی خدمت کرتی۔ گھر سنبھالتی تھی۔''

''ہاں تو اور کیا؟ پورا پورا ٹبر بھی پالا اور ساس نند کی گالیاں بھی سنیں۔'' نادرہ کا لہجہ بھیگ گیا۔

''آپ چاہتی ہیں۔ میں بھی آپ جیسی زندگی جیوں۔'' ثناشا نے بھنویں اچکائیں۔

''تم چپ کرو۔'' وسیم نے جھنجھلا کر ڈانٹا۔ ثناشا چپ ہوگئی۔ سب کے کلیجوں میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ ان کی باتوں کا اثر ہو رہا تھا۔

''یہ ہمارے خاندان، ہمارے گھرانوں کے طریقے نہیں ہیں۔ اور اوپر سے تم ایسے عقل کے اندھے، کہ ساری تنخواہ اس کے ہاتھ میں دے کر سیاہ و سفید کا مالک بنا ڈالا۔''

''خود تو گوشت بھون بھون کر کھاتی ہے۔ اور بس نہیں چلتا کہ ہمیں جوتیوں میں دال بانٹے۔'' نادرہ پلو منہ پر رکھ کر سسکنے لگیں۔

''بس ہو گیا۔'' وسیم نے ایک نظر سب پر ڈالی۔ ''اب اس سارے مسئلے کا حل کیا ہے؟''

''اس کو اس کے میکے بھیجو۔ جب تک اس گھر میں رہنے کے طور طریقے نہیں سیکھے گی۔ یہ ہمارے ساتھ نہیں رہے گی۔'' شبیر نے فیصلہ سنایا۔

''اور ہمیں ایسی گز بھر زبان والی بہو چاہیے بھی نہیں۔'' نادرہ کا ہمت و حوصلہ عروج پر تھا۔

''تم ہماری اولاد ہو۔ تمہارا برا تو نہیں چاہیں گے۔ پھر بھی اگر یہ زیادہ پیاری ہے تو ہم سے کوئی تعلق نہ رکھنا۔'' شبیر نے تڑی لگائی۔

''ابا! تحمل سے۔'' رابعہ منمنائی۔

ثانیہ کے لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ ابھری۔

''ٹھیک ہے فیصلہ تو ہو گیا۔ اس طرح تو واقعی گھر نہیں چل سکتا۔'' وسیم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر گردن موڑ کر ثناشا کو دیکھا۔

''ثناشا تم اپنا سامان سمیٹ لو۔ تم اب یہاں نہیں رہ سکتیں۔'' اس کے اچانک فیصلے پر سب دم بخود رہ گئے۔ نادرہ کے دل میں سکون کی لہر دوڑ گئی۔ ماں باپ آخر ماں باپ ہی ہوتے ہیں۔

''وسیم کیا کر رہے ہو۔ یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔'' رابعہ بوکھلائی۔

''چپ۔'' نادرہ نے ڈانٹا پھر ثناشا کو دیکھا۔

''سنا نہیں میرے بیٹے نے کیا کہا ہے۔ جا کر اپنا سامان سمیٹو جب دماغ ٹھیک ہو جائے تب آنا۔''

''سامان کون سا سمیٹے گی لے کر کیا آئی تھی۔'' ثانیہ بڑبڑائی۔ ثناشا نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہر گھر کے کچھ طور طریقے ہوتے ہیں۔ ادب آداب ہوتے ہیں۔ بہو کا فرض ہے کہ ان کا خیال رکھے۔ یہ کیا گھٹیا سوچ ہے کہ آتے ہی سارے گھر پر قابض ہو کر بڑوں کو کونے میں ڈال دیا جائے۔ جیسے وہ فالتو ہوں۔" کہتے کہتے نجانے کیوں انہیں دادی یاد آ گئی تو وہ چپ ہو گئیں۔

"تو ثانیہ کو یہ سب سکھا کر کیوں نہ بھیجا۔ اس نے بھی تو یہی سب کیا۔ میری دفعہ عدالت لگ گئی۔" ثناشا کے تلخ جملے پر اس سے پہلے کہ ثانیہ تڑپ کر جواب دیتی۔ وسیم نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

"سامان پیک کرو۔ ثناشا ہمیں ابھی نکلنا ہے اور خیال رکھنا ان کی کوئی چیز تمہارے ساتھ نہ جائے۔ تمہارے پاپا نے وہاں پورا گھر سیٹ کروا دیا ہے۔" سب جیسے بیٹھے بیٹھے آسمان سے زمین پر گرے تھے۔

"ہیں کیا مطلب؟" ہکا بکا شبیر نے وضاحت چاہی۔

"مطلب میں ثناشا کو لینے ہی آیا ہوں۔" وسیم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"ثناشا کے پاپا گھر سیٹ کروا رہے تھے۔ اس لیے ثناشا کو کچھ عرصہ یہاں رہنا پڑا۔ اور اس دوران جو ڈرامے اور تماشے ہوئے۔ اس کے بعد میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا کہ میری بیوی ایک دن بھی آپ لوگوں کے ساتھ رہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" شبیر کے غبارے میں سے ہوا ہی نکل گئی۔

"اور ہم نے کیا کیا ہے؟ سارا خرچہ تو تم اس کے ہاتھ میں دیتے ہو۔" نادرہ کی اپنی حالت پتلی ہو گئی۔

"جب آپ میری محنت کی کمائی اپنی بیٹیوں کا گھر بھرنے میں لگا دیں گی تو ثناشا یہ ہی کرے گی۔" وسیم نے گویا آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔

"کیا لے گئے ہم اس گھر سے۔" ثانیہ کو تاؤ آ گیا۔ جہیز کے نام پر دو جوڑے نہیں دیے اور......"

"جو ہر مہینے اپنی ماں سے پیسے لے جاتی تھیں۔ وہ کس کھاتے میں تھے۔" ثناشا نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ثانیہ ایک لمحے کو گڑبڑائی۔ پھر سنبھلی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے میرا میاں خود اچھا خاصا کماتا ہے۔"

"جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"لو میرے پاس اتنے پیسے کہاں کہ کسی کو دے سکوں۔" نادرہ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

"میری تو کمیٹیاں پوری نہیں ہوتیں اور وہ پیسے وہ تو ثانیہ نے فرخ سے ادھار مانگے تھے۔" اپنی وضاحت دیتے دیتے وہ ثانیہ کی ہانڈی چوراہے میں پھوڑ گئیں۔

"تم فرخ سے پیسے لیتی ہو۔" رابعہ نے غصے اور حیرت سے پوچھا۔

"ایک بار ادھار لیے تھے۔ واپس کر دیے ہیں۔" ثانیہ پانی پانی ہو گئی۔

"یہ اس گھر میں ہو کیا رہا ہے۔" شبیر نے برہم ہو کر پوچھا۔ وسیم غصے سے کھڑا ہو گیا۔

"ابا! آپ آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہیں۔ یہاں گھر کے بھرم اور عزت نیلام ہو رہی ہے۔ اور مجھے پورا یقین ہے عبید کو بھی نہیں پتا ہو گا۔ تم اب بھی فرخ کے ساتھ رابطے میں ہو۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے وسیم۔" ثانیہ بوکھلا کر وضاحتیں دینے لگی۔

"بس کریں وسیم۔" ثناشا نے کھڑے ہو کر وسیم کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ "یہ ان کے گھر کے مسائل ہیں۔ ہماری اپنی بھی زندگی ہے۔ تمہاری بہنوں کے ماں باپ یہ کھڑے ہیں۔ یہ جانیں اور ان کا کام۔" رابعہ سر جھکا کر ہونٹ کاٹنے لگی۔

"میں سامان پیک کر لوں۔" ثناشا کہہ کر کمرے سے چلی گئی۔ رابعہ نے وسیم کی بہت منتیں کیں۔ مگر وہ

خاموشی سے اپنا سامان اٹھانے لگا۔

''جانے بھی دیں جان چھوٹ رہی ہے۔'' ثانیہ نے تلملا کر کہا۔

''زبان بند رکھو ورنہ منہ توڑ دوں گا۔'' شبیر نے بپھر کر کہا تو ثانیہ نے چپ سادھ لی۔

''سب تمہارا قصور ہے۔'' شبیر نادرہ پر برسے۔ ''تمہاری باتوں میں آ گیا۔ نظر آ رہا تھا بیٹا ہاتھوں سے نکل رہا ہے۔ اس کی بیوی سے بگاڑ کر ہم کہاں جائیں گے۔ نہ میں کچھ کہتا نہ وہ اتنا سخت فیصلہ کرتا۔''

''میں نہیں جانے دوں گی۔ اس کی گاڑی کے سامنے لیٹ جاؤں گی۔''

دونوں میاں بیوی جذباتی ہو کر کمرے سے نکلے۔ ثانیہ نے سر پیٹ لیا۔

''چڑیل سے جان نہیں چھڑائیں گے۔ کلیجے سے لگا کر رکھیں گے۔''

''یہ لے جا کر گاڑی میں رکھو۔'' نتاشا نے بیگ بانو کی طرف بڑھائے۔ وسیم پاس ہی کھڑا تھا۔ تبھی شبیر تیزی سے اندر آئے۔

''کیا کر رہے ہو یار۔ رکھو سامان کوئی اتنی معمولی باتوں پر اتنے بڑے فیصلے کرتا ہے۔ ہو گئی ہم سے غلطی معاف کر دو۔'' وسیم باپ کے گلے لگ گیا۔

''اللہ حافظ ابا...... کوشش کروں گا آتا جاتا رہوں۔''

جانے والے جب کوچ کا فیصلہ کر لیں تو نہ آنسو قدموں کی زنجیر بنتے ہیں۔ نہ کسی کی دہائیاں کام آتی ہیں۔

''وسیم میں مر جاؤں گی۔'' نادرہ گلے کا ہار بن گئیں۔ واسطے، ترلے، منتیں، اپنی قربانیاں، تکلیف، درد جو اسے پروان چڑھانے میں سہا۔ کچھ تو ایسا ہو گا جو وسیم کو روک لے۔

وہ اور جھنجھلا گیا۔

''ابا، کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ دنیا کے سارے ماں باپ یہی کرتے ہیں۔ لیکن جو آپ نے نتاشا کے ساتھ کیا وہ قابل قبول نہیں ہے۔ وہ کتنے بڑے گھر سے، کتنی آسائشوں سے آ کر اس چھوٹے سے گھر میں میرے لیے گزارہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر آپ لوگوں نے کرنے ہی نہیں دیا۔'' نتاشا کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

''وہ جھوٹ بول رہی ہے۔'' نادرہ نے دہائی دی۔

''تو کیا کروں؟ اسے طلاق دے کر دوسری شادی کر لوں۔'' وہ حلق کے بل چلایا۔ تماشہ اب صحن میں ہونے لگا تھا اور گھر کی دیواریں اتنی اونچی نہ تھیں۔ ثانیہ تڑپ کر کمرے کے دروازے میں آئی۔ کیسے ان سب کے منہ بند کروائے۔

''ہاں تم اسے طلاق دے دو۔ میں کسی اچھی لڑکی سے تمہاری شادی کروا دوں گی۔ یہ اس قابل نہیں ہے۔ دیکھو اس نے کیسے ہم سب کو الگ کر دیا۔'' رابعہ نے سر پیٹ لیا۔ نادرہ کا جذباتی پن ہمیشہ ان کے لیے نقصان ہی بنتا تھا۔

''اچھا۔'' وسیم نے مڑ کر ایک نظر سب کو دیکھا۔

''تو پھر ایک طلاق عبید اور ثانیہ کی بھی کروا دیں۔ کیونکہ ثانیہ نے بھی تو یہی سب کیا تھا۔''

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

☆☆

لبنیٰ آصف

تیز مسالہ



"دلہن! کل مہمان آرہے ہیں۔ بریانی تم بنانا۔ سالن بڑی دلہن پکائے گی۔"

"جی آنٹی!" کہہ کر منزہ دل میں ان لمحوں کو کوسنے لگی جب سسرال آکر مزے مزے کی دیگ جیسی بریانی سب کو پکا کر کھلائی اور خوب تعریفیں وصول کیں۔ بریانی تو گلے کو ہی آگئی۔ جب گھر میں کوئی دعوت ہوتی تو ساس منزہ کو بریانی پکانے کا کہہ دیتیں۔

"بڑی بھابھی تو اپنے حصے کا سالن پکایا اور فارغ، جبکہ منزہ کو تاکید ہوتی آخر وقت تک مہمان آجائیں پھر بریانی کو دم لگاؤ کہ گرم رہے۔"

مجبوراً سلاد، رائتہ، کباب فرائی کرنا سب اسی کے حصے میں آتا۔

اسد کو صبح آفس بھیج کر لیٹی تو آپا کو فون کرنے کا خیال آیا۔ فون ملایا اور لگی دل کے پھپھولے پھوڑنے ابھی تھوڑی سی ہی بات ہوئی تھی کہ آواز کٹنے لگی' آپا کہنے لگیں ،نیٹ کا مسئلہ چل رہا ہے۔ وائس میسج پر بات کرلو۔ منزہ نے آپی کو وائس بھیجا کہ بریانی تو گلے کو ہی آگئی ہے۔ ادھر سے آپی کا وائس میسج "عقل مندی سے کام لو، جان ہی چھوٹ جائے گی بریانی سے۔ اب کی بار بریانی میں مرچیں تیز کردو۔ پھر دیکھنا آئندہ نہیں پکوائیں گی تمہاری ساس بریانی۔"

منزہ نے میسج سن کر جواب دیا۔

"ارے آپا! یہ کام اتنا آسان تھوڑی ہے۔ میری ساس کو میری بریانی پسند ہی اسی لیے ہے کہ میں ہلکے مسالے کی بریانی بناتی ہوں۔ مسالہ تیز کردیا تو

اتنی سنائیں گی سوچ ہے تمہاری۔"
آپا بھی کہاں ہار ماننے والی تھیں چھوٹی بہن کی پریشانی دل پر لے لی تھی عمل کرنے کے لیے اصرار کرنے لگیں۔
منزہ نے بھی ہامی بھرلی۔ میسج کا جواب دیا۔ اور اللہ حافظ کہہ کپڑے استری کرنے چلی گئی۔ مہمانوں کے آنے کی وجہ سے آج کام بھی زیادہ تھا۔ اسی لیے ماسی سے کام کرواتے برتن نکلواتے دھوتے آدھا دن نکل گیا۔ دوپہر کے کھانے کے ساتھ ہی منزہ نے بریانی کا مسالہ بھی بنالیا۔ آج سسر سے بریانی مسالہ منگوایا۔ تو جس کمپنی کا بریانی مسالہ منزہ استعمال کرتی تھی۔ ملا ہی نہیں۔ سسر دوسری کمپنی کا لے آئے۔ منزہ نے اعتراض کیا تو سسر نے کہا۔
"بیٹا! نئی چیزیں بھی ٹرائی کرنی چاہئیں کیا پتا یہ اس سے بھی اچھا ہو۔" منزہ بھی مسکرادی۔
بریانی کا مسالہ تیار کرتے منزہ کے ذہن سے بھی نکل گیا کہ مرچیں تیز کرنے کا مشورہ آپا نے دیا تھا۔ منزہ نے اپنے طریقے سے ہی بریانی کا مسالہ بنایا۔ اور چاول صاف کر کے رکھے۔ ہرا مسالہ کاٹ کر رکھا اور کچن صاف کر کے باہر نکل آئی۔
بھابھی بھی جلدی جلدی گوشت کو بھون کر فائنل کررہی تھیں۔ دونوں بہوؤں کا کام ختم ہوا تو ساس بھی ظہر کی نماز سے فارغ ہوگئیں کھانا کھایا اور منزہ بھی آرام کرنے کی غرض سے کمرے میں آگئی۔ لیٹی تو ایسی آنکھ لگی کہ اسد کے فون پر ہی آنکھ کھلی۔
اسد آفس سے نکل رہا تھا، کچھ لانے کا پوچھ رہا تھا۔ "آنٹی نے صبح ہی میٹھا بنانے سے منع کردیا تھا کہ اسد واپسی میں چھوٹے والے گلاب جامن لے آئے گا۔"
منزہ نے یاددہانی کروائی اور موبائل چارج پر لگا دیا۔ ٹائم بھی کم تھا، عصر کی نماز پڑھی، کپڑے بدلے تیار ہوئی اور کمرے سے باہر آگئی۔ بھابھی چائے چڑھا چکی تھیں۔ منزہ نے ٹرالی سیٹ کی۔ اتنے میں اسد بھی آگئے۔ سب نے مل کر چائے پی۔
ساس بتانے لگیں "مہمان ساڑھے سات تک آجائیں گے۔"
بھابھی کا سالن تو تیار تھا۔ منزہ کے بہت سے کام تھے چاول بھگونا، تہ لگانا۔ منزہ مغرب کی نماز پڑھ کر کچن میں آگئی۔ جلدی جلدی چاول بھگوئے۔ شکر ہے بھابھی نے چائے کے برتن دھو کر کچن سمیٹ دیا تھا۔
چولہے پر چاولوں کا پانی چڑھایا ہی تھا کہ مہمانوں کے آنے کا شور سنائی دیا۔ سلام دعا کر کے واپس کچن میں آئی تو بھابھی شربت پیش کرنے کے لیے ٹرے سیٹ کررہی تھیں۔ منزہ سے کہنے لگیں۔
"تم بریانی کو دیکھ لو۔ میں جوس سرو کر کے سلاد کاٹ لوں گی تم رائتہ بنالینا۔"
"چلو کچھ تو کام آسان ہوا۔" منزہ نے جلدی جلدی چاول ابالے اور بریانی کی تہ لگا کر دم پر رکھا اور رائتہ بنایا کباب باہر نکالے اور بھابھی سے کہنے لگی۔
"میں فریش ہو کر آتی ہوں پھر کباب فرائی کروں گی گرم بھی رہیں گے۔"
"ہاں ہاں آجاؤ! ابھی تو ٹائم ہے۔ میں بھی مہمانوں کے پاس بیٹھنے جارہی ہوں۔ تم بھی آجانا۔"
منزہ پسینے میں شرابور ہوگئی تھی۔ جلدی سے فریش اپ ہونے کمرے میں آئی تو اسد کمرے میں ہی تھے۔ منزہ کو اسد کا موڈ خراب لگا تو پوچھ بیٹھی۔
"کیا ہوا کچھ آفس کی ٹینشن ہے؟" اسد نے منزہ کو بہت غور سے دیکھا۔ اور سائیڈ میں رکھا منزہ کا موبائل اٹھایا اور آپا کی وائس آن کردی۔ وائس میں میسج جو آپا کا میسج آیا تھا کہ بریانی میں مرچیں تیز کردینا۔ پھر منزہ کا میسج ہامی بھرنے کا خود ہی آن ہوگیا۔
منزہ کا تو شرمندگی سے برا حال تھا۔ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے شادی کے ان چار مہینوں میں منزہ نے اسد کی آنکھوں میں محبت اور پیار ہی دیکھا تھا۔ آج ان ہی آنکھوں میں اپنے لیے غصہ

دیکھنا بہت تکلیف دہ تھا۔
منزہ کے لیے تو نظریں اٹھانا بھی مشکل تھا۔ کیا صفائی دیتی۔ سب کچھ عیاں تھا۔
اسد کہنے لگے!"بہت افسوس ہوا منزہ مجھے! میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ میرے گھر کی باتیں تم یوں ڈسکس کرتی ہو۔ تمہیں کوئی مسئلہ تھا تو مجھ سے کہتیں۔"

منزہ کو اپنا آپ مجرم لگ رہا تھا۔ تیر تو کمان سے نکل چکا تھا۔ نکلا ہوا تیر اور بولے گئے الفاظ کبھی بھی واپس نہیں آتے۔ اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ ابھی اسی احساس ندامت میں تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دیکھا تو چھوٹا عزیز تھا کہنے لگا۔

"چاچی! امی کہہ رہی ہیں، جلدی سے آجائیں کھانا لگانے، دادی کہہ رہی ہیں۔"
"میں آرہی ہوں۔" کہہ کر پلٹی تو اسد کہنے لگا۔
"تمہارا موبائل چارج پر لگا ہوا تھا۔ نکالا تو آپا کا میسج آیا ہوا تھا۔ تم کام میں لگی ہوئی تھیں میں یہ سوچ کر کھولا کہ شاید کوئی ضروری بات ہے۔ لیکن ان کی وائس سن کر میں نے اندازہ لگایا کہ تم کچھ پریشان ہو اسی لیے پھر ساری چیٹ سنی کاش! نہ سنتا۔"
کہہ کر اسد تو کمرے سے باہر چلے گئے۔ اور منزہ ان لمحوں کو کوسنے لگی جب محبت میں آکر شروع دنوں میں منزہ نے اسد سے کہا تھا کہ نہ آپ فون میں لاک لگائیں گے میں آپ کا فون چیک کر سکتی ہوں اور آپ میرا۔"
اسد نے اسی وقت اپنے موبائل کا لاک ہٹا دیا تھا۔ منزہ تو کبھی لاک لگاتی ہی نہیں تھی۔
منزہ کا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے کا دل چاہ رہا تھا۔ اپنے محبوب کی نظروں میں گر جانا کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور کچن میں آکر بھابھی کے ساتھ کھانا سرو کرنے لگی۔ بھابھی منزہ کو چھیڑنے لگیں۔

"منزہ! تمہیں دیر ہوئی تو میں نے کباب فرائی کر لیے۔ لگ رہا ہے دیور جی نے روک لیا تھا۔"
بھرم تو رکھنا تھا۔ منزہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر سوچنے لگی کاش! نہ جاتی کمرے میں۔
کھانا سرو ہوا۔ اسد بھی ساتھ ہی بیٹھ گئے کھانا کھانے۔ منزہ اور بھابھی کھانا سرو کر رہی تھیں۔ مہمانوں نے زیادہ روٹی ہی کھائی۔ بریانی ذرا چٹ پٹی بنی تھی۔ مسالہ بھی تیز تھا۔ ساس مہمانوں کو بتانے لگیں کہ چھوٹی دلہن کی بریانی بہت ہلکے مسالے کی ہوتی ہے آج مسالہ تیز ہو گیا ہے۔"
"آج دوسری کمپنی کا بریانی مسالہ ٹرائی کیا ہے شاید اس وجہ سے مرچیں تھوڑی زیادہ ہو گئی ہیں۔"
مہمان تو ہاں میں ہاں ہی ملا رہے تھے کہ اسد منزہ کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔
"ارے امی! آپ بہت سیدھی ہیں۔ اپنی دانست میں اس نے بالکل پرفیکٹ بنائی ہے بریانی کیوں منزہ؟"
منزہ کے جسم میں تو کاٹو تو خون نہیں والا حساب تھا۔ زمین پر گر جانا الگ بات ہے لیکن مجازی خدا کی نظر میں گرنا پوری زندگی ساتھ گزارنی ہے منزہ سوچ کر ہی رہ گئی کہ اپنی صفائی میں کہا ہر جملہ ہی بے کار ہے۔ اسد کبھی بھی اس کی بات کا یقین نہیں کریں گے اسد کی نظروں میں اپنے لیے ہتک اور نفرت کیسے برداشت کروں گی۔
بغیر سوچے سمجھے لڑکیاں سسرال میں بیٹھ کر میکے میں رپورٹیں دیتی ہیں اور پھر میکے والوں کے مشورے! ان بچاروں کا کوئی قصور ہی نہیں، وہ تو بیٹی کی پریشانی دور کرنے کے لیے کچھ تو کہیں گے ناں!
یہ تو بیٹی کی سمجھ داری ہے کہ سسرال کے مسئلے سسرال میں ہی حل کرنے کی کوشش کرے۔

☆☆

باجی سعدیہ

حمیرا شفیع

”سنیئے ذرا!“اس نے بڑے لاڈ سے پکارا۔

”جی سنایئے!“ وہ اخبار میں کھوئے ہوئے ہی بولے۔

”آج کل کتنی ٹھنڈ ہو رہی ہے۔“ لہجے میں کپکپی سی تھی۔

”جنوری چل رہا ہے بیگم! ٹھنڈ تو ہوگی ہی۔“ ان کی نظریں مستقل خبروں پر ہی بھٹک رہی تھیں۔

”ایسی ٹھنڈ میں تو گرما گرم سوپ پینے کو دل چاہتا ہے۔“

”ہاں تو بنالیں نا۔ میں اتوار کو سبزیاں اور چکن لایا تو تھا۔“

”اجی! اب اتنا جھنجٹ کون کرے۔ اگر بنا بنایا مل جائے تو کیا ہی بات ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کسی ریسٹورنٹ وغیرہ میں.....“ اس نے کہہ کر زبان دانتوں تلے دبائی۔

”کیا کہا......؟؟ ریسٹورنٹ چلنا ہے......؟؟“ انہوں نے ترنت اخبار منہ سے ہٹایا۔ اور لاڈلی بیگم پر ایک گھوری ڈالی۔

”ہاں تو اس میں کیا ہرج ہے......اتنے دن سے کہیں نکلنا نہیں ہوا۔ پہلے بچوں کے امتحان چل رہے تھے۔ پھر اسموگ کی وجہ سے گھر میں قید رہے۔ اس بار تو خاندان میں کوئی شادی بھی نہیں ہوئی۔ بچے بھی تنگ آئے ہوئے ہیں۔ اس بہانے تھوڑی آؤٹنگ بھی ہو جائے گی۔“

”نا بابا نا......میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں کہیں نہیں لے جا سکتا میرے آفس میں آڈٹ وغیرہ شروع ہو رہا ہے۔ کل سے لیٹ آؤں گا۔“ انہوں نے ہری جھنڈی دکھا دی۔

”کوئی بات نہیں......ہم آن لائن ٹیکسی منگوا کر چلے جائیں گے۔ بس آپ پیسے دے دیں؟“

”دیکھو بیگم! جب تم یوں میرے پاس فرصت سے بیٹھتی ہو تو میں کھٹک جاتا ہوں کہ ضرور خرچے کی ہی کوئی بات کرو گی۔ پتا بھی ہے کہ کتنی مہنگائی ہو رہی ہے۔ میں تو یہ ہی دے سکتا ہوں اس وقت۔“ انہوں نے جیبیں ٹٹول کر پیسے برآمد کیے۔

اس نے جھٹ تھام لیے۔ اتنے بھی غنیمت تھے۔ باقی اس کے پاس اپنی بھی بچت رکھی تھی۔ مل ملا کر اچھی تفریح ہو جاتی تھی۔

☆☆☆

دوپہر میں وہ بچوں کے کپڑے نکال رہی تھی جب پڑوس میں رہنے والی مجھلی دیورانی چلی آئی۔

”ہائے سعدیہ باجی......!! کیا ہو رہا ہے؟“ وہ گلے لگتے ہوئے بڑی گرم جوشی سے بولی۔

”چاچی......چاچی......آج شام ہم آؤٹنگ پر جا رہے ہیں۔“ بچوں نے اس کی گھوری کی پروا کیے بغیر گرم جوشی سے بتایا وہ بوکھلا سی گئی۔ اف یہ بدتمیز بچے......مجال ہے جو کوئی بات پیٹ میں ٹک جائے۔

”وہ ماہین......ابھی تو پروگرام بنا ہی رہے تھے۔ کوئی پکا تو نہیں ہے۔“

”نہیں باجی! آپ پلیز پکا پروگرام ہی بنایئے اور ہمیں بھی شامل کرلیجیے۔ ہم بھی تفریح کو ترسے ہوئے ہیں۔“ وہ اچھل پڑی۔

”مگر ماہی! تمہارے تو بچوں کے امتحان چل رہے ہیں۔ خوامخواہ ان کی پڑھائی کا ہرج ہوگا۔“

"بس آخری پیپر رہ گیا ہے۔ اس میں بھی چار چھٹیاں ہیں۔ بچے بھی ذرا فریش ہو جائیں گے۔" وہ ان لوگوں سے بھی زیادہ پرجوش تھی۔ ناچار اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

ماہین کے جانے کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد چھوٹی دیورانی ثمرین کا فون آ گیا۔

"ہیلو باجی سعدیہ! آپا بتا رہی تھیں کہ آپ لوگ ٹرپ وغیرہ پر جا رہے ہو۔ میں نے کہا کہ مجھے بھی جانا ہے تو کہنے لگیں کہ تم باجی سعدیہ سے پوچھ لو۔ وہ ہی سب کچھ ارینج کر رہی ہیں۔ قسم سے باجی میں تو گھر میں پڑے پڑے اوب گئی ہوں۔ بچے الگ بیزار ہیں۔ آپ کو پتا بھی ہے کہ آپ کے دیور جی کہیں آنے جانے کے معاملے میں کتنے آلسی ہیں۔ سارا



وقت ٹی وی کے سامنے جم کر بیٹھے رہتے ہیں۔ آپ لوگ ہمیں بھی ساتھ لے جائیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔" اس نے تو اسکول کے زمانے میں یاد کی ہوئی پوری درخواست ہی سنادی۔

لو جی! تو سارا خاندان ہی تیار ہوگیا۔ وہ جل کر رہ گئی۔ مگر ہاں کیے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ دونوں دیورانیاں آپس میں سگی بہنیں تھیں۔ گھڑی گھڑی کی خبر ایک سے دوسری تک پہنچ جاتی تھی۔ اب اگر ایک کو منع کرتی تو دوسری نے بھی روٹھ جانا تھا۔

☆☆☆

مقررہ وقت پر سب اسی کے گھر جمع تھے۔ ٹیکسی منگوائی تو ڈرائیور اتنی سواریاں دیکھ کر بگڑ گیا۔ اتنے لوگ گاڑی میں پورے کیسے آئیں گے۔

"یہ ہمارا مسئلہ ہے۔" ماہین نے پھرتی سے پہلے بڑے بچوں کو اندر سیٹ کیا۔ پھر ان کی گود میں چھوٹے بچوں کو بٹھادیا۔ پھر خود ثمرین کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اسے پیچھے بچوں کے ساتھ مشکل سے چند انچ کی جگہ ملی۔ وہ اپنے صحت مند سے وجود کے ساتھ سکڑی سمٹی سی پھنسی بیٹھی تھی۔

ریسٹورنٹ میں انت کا رش تھا۔ لگتا تھا کہ سارا شہر ہی سوپ پینے آ گیا ہو۔ وہاں جا کر بچے مچل گئے کہ پیزا بھی کھانا ہے۔ انہوں نے بھی سوچا کہ خالی سوپ سے کہاں پیٹ بھرے گا۔ گھر جا کر پھر کھانا بنانا پڑے گا۔ اس لیے پیزا کا بھی آرڈر دے دیا گیا۔ اچھا خاصا بل بن گیا۔ جب ویٹر نے چٹ تھمائی تو اس نے پیسے گنتے ہوئے ماہین کی جانب دیکھا جو اپنے پرس کو کھنگال رہی تھی۔

"لو جی...... میں تو اپنا چھوٹا بٹوہ ہی گھر بھول آئی ہوں۔" اس نے سر اٹھا کر خجالت سے کہا۔

"باجی سعدیہ! ابھی آپ دے دیں۔ میں آپ کو بعد میں دوں گی۔"

اس کا چہرا تاریک ہوگیا۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ "بعد" اب شاید کبھی نہ آئے۔ ثمرین نے البتہ اپنے بیگ سے پانچ سو کا ایک مڑا تڑا سا نوٹ برآمد کر ہی لیا اور کچھ شرمساری سے بولی۔

"میں نے تو سوچا تھا کہ ماہین آپی سے ادھار پکڑ لوں گی۔ آپ کے دیور جی کو تو ابھی تک تنخواہ ہی نہیں ملی۔"

اب بندہ پوچھے کہ اگر میاں کو تنخواہ نہیں ملی تھی تو یوں باجماعت تفریح پر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب وہ جو یہ پانچ سو کا نوٹ پیش کر رہی تھی، وہ تو اس کے حصے کے بل کا ایک تہائی بھی نہیں تھا۔

"تم یہ بھی رہنے دو۔" اس نے پست آواز میں کہا اور بادل نخواستہ سارا بل ادا کر دیا۔

بڑے خراب موڈ کے ساتھ وہ گھر پہنچی۔ ساری بچت ٹھکانے لگ چکی تھی۔ بچے سونے کے لیے لیٹ گئے تو وہ کچن میں آ کر میاں کے لیے کھانا گرم کرنے لگی۔ وہ گھر آئے تو بیگم کو دیکھا جو پھولے منہ کے ساتھ کام کر رہی تھیں۔

"میں نے تو سوچا تھا کہ آج تم لوگ تفریح پر گئے تھے تو موڈ بے حد خوش گوار ہوگا مگر یہاں تو مکھڑے شریف پر بارہ کا گھنٹہ بجا ہوا ہے۔"

ان کے چھیڑنے کی دیر تھی وہ پھٹ پڑی۔ ساری رام کہانی سن کر وہ حق دق سے اسے دیکھتے رہے۔

"سعدیہ! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم اتنی تھڑدلی اور کنجوس ہو وہ دونوں ہماری چھوٹی بہنوں کی طرح ہیں۔ اگر کیا ہوا کہ تمہیں ان کے حصے کا بھی بل بھرنا پڑ گیا۔" وہ تاسف سے سر ہلا رہے تھے۔

"یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا۔" اسے میاں کے انداز پر مزید تپ چڑھی۔

"چھوٹی عید پر جب رس ملائی کھانے گئے تھے تب ان کے پاس پانچ ہزار کا کھلا نہیں تھا۔ اور بقر عید کے تیسرے دن جب گھر پر پاستا آرڈر کیا تھا تو وہ بل میں حصہ ڈالے بغیر غائب ہوگئی تھیں اور گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم سی سائیڈ پر گئے تھے تو تب......"

"بس کر دو......" ان کا ضبط جواب دے گا۔

"چھچھورے پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ تم اپنے

میکے کی کمائی تو انہیں نہیں کھلاتیں۔"
وہ۔خوامخواہ میکے کو بیچ میں لے آئے تو اس کا غصہ سوا نیزے پر پہنچ گیا۔
"میکے کی کمائی نہیں ہوتی مگر میری اپنی بچت تو ہوتی ہے۔" وہ رو دینے کو تھی۔
"وہ بچت بھی تو تم میرے دیے گئے روپوں سے ہی کرتی ہو۔"
"کتنی محنت سے کرتی ہوں یہ بھی پتا ہے آپ کو۔ چند روپے بچانے کی خاطر کھینچ تان کر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ ایویں نہیں ہو جاتی بچت۔ اب بھی اتنے دن سے گھر میں اچھا کھانا نہیں بنا رہی تھی۔"
بحث بڑھ گئی جو شدت کی لڑائی پر ختم ہوئی۔ وہ تن فن کرتے ہوئے تکیہ اٹھا کر گیسٹ روم میں چلے گئے۔ اور وہ بیڈ روم میں اکیلی روتی رہ گئی۔ ایک اچھے دن کا اختتام بہت برا ہوا۔

☆☆☆

رات سوئی جاگی کیفیت میں گزری تھی اس لیے صبح دن چڑھے آنکھ کھلی گیسٹ روم میں جھانکا تو خالی پڑا تھا۔ صاحب جی بغیر ناشتہ کیے دفتر روانہ ہو چکے تھے۔ جی اور مندا ہوا۔ اس نے سست قدموں سے کچن کا رخ کیا۔ بچے ابھی سو رہے تھے۔ اس نے اپنے لیے چائے کا کپ بنایا اور دوبارہ بیڈ روم چلی آئی۔ اتنے میں سائیڈ ٹیبل پر دھرا موبائل بجنے لگا۔ اماں کی کال آ رہی تھی۔
"ہیلو سعدیہ! کل تم لوگ شاید سیر سپاٹے پر نکلے تھے۔ تمہارے گڈو نے اسٹیٹس لگا رکھا تھا۔ اگر شام میں فارغ ہو تو چکر لگانا ریحان کے لیے لڑکی دیکھنے جانا ہے۔"
"جی اماں!" وہ چاہ کر بھی آواز کی لرزش پر قابو نہ پا سکی۔
"کیا ہوا ہے......؟ سعدیہ! سب ٹھیک تو ہے۔" وہ اس کے سنتے ہوئے لہجے سے ٹھٹک گئیں۔
پھر کیا تھا سعدیہ نے روتے دھوتے سارا قصہ کہہ سنایا۔ اب بندہ ماں کے سامنے ہی کھل کر دل کی بھڑاس نکال سکتا ہے۔
"اف سعدیہ!" اماں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "اتنے سال ہو گئے ہیں تمہاری شادی کو مگر تمہیں ابھی تک اپنے گھریلو مسئلوں سے نمٹنا نہ آیا۔ یہ کوئی بات ہے بھلا جس کو لے کر یوں حواس باختہ ہو رہی ہو دیورانیوں جٹھانیوں میں اس طرح کی اونچ نیچ تو ہوتی رہتی ہے۔ اگر وہ لالچی فطرت کی ہیں تو تم اپنا دل بڑا کر لو۔ اللہ تعالیٰ کو ویسے بھی دینے والا ہاتھ پسند ہے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے اماں...... مگر وہ تو ہر بار ہی مفت تفریح کے چکر میں رہتی ہیں۔ میں تو جوڑ توڑ کر کے بچت کرتی رہتی ہوں مگر وہ سارا مہینہ خوب کھلا خرچ کرتی ہیں اور پھر آخر میں خالی ہاتھ بیٹھی ہوتی ہیں۔"
"مگر یوں میاں سے الجھ کر گھر کا ماحول خراب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"
پھر انہوں نے ماؤں والی صبر شکر کی ڈھیر ساری نصیحتیں کر کے فون بند کر دیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ریحان کھڑا تھا۔
"اماں! لگتا ہے کہ آپا کے ہاں پھر کوئی مسئلہ ہوا ہے......" وہ تشویش سے بولا۔
وہ گہری سانس بھر کر اسے ساری بات بتانے لگیں جسے سن کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

نیا سال شروع ہو چکا تھا۔ بچے سارا دن ہیپی نیو ایئر...... ہیپی نیو ایئر گاتے اس نے گھر پر ہی ایک بڑا سا کیک بیک کر کے کاٹ دیا۔ پھر چھوٹے کی سالگرہ آئی تو وہ بھی گھر پر ہی ارینج کی گئی۔ سردی بھی زوروں پر تھی۔ بچے بھی نئی کلاس میں آ چکے تھے۔ ویک اینڈ پر وہ بچوں کو فرصت سے ہوم ورک کروا رہی تھی۔ جب گڈو نے اپنی اردو کی کاپی نکالی۔ اسے چڑیا گھر کی سیر پر مضمون یاد کرنا تھا۔ وہ خوب اونچا اونچا یاد کر رہا تھا جب چھوٹے والا بولا۔
"اماں! ہم بھی کہیں سیر پر چلیں۔"

"خاموش ہو جاؤ" اس نے بچے کو بری طرح سے جھڑک دیا۔

رات کو وہ جب دونوں کو سلا رہی تھی تو گڈو بولا۔ "اماں! آپ چاچی لوگوں کی وجہ سے منع کر رہی تھیں نا تو میں نے ایک ترکیب سوچی ہے۔ ہم پہلے نانو کے گھر جائیں گے اور پھر وہیں سے آؤٹنگ پر چلے جائیں گے۔ اس طرح چاچی والوں کو پتا بھی نہیں چلے گا۔"

بچے کی باتیں سن کر اس کا دل ڈوب گیا۔ ہائے یہ گھریلو سیاست...... کیسے بچوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں چھین لیتی ہیں۔ اس وقت تو وہ خاموش رہی مگر بعد میں سوچا تو بچے کی ترکیب عمدہ لگی۔ اماں کے گھر سے تفریح پر جانا زیادہ سودمند ہوگا۔ اضافی خرچا بھی نہیں کرنا پڑے گا اور کوئی بدمزگی بھی نہیں ہوگی۔

☆☆☆

آج ریحان اس کے ہاں آیا ہوا تھا اور وہ سب مل کر خفیہ ٹرپ کی پلاننگ کر رہے تھے۔

"اس بار تو میں نے ان دونوں کو پروگرام میں شامل ہی نہیں کرنا۔

باجی سعدیہ...... باجی سعدیہ کر کے لوٹ لیتی ہیں۔ میں نے کئی بار کہا بھی ہے کہ رشتے کے اعتبار سے تو میں تم لوگوں کی جیٹھانی ہوں تو بھابھی بولو نا تو کہنے لگی کہ لفظ "بھابھی" سے تو وہ اپنائیت نہیں جھلکتی جو لفظ "باجی" سے محسوس ہوتی ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"ہنہ...... باجی...... اگر میری سگی بہنیں ہوں تو میں سارا اگلا پچھلا ادھار مانگ لوں۔" اماں کی نسبت چھوٹے بھائی کے سامنے اندر کی کھولن نکالنا آسان لگتا تھا۔ وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ جب وہ اچھی طرح سے اپنا کتھارسس کر چکی تو بولا۔

"اچھا چھوڑیں آپی...... آپ لوگ یہ تو بتائیں کہ جانا کہاں ہے......؟"

"ماموں!" "کہکشاں" میں چلیں۔

"نہیں وہاں تو کئی بار گئے ہیں۔ اس بار "پیزا ہٹ" چلتے ہیں۔"

"مگر وہ تو بہت دور ہے......"

ابھی یہ سب چل رہا تھا کہ اچانک ماہین ہاتھ میں کڑھی چاول سے بھرا باؤل تھامے چلی آئی۔ وہ سب ایک دم خاموش ہو گئے۔

"اوہو...... ریحان آیا ہوا ہے۔ کیوں بھئی ریحان...... تمہاری کہیں بات وات طے ہوئی پھر؟"

وہ ریحان کو دیکھ کر شرارت سے بولی۔

"نہیں آپا...... ابھی کہاں......" وہ مصنوعی مایوسی سے منہ بنا کر کہنے لگا۔

"اچھا...... میں سمجھی، تم لوگ ایسا ہی کچھ ڈسکس کر رہے تھے۔" وہ معنی خیزی سے بولی۔

"نہیں آپی...... فی الحال تو ہم گھومنے جانے کا پروگرام ڈسکس کر رہے تھے۔" اس نے اتنی تیزی سے کہا کہ وہ سب بھونچکا رہ گئے۔

وہ بے یقینی اور صدمے سے اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ کم از کم اس سے تو اس بے وقوفی کی توقع نہیں تھی۔ "ہیں کیا کہا......؟ گھومنے......؟ کیا واقعی......؟" وہ اچھل پڑی اور پھر اس کے سامنے صوفے پر ٹک گئیں۔

"مگر ایک مسئلہ ہے ماہین آپی!" وہ بہن کے تاریک چہرے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "یہ سب پیزا ہٹ جانا چاہ رہے ہیں۔ آپ کو پتا ہے کہ شہر کا سب سے مشہور ریسٹورنٹ ہے۔ وہاں ٹیبل ملنی بہت مشکل ہوتی ہے۔ آج کل تو پھر بہت رش ہے۔" "ہائے اللہ! مجھے بھی پیزا ہٹ" کا پیزا کھانے کا بہت شوق ہے۔" وہ اشتیاق سے بولی۔ سعدیہ اندر ہی اندر جل بھن رہی تھیں۔

"وہاں کا ایک شیف میرا کلاس فیلو ہے۔ اس سے بات ہوئی تھی میری۔ اس نے بتایا ہے کہ آج کل تو وہاں ایڈوانس ادائیگی کر کے پیشگی بکنگ بھی ہو رہی ہے۔ اس طرح اپنی مرضی کی جگہ پر ٹیبل حاصل کی جاسکتی ہے۔"

"ماموں! ہم سی سائیڈ والی سائیڈ کی ونڈو کے سامنے والی ٹیبل لیں گے۔"

"ہاں تو ماموں کی جان! اس کے چارجز بھی تھوڑے زیادہ ہیں۔"

پھر اس نے اپنا موبائل کھول کر کچھ کیلکولیٹ کر کے حساب لگایا۔ چند منٹ تک حساب کتاب کرتا رہا۔ پھر سر اٹھا کر کہنے لگا۔

"ریسٹورنٹ بھی چونکہ دور ہے تو ٹیکسی کا کرایہ وغیرہ ڈال کر ہر فیملی کے حصے میں اتنی رقم آئے گی......" "اگر آپ لوگ واقعی جانا چاہ رہے ہیں۔" اس نے سعدیہ اور ماہین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تو پھر مجھے ابھی پیسے دے دیں۔ میں رقم ادا کر کے ایڈوانس بکنگ کی رسید لے آتا ہوں۔ مجھے ویسے بھی وہاں کسی کام سے جانا ہے۔"

وہ دونوں خاموش رہیں تو معذرت خواہ لہجے میں کہنے لگا۔

"سوری سسٹرز! میں غریب بندہ ہوں۔ ادھار افورڈ نہیں کر سکتا۔ آپ لوگوں کو رقم کی ادائیگی فوری کرنی ہوگی۔"

"اچھا! میں گھر جا کر بنٹی کے ہاتھ بھجواتی ہوں۔" ماہین کچھ پست انداز میں بولی۔ پہلے والا جوش و خروش مدھم ہو چکا تھا۔

"کوئی بات نہیں ماہین آپی! آپ ذرا آرام سے بھیج دیں۔ فی الحال تو میں آپ کے ان کڑھی چاول سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔" اس نے پاس پڑا باؤل اٹھایا۔

☆☆☆

شام کو وہ سب شاداں و فرحاں گھومنے جا رہے تھے۔ ماہین نے تو گھر جا کر ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد پیغام بھیج دیا تھا کہ وہ نہیں جاسکتی کیونکہ اس کی طبیعت اچانک ناساز ہو گئی تھی۔ اب پتا نہیں واقعی ناساز ہو گئی تھی یا نقد ادائیگی کا سن کر ناساز ہو گئی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو ہر وقت مفت تفریح کے مواقع ڈھونڈتے ہیں۔ البتہ ثمرین نے فوراً ادائیگی کر کے ان کو جوائن کر لیا تھا۔

ریسٹورنٹ میں گرما گرم پیزا کھاتے ہوئے وہ بڑے پیار سے اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ماشاء اللہ سے ابھی شادی بھی نہیں ہوئی مگر خانگی معاملات میں کتنا سمجھ دار اور معاملہ فہم ہے اللہ نظر بد سے بچائے۔ اس نے دعا پڑھ کر پھونکی اور پھر دوبارہ اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

☆☆

حنا بشریٰ

زبان دراز

شانو کا اس کے شوہر ساجد سے شدید جھگڑا ہوا تھا۔ مار پیٹ کے بعد شوہر نے نا صرف اسے گھر سے نکال دیا تھا بلکہ بات طلاق تک آن پہنچی تھی۔

سفید کرتے پہ کڑھائی کے پھول کاڑھتی شہتوت کے درخت کے نیچے بیٹھی، آمنہ کے کانوں نے یہ خبر سنی جس کو سن کر آمنہ کو حیرت سے زیادہ دکھ ہوا تھا حیرت اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ کچھ معاملات اور باتوں کا انسان کو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا نتیجہ خرابی کی شکل میں ہی نکلے گا۔ اور شانو کی ساری کی ساری خرابی اس کی زبان میں تھی۔

☆☆☆

شانو زبان دراز تھی اور تھوڑی بہت نہیں۔ بلکہ پیٹ بھر کر...... ایک کی دس سنانا...... اور اس میں کسی چھوٹے بڑے کو بخشنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

اس کی زبان گاؤں کی درزن زبیدہ کی قینچی سے بھی زیادہ تیز چلتی تھی۔ یہ کہنا پورے گاؤں کا تھا۔ ایک دفعہ جو چلتی تو پھر رکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ شانو نے زبان کو منہ کے اندر رکھنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ یا پھر گھر والوں کے لاڈ پیار نے اسے بگاڑ ہی اتنا دیا تھا کہ اب اس سے زبان کو روکا ہی نہیں جاتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس سے بڑے تین بھائی اور ایک بہن بھی تھی۔ وہ سب سے چھوٹی تھی۔ اور لاڈ پیار نے دماغ ایسا ہواؤں میں اڑایا تھا کہ زبان خود بخود گز بھر کی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''اتنی سی عمر میں ایسی گز بھر زبان......!'' یہ کہنا امام مسجد کی بیوی کا تھا۔ جن کے پاس شانو کو قرآن پڑھنے کے لیے بھیجا گیا تو ہفتہ دس دن بعد ہی انہوں نے قرآن پڑھانے سے معذرت کر لی تھی۔

''چھتر کھاوے گی تو سسرال وچ!'' گاؤں کی مائی تنوری کو بھی شانو سے بہت چڑ تھی۔ جب بھی شانو ان کے تنور پہ جاتی تو وہاں کھڑے لوگوں کو ناکوں چنے چبواتی تھی کہ کوئی سر جھٹکتے ہوئے تو کوئی ہاتھ جھٹکتے اس کے لیے جگہ خالی کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

''اس مصیبت نوں پہلے فارغ کراماں!''

شانو روٹیاں سب سے پہلے لگوانے کے لیے ایسی کالی (جلدی) ڈالتی تھی کہ مائی تنوری سمیت ہر کوئی عاجز آ جاتا تھا۔

''شانو، ایویں ہر ویلے کھپ نہ پائی رکھا کر!''

امرود کے کھیتوں میں کام کرتا مالی، کنویں پہ پانی بھرتی عورتیں اور لڑکیاں۔ شانو کی لمبی زبان کی وجہ سے ہر کسی کی بھنویں تن جاتی تھیں۔ ہر چہرے پر ہر آنکھ میں شانو کے لیے ناگواری ہوتی تھی۔ جبکہ شانو کی جوتی کو بھی کسی کی ناگواری کی نہ پروا تھی اور نہ ہی کسی کی نفرت کی...... بلکہ اسے تو اپنی زبان درازی پہ فخر سا تھا کہ اس جیسا کوئی اور نہیں ہے۔

☆☆☆

آمنہ اور شانو بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ دونوں قرآن پاک پڑھنے ساتھ جاتی تھیں۔ شانو کی خواہش پر آمنہ اس کی بھابھی بن کر ان کے گھر آ گئی تھی۔ خیال تو سب کا یہی تھا کہ دونوں کی دوستی کا رشتہ اور مضبوط ہو جائے گا۔ لیکن اس کے برعکس



ہوا۔ رشتہ بدلتے ہی جیسے شانو کا دل و دماغ بھی بدل گیا تھا۔ اب وہ روایتی نند بننے سے خود کو روک نہ پائی تھی۔

اب شانو زبان کی تیزی دکھاتے ہوئے آمنہ سے ہر معمولی سی بات پہ الجھنے لگی تھی۔

"بوتی (بہت) سیانی نہ بن۔"

دھیمے مزاج کی آمنہ اسے شروع سے ہی غلط صحیح بات کا فرق سمجھاتی رہتی تھی۔ مگر اب نند کو بھابھی کا ٹوکنا زہر لگنے لگا تھا۔ چولہے پہ رکھی ہانڈی کا ڈھکن کھلا رکھنے کی وجہ سے بلی اس میں منہ مار گئی تھی۔ اس لاپروائی پہ آمنہ نے توجہ دلائی تو شانو تو ہتھے سے ہی اکھڑ گئی تھی۔ پہلے غصے میں چھوٹی ہانڈی اٹھا کر صحن کے بیچوں بیچ پھوڑی اور پھر وہ لمبی زبان چلائی کہ اردگرد کے گھروں کی عورتیں تماشا دیکھنے چھتوں اور دیواروں پہ آن پہنچی تھیں۔

"وڈی آئی سیانی ویکھو!"

غلطی سراسر شانو کی تھی۔ مگر اس نے غلطی کو ماننا ہی کب تھا۔ وہ تو ڈھیٹ تھی ازل سے......

اس پہلے جھگڑے کے بعد شانو کا معمول ہی بن گیا تھا۔ روز کسی بات پہ ہنگامہ کرنا...... چھوٹی چھوٹی بات پہ زبان لڑانا، ہر بات پر آمنہ سے اختلاف کرنا اور کبھی آمنہ شدید ردعمل دکھاتی تو اس کا نتیجہ یہ نکلنے لگا تھا کہ شانو زبان کی تیزی خوب دکھا کر باقی کسر بھائی کو ساتھ ملا کر پوری کر لیتی تھی۔ بھائی کو جھوٹی سچی بات بتا کر آمنہ کی خوب درگت بنوائی۔

"ہن لے میرے نال اگلی واری پنگا!"

زیادتی کے بعد یہ شانو کی ڈھٹائی ہوتی تھی۔

شانو کی بدزبانی اس کی مخلص سہیلی کا دل کھانے لگی تھی۔ اس کی بدتمیزی و بدمزاجی کی وجہ سے آمنہ کی آنکھیں اکثر نم رہنے لگی تھیں۔ مگر شانو واس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اسے یہ سب کر کے دلی سکون ملنے لگا تھا۔

☆☆☆

غلط عادات کو ابتداء میں ہی روک ٹوک کی ضرورت ہوتی ہے۔

شانو بچپن سے ہی بدزبان تھی۔ اس کی ایک وجہ ماں کا سایہ سر سے اٹھ جانا تھا ماں اگر ہوتی تو شانو کی بدزبانی کا یہ عالم نہ ہوتا۔ شانو تو کسی جنگلی بوٹی کی طرح خود بخود بڑھ گئی تھی۔ اب یہ بوٹی خاردار اور زہریلی بھی ہو — گئی تھی۔

درزن نے اس کی قمیص میں معمولی سی کسر چھوڑ دی تھی۔ بس اسی بات پہ شانو اس کے گھر لڑنے چلی گئی تھی۔

"او توانی (اندھی) سی!" درزن عمر میں شانو کی ماں کے برابر تھی مگر شانو کی زبان کہاں دیکھتی تھی کسی بڑے چھوٹے کو...... اپنی غلطی کو مانتے ہوئے درزن نے نرمی دکھاتے ہوئے قمیص ٹھیک کر دینے کو کہا۔ مگر جب شانو زیادہ ہی آپے سے باہر ہوئی تو درزن بھی اکڑ گئی۔

"شانو تینوں تمیز نئی کسی چھوٹے وڈے دی!"

درزن نے یہ کہہ کر خود اپنی شامت کو آواز دے دی تھی۔ شانو نے جنونی انداز میں نا صرف اپنی غلط سلی ہوئی قمیص کو لیر و لیر کیا بلکہ اور بھی سلے ہوئے کپڑے جو گاؤں کی دوسری عورتوں کے تھے وہ بھی قینچی سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے۔

"وڈی آئی مینوں تمیز سکھان والی۔"

شانو کی اس حرکت پہ درزن کو سخت غصہ آیا۔ درزن کی شکایت پہ سارا نقصان آمنہ کو پورا کرنا پڑ گیا تھا۔

آمنہ کو شانو کی دماغی حالت پہ شک ہونے لگا تھا۔ آمنہ بھی اسی درزن سے کپڑے سلواتی تھی تھوڑی بہت کمی بیشی رہ جاتی تھی مگر آمنہ نے کبھی ایسا تماشا نہیں لگایا تھا۔

"غصے کا اظہار کرنے کے بھی ہزار طریقے ہوتے ہیں جو لحاظ کے دائرے میں رہ کر کیے جا سکتے ہیں۔"

آمنہ کے بس کہنے کی دیر تھی شانو نے وہ چیخ و پکار مچائی کہ آمنہ دنگ رہ گئی تھی۔

برتن اٹھا کر دیوار پہ مارے۔ صراحیاں اور مٹکے توڑ ڈالے۔ آمنہ کی کشیدہ کاری کی چیزیں، دھاگے اور فریم پہ چڑھا دوپٹہ تک پھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ پھر بھی سکون نہ ملا تو بھائی کے آنے پہ باقی کی کسر نکالی تھی۔

"آئندہ شانو نال کوئی زیادتی کیتی تو تیرے لیے چنگا نئیں ہووے گا۔"

بجائے یہ کہ بھائی شانو کو سمجھاتا اس نے الٹا بیوی کو ہی دھمکی دے دی تھی جیسے آمنہ اور درزن نے شانو کے ساتھ کوئی زیادتی کر دی تھی۔

"دفع کرائیوں!" شانو کے اس طوفان کی خبر اڑتی ہوئی جہاں گاؤں کی دوسری عورتوں تک پہنچی تھی مائی تنوری تک بھی پہنچی تھی ناک بھوں چڑھاتے ہوئے مائی کا انداز ایسا تھا کہ شانو کو اس کے حال پہ چھوڑ دیا جائے۔

اسے آمنہ بھلا کہاں سمجھا سکتی تھی آمنہ نے بھی اسے حال پہ چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

شانو کی شادی اس کے پھپھو کے بیٹے ساجد سے طے ہو گئی تھی۔ ساجد مزاج کا سخت تھا اور غصے کا بھی تیز۔ آمنہ کے دل میں ساجد کے حوالے سے کئی خدشات تھے۔

"تینوں کس لیے پیٹ وچ پیڑ اٹھ رہی ہے۔"

آمنہ نے یہ اظہار شوہر کے سامنے کیا تھا جس کی خبر شانو تک بھی پہنچ گئی تھی۔

"میرے معاملے وچ تو ٹانگ نہ اڑا......!"

شانو کا کرارا جواب اس بات کا عکاس تھا کہ اسے سہیلی کے مخلصانہ مشورے کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ اس نے آمنہ کے خلوص کو بہن بھائیوں کی سامنے یہ رنگ دے کر پیش کیا تھا کہ جیسے اس کی سہیلی اس کی خوشی سے جل رہی تھی۔

"سڑن دا علاج کوئی نئیں آمنہ!" شانو کا رویہ اب برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا آمنہ نے اس کے معاملے میں مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی۔ ویسے بھی گاؤں کی بہت سی عورتوں کے مطابق شانو سسرال میں ساس اور شوہر سے چھتر کھائے گی۔

☆☆☆

شانو کی رخصتی کا دن آن پہنچا تھا۔ دلہن بنی شانو اس موقع پہ بھی چپ نہ تھی۔ زبان چٹر چٹر چل رہی تھی۔ کبھی کسی عورت سے بحث تو کبھی کسی بچے کی شامت۔

"وے ہاتھ نہ لائیں کسی وی چیز نوں!" شانو کے جہیز کے سامان کو بچے بڑے ذوق وشوق سے دیکھ رہے تھے......اور کوئی کسی نہ کسی چیز کو ہاتھ بھی لگا دیتا تھا۔ دلہن بنی شانو کو بھی ایک پل کے لیے چین نہ تھا۔ ایک بچے کو کھینچ کر جوتی دے ماری۔ بلکہ اس انداز میں دھاڑی کہ وہاں موجود ساری عورتیں دلہن کے یہ چھن دیکھ کر انگلیاں دانتوں میں دبا کر رہ گئی تھیں۔

"اماں جی تسی تے اک طرف ہو کے بیٹھو!"

ایک بزرگ خاتون شانو کی جہیز، بری کی چیزیں بڑی دلچسپی سے دیکھنے میں مشغول نظر آئیں تو شانو کو ان کی یہ حرکت بھی زہر لگی تھی۔ شانو کے مطابق بڑی بوڑھیاں اس کی چیزوں کو نظر لگا رہی تھیں۔ اور یہی نظر آگے چل کر اس کی خوشیوں کو نہ کھا جائے۔ جبکہ سیانوں کا کہنا تھا کہ شانو کی خوشیوں کو خطرہ نظر سے زیادہ اس کی اپنی زبان سے تھا۔

کیونکہ ایک مہمان بچے کو جس طرح دبوچ کر اس نے تھپڑوں سے منہ لال کیا تھا، یہ منظر ہر آنکھ نے دیکھا تھا۔ جس میں شانو کی ساس اور نندیں بھی شامل تھیں۔

اس بچے کا ناقابل معافی گناہ یہ تھا کہ اس نے نئی نویلی دلہن شانو کے جہیز کے سلور کے نئے نکور گلاس میں پانی پی لیا تھا۔

"اللہ کرے تیرے ٹڈ (پیٹ) وچ مروڑ اٹھے۔ الٹیاں کر کر تھکے تو!" نئی نویلی دلہن کے تیور اور انداز جو دیکھ رہا تھا وہ کانوں میں کھسر پھسر کرنے لگ گیا تھا۔

"زیادہ دن وسانئی شانو نے۔"

ایک سرگوشی آمنہ کے کان نے بھی سنی تھی۔ جس

کو سن کر اس کا دل بیٹھ گیا تھا۔ آمنہ کے دل میں شانو کی زندگی کے حوالے سے جو خدشات تھے۔ وہ آنے والے دنوں میں سامنے آ گئے تھے۔

☆☆☆

شانو کا شادی کے صرف دو ہفتوں بعد ہی ساس، نندوں سے زور دار معرکہ ہوا تھا۔ دونوں طرف سے زبان کا استعمال پوری طاقت کے ساتھ کیا گیا تھا۔ شانو نے تو کبھی ہار نہیں مانی تھی۔ سو اب بھی وہ لڑلڑا کر اس شرط پہ میکے آ گئی تھی کہ اس کی نندیں اور ساس معافی مانگیں۔

''شانو، تجھے کچھ تو اپنی زبان پہ قابو رکھنا چاہیے۔''

شانو سسرال والوں کے مظالم کا قصہ بہن بھائیوں کو بڑے فخر سے بتا رہی تھی۔ آمنہ کو ایک نئی نویلی دلہن کے طور طریقے بالکل مناسب نہ لگے تھے۔ آمنہ کے مطابق غلطی شانو کی تھی۔

''کوئی میرے منہ متھے لگے۔ میں کراں گی کدی برداشت!'' اپنی غلطیوں پہ غور کرنے کے بجائے شانو کی اکڑ کا یہ عالم تھا کہ کوئی اس کے منہ تو لگے ذرا۔ منہ توڑ کے ہاتھ میں نہ پکڑا دیا۔ تو میرا نام شانو نہیں۔

''مگر شانو سسرال والے یہ طور طریقے، اکڑ اور بدزبانی نہیں برداشت کرتے!'' آمنہ کو شانو کی مستقبل کی تصویر اس کی بدزبانی کی وجہ سے بگڑی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔

شانو سسرال میں صرف اپنا اور اپنے شوہر کے کام کرتی تھی۔ بوڑھی ساس، سسر کی خدمت اور نندوں کا ہاتھ بٹانا وہ حرام سمجھتی تھی۔ ساس اور نندوں نے اعتراض کیا تو شانو کی زبان پھٹے جوتے کی طرح کھل گئی تھی۔

''تا میرے آنے سے پہلے اے سارے کم (کام) کون کرداسی؟'' دونوں ہاتھوں کو کمر پر رکھے شانو لڑاکا طیارہ بنی نظر آئی تھی۔

شانو کے مطابق جب بہو کے آنے سے پہلے گھر کے کام ساس اور نندیں کرتی تھیں تو اب بہو کے آنے پہ کیا موت پڑ گئی تھی۔ کہ ہر کام میں بہو کی مدد درکار تھی۔

''میرے آنے سے پہلے تم ساریوں کے ہاتھ پیر سلامت تھے اور اب لولی لنگڑی ہو گئی ہو!'' شانو نے خوب بدلحاظی کا مظاہرہ کیا تھا۔ خوب طوفان مچا کر وہ میکے آ گئی تھی اور اب اپنے کارنامے بہن بھائیوں کو بتا رہی تھی۔

بڑا بھائی اور بہن تو شانو کی حمایت کر رہے تھے مگر باقی دونوں بھائیوں کی بیویوں کے چہروں کے زاویے بگڑنے لگے تھے۔ اور رہ گئی آمنہ تو وہ بھابھی کم ...... آج بھی اس کی سہیلی زیادہ تھی۔ اس کا بھلا ہی چاہتی تھی۔

''شانو، خود کو تھوڑا تو بدل لے!'' آمنہ نے ایک بار پھر سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اپنی نصیحتیں اپنے پاس ہی رکھ تو...... ان لوگوں کے رعب میں آتی ہے میری جوتی!'' شانو جیسی بد دماغ لڑکی نے مخلص سہیلی کی نصیحتوں کو اٹھا کر جیسے دیوار پہ دے مارا تھا۔

لیکن اگلے کچھ ماہ میں شانو کی سوچ، اس کی بد مزاجی و بدزبانی کو سسرال والوں نے شانو سمیت دیوار پہ دے مارا تھا۔

☆☆☆

شانو کی لمبی زبان کی وجہ سے اس کا شوہر سے اچھا خاصا جھگڑا ہوا تھا۔ اس بار شوہر نے برداشت کرنے کے بجائے شانو کی خوب درگت بنائی تھی۔ ہاتھ بھی اٹھایا تھا۔ اس شدید جھگڑے کی وجہ یہ تھی کہ ساجد کی بہن کو دیکھنے کچھ لوگ آئے تھے۔ بہتر تو یہی تھا کہ شانو اچھی بہو کی طرح گھر کے کام کاج میں حصہ لیتی اور مہمانوں کے ساتھ اچھی طرح پیش آتی۔ اس نے ایسا کچھ نہ کیا۔ بلکہ مہمانوں کو سلام کر کے وہ اپنے کمرے میں جا بیٹھی تھی۔

''میں بھلا نوکرانی لگی ہوں ان کی!'' وہ اپنی ضد پہ قائم تھی کہ اسے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانا تھا۔ اور

جب اس کی خبر ساجد تک پہنچی تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ شانو نے اپنی غلطی ماننے کے بجائے شوہر کے ساتھ خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا اور خوب زبان چلائی۔

عورت کی زبان چلنے لگے تو مرد کا ہاتھ بھی اٹھ ہی جاتا ہے۔

سسرال والوں نے شانو کے میکے بھی پیغام پہنچا دیا تھا کہ۔ ''اس کو زبان منہ میں رکھنا سکھاؤ۔ ورنہ نواب زادی کو ہمیشہ کے لیے اپنے پاس ہی رکھ لو!''

مگر شانو پہ کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ اس نے میکے آ کر سسرال والوں کے خلاف خوب زہر اگلا تھا ان کو ظالم اور خود کو مظلوم ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ خواہش تو شانو کی یہ بھی تھی کہ اس کے تین بھرو جوان بھائی ڈنڈے بیلچے لے کر، اس کے سسرال جائیں اور ان کا دماغ ٹھکانے لگا کر آئیں۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا تھا۔

چند روز تک تو سب نے اس کی باتیں سنیں مگر اب سب بیزار لگے تھے۔ یہ شانو کے لیے حیران کن تھا۔ اپنی عادت کے مطابق اب شانو میکے میں بھابھیوں سے بھی الجھنے لگی تھی۔ آمنہ تو پھر سہیلی ہونے کے ناتے سہہ لیا کرتی تھی۔ مگر باقی دونوں بھابھیاں منہ توڑ جواب دینے لگی تھیں۔

''شانو، ساڈھے کار (گھر) دا سکون تے برباد نہ کر......!''

پہلے پہل تو یہ بھابھیوں کا کہنا تھا مگر اب بھائیوں کی بھی یہی سوچ سامنے آنے لگی تھی۔

''ویسنی اپنا تے کار (گھر) اجاڑ رہی ہے۔ تے ہن ساڈھے کار (گھر) نوں وی اجاڑنے پہ تلی ہے فسادن!''

بھائی بھابیوں کی یہ سوچ اور ساتھ ہی یہ خبر کہ ساجد کی ماں بیٹے پہ زور دے رہی تھی کہ شانو کو طلاق دے۔ ساجد کی ماں نے تو بیٹے کے لیے لڑکی بھی ڈھونڈنی شروع کر دی تھی۔ شانو کے دل پہ یہ صدمات اکٹھے حملہ آور ہوئے تو شانو کی زبان کو خود بخود چپ لگ گئی تھی۔ وہ شانو جس کی زبان ایک پل کے لیے بھی نہیں رکتی تھی۔ وہ اب کئی کئی گھنٹوں یوں خاموش بیٹھی رہتی کہ جیسے گونگی ہو گئی ہو۔

☆☆☆

آمنہ کڑھائی کے دھاگے سلجھا رہی تھی۔ بچوں کی چھیڑ چھاڑ نے لمبے لمبے دھاگوں کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ شانو چپ چاپ اس کے پاس بیٹھی غائب دماغی سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ آمنہ ہر رنگ کا دھاگہ سلجھا کر اس کا گولہ بنا کر ترتیب سے ڈبے میں رکھتی جا رہی تھی۔ تاکہ کڑھائی کے دوران دھاگوں کو پہلے سلجھانے کی دشواری سے بچ سکے۔ آخری دھاگے کا گولہ لپیٹتے ہوئے، اس کی نظر شانو پہ پڑی تو سہیلی کا اداس چہرہ دیکھ کر آمنہ کا دل عجیب سا ہوا تھا۔ آمنہ کے چہرے پہ کسی گہری سوچ کا رنگ نظر آنے لگا۔

''لمبا دھاگا اور لمبی زبان مسائل پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے دھاگا لپیٹ کر رکھا جائے اور زبان کو سمیٹ کر رکھا جائے تو مسائل و پریشانی سے بچا جا سکتا ہے شانو!''

سہیلی کی دلی کیفیات کو سامنے رکھتے ہوئے آمنہ نے ایک بار پھر مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔ تو اس نے چونک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا جیسے بات کی گہرائی پہ غور کر رہی ہو۔

شانو کی نم آنکھیں اور شرمندگی کا عکاس چہرہ بتا رہا تھا کہ دل نے اسے بہت سی کوتاہیوں کا احساس دلایا تھا۔ جو اس کی بدزبانی کا نتیجہ تھیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے پشیمان سی شانو نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ سرعت سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اور تشکر آمیز نظروں کا رخ آمنہ کی طرف کیا تھا۔ آنکھوں کی نمی کو ہاتھ کی ہتھیلی سے پونچھتے ہوئے دھیرے سے مسکراتے ہوئے اپنی مخلص سہیلی کی طرف دیکھا۔ جس کی بات نے نا صرف اس کے دل کو پھیر دیا تھا۔ بلکہ دوستی کا حق بھی ادا کر دیا تھا۔ وہ سہیلی جس کو شانو نے اپنی بدزبانی کی وجہ سے خود سے دور کر دیا تھا۔ شانو کو اب جلد از جلد اپنے گھر جانا تھا۔ ذرا سی دیر عمر بھر کا پچھتاوا بن سکتی تھی۔

☆☆

آسیہ رئیس خان

ایک رین سجا کر رکھی ہے

الماس پروین نے کمرے میں سب کو بلایا تھا اور ان کے کمرے سے باہر نکلتے ہی گھر میں یوں ہلچل مچی، مانو اندر سے سب عید کے چاند کا دیدار کر آئے ہوں۔

اگلا دن عید کا بھی ہو تو اپنی زندگی کے شب و روز ایک سے ہونے کا یقین اس قدر پختہ تھا کہ تجسس جیسا جذبہ اس کے لیے اجنبی تھا لیکن ہر انسانی زندگی کی طرح چند ایک 'پہلی بار' تو اس کی زندگی میں بھی تھے۔

''کچھ سنا تم سب نے؟'' نمو ہمیشہ کی طرح دوڑتی آئی تھی اور دروازے میں رک کے سب کو مخاطب کر کے ماحول کو سنسنی خیز بنانے کی کوشش کی۔

ویسے تو وہ اپنی اماں اور دو بہنوں کی طرح کام نہیں کرتی تھی لیکن جس دن اسکول کی چھٹی ہوتی، وہ لازمی ان کے ساتھ یہاں آجاتی۔ کسی کسی دن تو وہ بطور خاص یہاں آنے کے لیے اسکول کا ناغہ کرتی تھی۔

''پہلے ہی میرا مارے تجسس کے دم نکلنے والا ہے، جلدی بکو۔''

نمو کی ہمشیرہ مینو میں صبر کا فقدان تھا۔ مینو کے ساتھ اس سے بڑی بہن بالی بھی اس کی سمت پلٹی۔ اس کا چہرہ بھی وہی کہہ رہا تھا جو مینو کی زبان سے ادا ہو چکا تھا۔

ان تینوں نے ایک نظر آٹا گوندھتی رہی آمیدن کو دیکھا، جو معمول کی طرح اطراف سے بے نیاز تھی۔ وہ آدم بے زار یا خشک مزاج نہیں تھی لیکن دوسروں کے معاملات میں اس کی دلچسپی کا عالم صفر تھا۔ وہ خود سے کبھی کہیں شامل نہیں ہوتی تھی، ہاں کوئی بلائے یا بات کرے تو نرمی اور پیار سے بات یا معاملے میں شامل ہو جاتی لہٰذا انہیں اس تازہ ترین خبر میں بلکہ کسی بھی معاملے میں اس کے آگے بڑھ کے دلچسپی نہ لینے کا ایسا ہی یقین تھا جیسے کل صبح سورج نکلنے کا، سو اگلے ہی پل وہ اسے نظر انداز کر کے فی الوقت کی 'بریکنگ نیوز' کی جانب متوجہ ہوئیں جو نمو کے قبضے میں تھی۔

''حمدان بھائی آرہے ہیں۔''

اس نے آخر فضا پر تنی تجسس کی قبا اپنے انکشاف کی تیز ہوا سے اڑا دی اور خود ہی شور مچانے لگی کہ اسے حمدان بھائی بڑے پسند تھے بلکہ اس کا پہلا 'پہلا کرش' کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

اس کی ہو ہا کے شور میں کسی نے نہیں دیکھا کہ دنیا سے بے نیاز اس لڑکی کے ہاتھ تھم گئے ہیں، وہ کچھ لمحوں کے لیے بت بن گئی ہے اور اس کے اندر پیالے میں یکجا ہوئے آٹے پر مٹھیاں مارنے کی قوت یکا یک ختم ہو گئی تھی مگر جلد ہی سنبھل کے اس نے انگلیاں ایک ساتھ ملا کے بھینچیں۔ اس معمولی کے کام میں اس کی جدوجہد کوئی نہ جان سکتا تھا نہ سمجھ سکتا تھا۔

وہ تینوں کام چھوڑ کے الماس پروین کے چھوٹے سپوت پر برائے راست 'ٹاک شو' شروع کر چکی تھیں جو دو سال بعد واپس آرہا تھا۔ آمیدن نے قریب آ کے بالی کا بازو ہلایا تو وہ پلٹی۔

''میں کچھ دیر بعد آ کے روٹی بناتی ہوں۔''

''ہمم۔'' اس نے مصروف سا ہنکار بھرا اور زور شور سے جاری بحث میں شامل ہو گئی۔ سکینہ خالہ، مینو اور بالی گھر کی صاف صفائی اور کھانا پکانے پر مامور

مکمل ناول



تھیں۔

وہ باورچی خانے سے باہر نکلی جو مکان سے الگ تھلگ نہیں تھا لیکن سب سے آخری کمرا ضرور تھا۔ اس کے داخلی دروازے کے بائیں جانب کمروں کی بنا کھڑکی والی دیوار تھی۔ بس ایک کمرے کا دروازہ اس سمت کھلتا تھا جو اس کا تھا۔ باورچی خانے کے عین سامنے لاؤنج اور ہال کے ذیلی دروازے تھے جو باورچی خانے سے لاؤنج اور ہال میں آنے جانے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ اس آمدورفت کے لیے درمیان میں روش بنی تھی۔ دائیں سمت کھلا لان تھا۔

باورچی خانے اور اس کے کمرے کو ایک تنگ سی گلی جدا کرتی تھی۔ عقبی حصے میں جاتی تھی جہاں بھی چھت پر جانے والا زینہ تھا۔ وہ اسی گلی سے گزر کے پیچھے آگئی۔ اس جگہ پہنچ کے قدم خود بخود رک گئے۔

سالوں پہلے جب وقت کے مطابق چلتے ہوئے مکان میں کچھ جدید طرز کی تبدیلیاں کی گئیں تو چھت پر جانے والی پرانی سیڑھیاں بے مصرف ہوگئی تھیں کہ سب کچھ اگلے حصے میں منتقل ہوگیا تھا۔ عقبی حصہ آمدورفت اور کسی بھی قسم کی مداخلت سے فارغ کردیا گیا تھا تاہم زینے اب بھی موجود تھے اور یہ ہی اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ دن ہو یا رات، کسی بھی پہر وہ بے دھڑک گھنٹوں یہاں گزار دیتی تھی کہ اس طرف کوئی کھڑکی بھی نہیں تھی۔ کوئی گلی سے اندر آتا تب ہی اسے یہاں کسی کی موجودگی کا اندازہ ہوتا تھا اور ادھر کوئی نہیں آتا تھا۔ اس کے یہاں آنے جانے کا علم بھی مینو اور بالی کو ہی تھا۔

پلو لہرا کے دھول ہٹانے کی کوشش کے بعد وہ زینے پر بیٹھ گئی۔ سامنے احاطے کی دیوار سے لگ کے نیم اور پیپل کے گھنے پیڑ اپنے پتے پتے کو چپ رہنے کا حکم دے کر اس سبز آنکھوں اور گلابی رنگت والی حسینہ کو سننے کو بے تاب تھے جو چپ کی زباں میں ان سے بے تحاشا باتیں کرتی تھی۔ شاخوں سے لٹکے پتے بھی سعادت مندی سے بے حس وحرکت تھے۔ اچانک اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا اور اس نے گھبرا کے دوپٹا نکال کے گود میں رکھ لیا۔

باورچی خانے میں اس نے پہلے فقرے کے بعد ان تینوں کی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا لیکن اس وقت اس کے ذہن میں بھی وہ ہی بات تھی جو ان تینوں کے جوش کا مرکز تھی کہ حمدان شادی کے لیے آرہا ہے۔

”ظاہر ہے دو سال ہوگئے ہیں انگیجمنٹ کو۔“ اس نے دوپٹے کا مڑا کنارہ انگلیوں سے کھول کے کھینچا۔

”اور شادی کے بعد وہ پھر واپس ہی جائیں گے۔“ یہ خود کے لیے تسلی تھی یا آگاہی، اسے خود بھی یقین نہیں تھا۔ اسے وہ طرح دار اور پراعتماد آئینہ یاد آئی جو پچھلے دو سالوں سے اسی کے ساتھ تھی۔

اس نے مزید سوچنا چاہا مگر ذہن خالی تھا۔ اس موضوع پر آس پاس والوں کی بے شمار باتیں سن کر بھی اس کے اندر اس شادی سے منسلک کوئی خیال، کوئی تصور پیدا نہیں ہوتا تھا کہ یہ اس کے تخیل کا احتجاج تھا۔

وہ اس عالی شان بنگلے میں لائی گئی تو اس کی عمر شاید گیارہ بارہ سال تھی۔ اسے تو ٹھیک سے یاد بھی نہیں تھا۔ اس وقت اس کے پاس پچھلی زندگی کی خوب صورت یادیں تھیں۔ اپنے امی ابو کی آنکھوں کا تارا اور نانا کی بے حد لاڈلی آمیزن بہت باتونی تھی۔

پھر یکے بعد دیگر والدین کی وفات کے بعد وہ پہلی بار مایوسی، شکستگی اور دکھ سے آشنا ہوئی تھی۔ اس کے بعد نانا اس کی کل کائنات تھے۔ انہوں نے اسے مایوسی اور دکھ سے نکال کر زندگی سے محبت سکھائی، تاریکیوں کے بیچ جگنو کی اہمیت اور اسے تلاشنے کے گر سکھائے اور اس نے سارے سبق ایسے سیکھے تھے کہ پھر وقت کے تھپیڑوں اور اپنوں کی ستم ظریفیوں کے باوجود زندگی سے اس کی محبت کم نہیں ہوئی۔ اس نے گلے شکوں کے بجائے جیسا اور جو ملا اس پر تشکر کو اپنا شعار بنا لیا۔

نانا کی وفات کے بعد اس گھر میں اجنبی اور سپاٹ تاثر سے سجے چہروں کے بیچ وہ گھبرائی سی تھی۔ ٹکر ٹکر سب کو دیکھتی اس کی نظر کو جس گرم جوشی اور اپنائیت کی تلاش تھی وہ کسی صورت میں نہ تھی۔ وہ

سب افراد اچھے تھے مگر اپنے نہ تھے۔

اسے ایک کمرہ عنایت کیا گیا تھا۔ باقی سب تو ٹھیک تھے لیکن اس گھر کی سربراہ الماس پروین کی نظروں نے پہلے دن ہی اسے سہما دیا تھا۔ اس کم عمری میں بھی ان کی آنکھوں کی تپش اور لہجے کی برف نے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑا دی تھی۔ ان کے وجود سے اٹھتی اپنے لیے وہ منفی شعاعیں ہی تھیں کہ وہ اپنی عمر کی عام ہنستی بولتی کھلکھلاتی لڑکیوں کے مقابلے میں کم گو اور سنجیدہ ہو گئی۔ اس کے ناسمجھ اور معصوم ذہن نے اپنے طور پر ہی مصیبت سے بچنے کی خاطر انہیں کبھی خفا نہ کرنے کی ٹھان لی کہ اسی میں زندگی کا سکون مخفی تھا۔

اول دن نئی جگہ، اجنبی لوگ اور آنے والے وقت کا خوف ہی اس قدر تھا کہ اس سے رات کھانا نہیں کھایا گیا تھا۔ جب کروٹیں بدل بدل کے وہ تھک گئی تو خالی پیٹ کی آوازوں کا پانی سے گلا گھونٹنے کے ارادے سے باورچی خانے میں آئی۔ پانی پی کر پلٹی تو آنتیں دہائیاں دینے لگیں کہ ہم سکڑی جا رہی ہیں کچھ تو فکر کرو۔

جھجکتے ہوئے اس نے ڈھکے برتنوں کو دیکھا اور کاؤنٹر کے قریب آئی۔ ابھی ایک پتیلے کا ڈھکن اٹھایا ہی تھا کہ کسی نے بتی جلائی اور وہ مارے شرمندگی کے پسینے میں نہا گئی۔ ابھی چوری کی بھی نہیں تھی اور پکڑی گئی۔

اجالے کا جھماکا ہوتے ہی ہاتھ ہٹانے کے ساتھ وہ بے اختیار ہی پلٹ گئی تھی گویا اس طرح خود کو ذرا دیر پہلے والے عمل سے دور کر لے گی۔ سامنے جو بھی تھا۔

وہ اس کی شرمندگی پر حیران تھا جو اس کے خاموش وجود سے بنا صوتی لہروں کے چیخ رہی تھی۔

نانا کی وفات کے بعد جو کچھ دن اس نے اسی گھر میں ماموں ممانی کے مکمل مالک بن جانے کے بعد گزارے تھے، انہوں نے اسے لوگوں اور زندگی کے بالکل نئے روپ دکھائے تھے۔ اب بھی وہ ایک سرزنشی ڈانٹ کی امید کر رہی تھی۔

"کھانا ہی تو لے رہی تھی!" حمدان نے سوچا۔

اور ادھر آمیدن ندامت کے مارے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔

وہ آگے آیا اور رات کی خاموشی میں احتیاط کے باوجود دبا دبا سا، دراز کا شور پھر برتنوں کا شور ابھرا، پھر اس نے سلیپر میں قید پیروں کو کاؤنٹر سے دور جاتے دیکھا۔ اگلے پل وہ اس سے مخاطب تھا۔

"کھا لو۔" آمیدن نے خجالت کے وزن سے ٹوٹی جا رہی گردن اونچی کی۔ وہ میز کے قریب کھڑا تھا اور میز پر چاولوں سے بھری رکابی دھری تھی۔ ٹی شرٹ اور پاجامے میں ملبوس وہ اجنبی لڑکا کیسے اس کی بھوک جان گیا تھا۔ اس نے سوچا اور وہیں کھڑی رہی۔

کچھ دیر اس کے آگے بڑھنے یا بولنے کے انتظار کے بعد حمدان نے جگہ چھوڑی اور فریج کھول کے یخ بوتل نکال کر دروازے کی جانب چل پڑا۔ دروازہ عبور کرنے سے پہلے اس نے مڑ کے دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"ایٹ۔ (کھاؤ)" اس نے بوتل والا ہاتھ اٹھا کے رکابی کی طرف اشارہ کیا تاہم فوراً ہی غلطی کا احساس ہوا کہ جانے وہ سمجھ سکی یا نہیں۔

"کھانا کھا لو۔" اس نے ایک بار پھر دوہرایا اور چلا گیا۔ آمیدن کی نظر میز پر ٹھہر گئی۔ ٹھنڈے پلاؤ کی صورت دیکھتے ہی آنتوں نے کروٹ بدلی۔

"میں نے تو نہیں لیے، وہ خود دے کر گئے ہیں۔" اس نے شانوں سے ندامت اور احساس سہو کو جھٹکا اور کھڑے کھڑے ہی کھانا شروع کر دیا۔

رکابی خالی کر کے اس نے کوشش کی کہ دھوتے ہوئے آواز پیدا نہ ہو لیکن اسٹیل کے سنک میں سرد پانی گرنے کی آواز اسے کسی سیلابی ریلے کا شور محسوس ہو رہی تھی۔ کسی کے ادھر نہ آنے کی دعا کرتے اس نے وہ پلیٹ دھو کے رکھی اور کمرے میں آ گئی۔

پیٹ بھرتے ہی ٹھنڈ کا احساس بھی دوبالا ہو گیا اور نیند بھی گھر کر آئی تھی۔ وادیٔ نوم میں قدم رکھنے سے پہلے اسے وہ مہربان چہرہ یاد آیا تھا۔

وہ پہلی شب تھی اسے اتنا ہی یاد تھا کہ اس کے بعد ایسی ان گنت شبوں کا شمار ممکن نہیں تھا۔ وہ چند

دن کے لیے گھر آتا تھا اس میں بھی ان کا آمنا سامنا نہ ہونے کے برابر ہوتا کہ جب تک وہ الماس پروین کی معتمد خاص نہیں بنی تھی۔ یہ کام اس کے سپرد دسویں کے بعد ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ اسکول جاتی اور واپس آکر کمرے میں بند پڑھتی رہتی۔ سکینہ خالہ کمرے میں ہی اسے کھانا دے جاتی تھیں۔ اس بھی کبھار کے سامنے میں ہی دنیا اور اپنوں کی لاتعلقی جھیل رہی آمیذن کو اس کی مہربان، احساس کرتی نظر اور دوستانہ مسکراہٹ اچھی لگتی تھی۔ اتنے لوگوں میں ایک اسی میں اسے اپنائیت نظر آتی تھی۔

"آمیذن دیدی!" مینو کی پکار پر وہ چونکی۔

"بڑی آنٹی نے کہلوایا ہے، وہ آج جلد کھانا کھائیں گی۔" وہ کچھ کہے بنا کھڑی ہوئی۔ مینو بھی غائب ہوگئی۔

وہ اس گھر کی ملازمہ نہیں تھی بلکہ ملازموں کے لیے قابل رشک تھی کہ وہ بڑی مالکن یا بڑی آنٹی کی معتمد خاص تھی۔ ان کا کھانا، ناشتہ بنانے سے لے کر لگانے تک سب اس کے ذمہ تھا۔ ان کے کمرے کی صفائی، ان کے کپڑے، جوتے اور دیگر لوازمات کی تیاری اور ذمہ داری بھی اس کی تھی، وہ ہر جگہ اسے ساتھ رکھتی تھیں، اس کے بنا کہیں نہیں جاتی تھیں۔ جو مقام اور حیثیت دور سے یا کبھی کبھار دیکھنے والوں کو اس کی خوش نصیبی کا یقین دلاتی تھی، اس کی حقیقت وہی جانتی تھی۔ لوگوں کو الماس پروین کے پیار اور مہربانی کا یہ انداز بڑا پیارا لگتا تھا لیکن اس سارے عمل میں پیار کا کہیں گزر نہیں تھا۔

انہوں نے جو طریقہ اپنایا تھا، کبھی وہ سوچتی تو خود ہی ستائشی انداز میں تالیاں بجانے کا دل کرتا تھا۔ ان کی ہمدردی، بے غرضی اور انسان دوستی، خدا خوفی کی مثال لگنے والا عمل ان کا انتقام تھا، محبت اور نفرت کا اظہار تھا اور یہ حقیقت جو جانتے سمجھتے تھے وہ اپنی زبانیں سی چکے تھے۔ وہ بھی جان نہ پاتی اگر سکینہ خالہ کی بات نہ سنتی جو وہ اپنی بیٹیوں کی الجھن دور کرنے کے لیے سنا رہی تھیں کہ ایک اجنبی کو وہ کیوں گھر لے آئی ہیں۔

آج ان کی توجہ دو برس بعد واپس آرہے بیٹے کے استقبال کی تیاریوں پر تھی جو منگنی کے بعد بیرون ملک چلا گیا تھا۔ ہر کوئی اس آمد کو مستقبل قریب میں شادی سے جوڑ کر ہی بے پناہ پرجوش تھا۔ وہ الماس پروین کی پانچ اولادوں میں سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ اس کی عمر اور ان کے بڑے پوتے کی عمر میں چند سال کا ہی فرق تھا۔

اس نے ہمیشہ اپنی مرضی ان سے منوائی تھی۔ ان کی اولاد میں وہی تھا جو اسکول کے بعد مزید تعلیم کے لیے ہاسٹل گیا تھا۔ وہ چیخ پکار، غصہ یا دھمکی دے کر اپنی بات منوانے والا ضدی نہیں تھا بلکہ بڑے سلیقے اور طریقے سے وہی منوالیتا تھا جو اس کی خواہش ہوتی۔

ان کی اور حمدان کی غیر معمولی محبت کا اولین سبب تو یہ تھا کہ وہ سب سے چھوٹا تھا اور اس نے کم عمری میں ہی باپ کو کھو دیا تھا۔ سب نے باپ کا پیار دیکھا اور محسوس کیا تھا لیکن اس کے شعور سنبھالنے سے پہلے ہی ان کے شوہر کی وفات ہوگئی تھی اس لیے وہ اپنی جانب سے اس چھن چکی محبت کی تلافی بھی کرتی تھیں۔

"حمدان کا کمرہ دیکھ لو۔" اچانک انہوں نے اس کی سمت دیکھ کر کہا۔ "بالی نے ٹھیک سے صفائی کی ہے یا نہیں۔ اس کی ضرورت کی تمام چیزیں وہاں ہونی چاہئیں۔"

"جی۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ انہوں نے سامنے رکھی رکابی دو انگلیوں سے دور کی۔

یہ اشارہ تھا کہ اب وہ برتن اٹھا سکتی ہے۔ آمیذن نے ہاتھ میں تھامی ٹرے میں ان کی پلیٹیں، گلاس اور چمچ اٹھا کے رکھے اور چلی گئی۔ پلیٹ کھسکانے جیسا معمولی عمل کرتے ہوئے بھی وہ حقارت اور ان کے نزدیک اس کے مقام کا تعین، اس تک پہنچا دیتی تھیں۔

ٹرے باورچی خانے میں رکھ کے وہ ان کے حکم کی تعمیل کے لیے اس بند کمرے کی جانب چل

بڑی جو روز صفائی کے لیے کھلتا تھا لیکن آج اپنے مکین کی متوقع آمد کے لیے کھلا تھا۔

اندر اب بھی نمو اور مینو پردے تبدیل کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ وہ دونوں مسکرائیں۔

''دیدی! دیکھیں بھلا انہیں بدلنے کی ضرورت تھی کیا؟'' نمو نے پرانا اتارا گیا پردہ بمشکل ہاتھوں سے سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ اس کے نام کے ساتھ 'دیدی' زیادہ سوٹ کرتا ہے، یہ یقین نمو کا ہی تھا جس نے اس کے لیے دیدی کی شروعات کی تھی۔ اس کے نام کی وجہ تسمیہ اور تاریخ جان لینے کے بعد کہ اس کے نانا نے اپنی بیٹی کا فارسی نام آئے تن رکھا تھا اور پھر نواسی کا اس سے ملتا جلتا ہم قافیہ آئیدن۔

''یہ نئے پردے وغیرہ بلکہ ساری تیاری خوشی کا اظہار ہے۔'' اس نے مسکرا کے نمو کا حوصلہ بڑھایا جو بہنوں کے مقابلے میں کام چور تھی۔

''میں کچھ مدد کروں؟'' اس کا مدد کا ارادہ قطعی نہ تھا، یہ بس رسمی جملہ تھا۔

''ارے نہیں۔ بس ہو گیا، پکڑو۔'' مینو نے چادر کھول کے پلنگ پر پھیلائی اور دوسرا سرا نمو کو پکڑنے کا کہا۔ اس نے پرانے پردے ہاتھ سے فرش پر گرا کے چادر تھامی۔ وہ ان سے کچھ فاصلے پر کھڑی انہیں چادر بچھانے کے بعد تکیے کے غلاف بدلتے دیکھتی رہی۔

اس سے قبل بھی وہ اس کمرے میں کئی بار آئی تھی۔ اور اپنے جذبوں سے باخبر ہوتے ہی وہ یہاں سے ایسے گزرتی اور چلتی تھی کہ کسی شے سے اس کے ہاتھ تو دور دوپٹا اور دامن بھی نہ مس ہو۔ جانے دیوار، میز، پردے، چادر، ان پر رہ جانے والا اس کا کون سا لمس چغلی کر بیٹھے، جانے اس کا دوپٹا کون سی گرہ کھول کے سرگوشی وہاں بکھیر دے۔

اس کے پاس بڑے خوف تھے جو اسے اس احتیاط پر مجبور کرتے تھے۔ اتنی احتیاط کے باوجود جس لمحے میں سارے اندیشے ایک ساتھ سچ ہوئے اور سارے خوف دم توڑ گئے، وہ اس کی بڑی معمولی غلطی کے کارن ہوا تھا۔

''کاش میں اس رات کمرے میں ہی رہتی۔''
اس نے اب بھی سوچا لیکن کہیں دل اس کاش پر خفا بھی ہوتا تھا کہ۔ وہ غلطی ہی تو اب حاصل زیست تھی۔

''بس اب جب حمدان بھائی گھر آجائیں تب ان کے ادھر آنے سے پہلے وہ جلانا ہو گا۔''

نمو نے کمر پر ہاتھ رکھ کے خود کو ذرا آگے پیچھے جھکا کے کمر کی ورزش سی کرتے ہوئے، دیوار سے لگی کنسول میز پر سنہری ٹرے میں رکھے رنگین منقش مرتبان کی طرف اشارہ کیا جو خوشبودار موم سے بھرا تھا۔

انہیں الماس پروین کی طرف سے بڑی مخصوص ہدایات تھیں جن میں یہ خوشبودار موم بتیاں جلانا بھی شامل تھا کہ حمدان کو کمرے میں مخصوص ہلکی خوشبو پسند تھی اور حمدان بھائی کی، الماس پروین جتنی پروا اور فکر ننھی نمو کو بھی تھی۔ گھر کے چھوٹے مالک پر اس کا 'کرش' آئیدن اور وہ بہنیں جانتی تھیں۔

''ویسے انہیں ہفتہ بھر پہلے تو بتانا چاہیے تھا نا۔''
مینو کمرے سے باہر لے جانے والا سامان باسکٹ میں رکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

''ایک دن میں اتنا تھکا دیا۔ اب ساری رات جاگتے رہو وہ الگ۔'' مینو کی ابتدائی خوشی اور جوش، کام کی زیادتی نے چھین لیا تھا۔ حمدان کی گھر آمد کا متوقع وقت آدھی رات کے بعد تھا۔

''میں تو مغرب کے بعد ہی گھر جا کر سو جاؤں گی تا کہ پھر رات میں اٹھ کے ادھر آجاؤں۔'' نمو کے الگ منصوبے تھے۔

''حق ہا! مغرب کے بعد سو جاؤں گی!'' مینو نے اس کی نقل اتاری۔

''چلو ورنہ ابھی باجی چیخنے لگے گی۔'' اسے بڑی بہن کا خیال آیا جو سکینہ خالہ کے ساتھ باورچی خانے میں مصروف تھی۔

ان کے ساتھ باہر نکل کے اسے دروازہ بند کرنا پڑا کہ دونوں کے ہاتھ خالی نہیں تھے۔

اس نے الماس پروین کو اطلاع دی کہ کمرہ ان کی ہدایات کے مطابق تیار کر دیا گیا ہے۔ ان کی

طرف سے جواب میں ایک ہنکار ملی جس میں چھپا تنفر بھرا تیر جانے اور کسی کو محسوس ہوتا بھی تھا یا وہ سب جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتے تھے۔

الماس فاطمہ کی بڑی بیٹی سمیعہ جو قریب کے شہر میں تھیں، وہ حمنہ کے ساتھ پہنچ گئی تھیں۔

☆☆☆

دو ہفتہ قبل آئینہ فرینکفرٹ سے واپس آئی تھی جہاں پچھلے دو برسوں سے وہ ایک ہی پروجیکٹ پر ساتھ کام کر رہے تھے۔ جب گھر والوں کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے آنے کی اطلاع اسے بھی دی تو وہ خفا ہو گئی کہ وہ اس کے ساتھ نہیں آنا چاہتا تھا اس لیے بہانا بنا کے رکا تھا۔ اس نے زیادہ صفائی دینے کی کوشش کی نہ منانے کی بس "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" کہا تھا۔

وہ اس وقت کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا لیکن دل تو یونہی بدنام ہے ذہن اور سوچیں بھی کب ہمارے اختیار میں ہوتی ہیں۔ لینڈنگ میں ابھی آدھا گھنٹہ مزید تھا۔ اس نے ہاتھ باندھ کے سر پیچھے ٹکایا۔

اس پر وہ دونوں ادوار گزر رہے تھے جو کسی بھی دل ہارنے والے کا مقدر ہو سکتے ہیں۔ وارداتِ قلب کا واحد فریق ہونے کی کسک، محرومی اور لاحاصلی کی صداقت قبول کر لینے کے بعد وہ جاں فزا لمحہ اس کی زندگی میں بھی آیا جس کی وقوع پذیری کی دعائیں کہ کوئی اور بھی ان شعلوں سے لپٹ کے سکون محسوس کر رہا ہو جس میں ہم جل رہے ہوتے ہیں لیکن دوسری صورت حال بھی اس کے لیے خوشی کا سامان نہ بن سکی تھی بلکہ ان دو برس کے خود ساختہ ہجر میں اس لمحے نے اسے بھی خوش اور مطمئن ہونے نہ دیا۔

اس دن سے پہلے جانے کتنی بار اس نے اس کندنی سبز آنکھوں والی لڑکی کو دیکھا تھا جو بلاشبہ اسے اس وقت بھی پیاری لگتی تھی لیکن یہ پسندیدگی ایسی تھی جو کسی بھی خوبصورت اور دلکش چیز کے لیے ہوتی ہے۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے کئی بار ان کا آمنا سامنا بھی ہوتا تھا۔ وہ زیادہ تر خاموش ہی رہتی۔ اس نے کم ہی اسے کسی سے گفتگو میں پہل کرتے دیکھا تھا۔ اسے ان کے یہاں آئے دو ڈھائی برس ہونے آئے تھے۔

اس بار جب وہ فائنل نتائج کے بعد ہاسٹل سے گھر آیا تو معمول کی طرح بھتیجوں اور اکلوتی بھتیجی کے لیے تحائف لایا تھا اور چوں کہ اسے علم تھا اس نے بھی دسویں کے بعد کالج جانا شروع کیا ہے لہٰذا اس نے ایمل کے لیے کالج بیگ لیا تو اس کے لیے بھی ایک بیگ خرید لیا۔

پورا دن وہ اسے کہیں دکھائی ہی نہیں دی آخر وہ سونے سے پہلے اس کا تحفہ دینے اس کے کمرے کے باہر تھا۔ وہ پہلی بار اس کمرے تک آیا تھا اور اس کے لیے یہ ایک بے ضرر اور عام سی بات تھی۔

دستک پر آئیدن نے دروازہ کھولا۔ سکینہ خالہ ان کی بیٹیوں اور کبھی کبھار سمیعہ کے علاوہ کوئی اس کے کمرے میں آتا نہیں تھا اور اس وقت تو قطعی نہیں، سو اس نے دروازہ کھولا تو حمدان کے سامنے گھبرائی صورت تھی۔ اسے دیکھتے ہی گھبراہٹ پر حیرت حاوی ہو گئی۔

"یہ۔" اس نے بیگ آگے کیا اور اچانک جانے کدھر سے سمیعہ نے آ کے بیگ اُچک لیا۔

"باجی!" ان کی آمد سے زیادہ ان کا بیگ جھپٹنے کا انداز اسے حیران کر رہا تھا۔

"حمدان! کان کھول کر سن لو، اگر آئیدن کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتے تو کبھی ادھر کا رخ نہیں کرنا اور نہ یہ سب۔" انہوں نے بیگ والا ہاتھ ہلایا۔

"باجی۔" اس کی حیرت میں اضافہ ہوا۔ آئیدن الگ ان کی بات سن کر سکتے میں تھی۔

"آئیدن!" انہوں نے اس کے گلابی گال پر ہاتھ رکھا۔

"بیٹا تم جاؤ اندر اور پریشان نہ ہو کچھ نہیں ہوا ہے۔" ان کے لہجے میں ذرا دیر پہلے والی تنبیہی اور آگاہی والا اثر ندارد تھا۔ یہاں کے لوگوں میں، کبھی کبھی آنے والی سمیعہ باجی سے ہی اسے اپنائیت اور انسیت کا احساس ملتا تھا۔

آمیذن نے سر ہلایا، ایک نظر حمدان پر ڈالی اور دروازہ بند کرلیا۔

"آؤ۔" وہ اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے اسے لاؤنج میں لے آئیں۔

"بیٹھو۔" اسے صوفے پر بٹھا کے وہ بھی ساتھ بیٹھ گئیں۔

سمیعہ باجی، اسلم بھائی کے بعد دوسرے نمبر پر تھیں۔ ان کے بعد عدنان بھائی اور پھر شازمہ آپی تھیں۔

"تمہیں۔ آمیذن پسند ہے؟" ان کا خوف اتنا بڑا تھا کہ ان کے اندر اشاروں کنایوں اور گھما پھرا کے سراغ لگانے اتنا حوصلہ اور صبر بھی نہیں رہا تھا۔ آمیذن اس عمر میں تھی جہاں شباب بھی پر شباب ہوتا ہے اور حسن میں تو بے مثال تھی، ان کا ڈر بجا تھا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ بدک کے پیچھے ہوا کہ ان کے سوال کا مفہوم وہ بخوبی سمجھ گیا تھا۔ وہ بغور اس کے تاثرات دیکھ رہی تھیں۔

"شکر ہے۔ حمدان!" انہوں نے پورا رخ اس کی جانب کیا۔

"سوال جواب مت کرنا لیکن آج جو کہہ رہی ہوں اسے ہمیشہ یاد رکھنا۔ تمھاری فیلنگ اور نیت جو بھی ہو، آمیذن میں تمھاری ذرا سی دلچسپی بھی اس پر زندگی تنگ کردے گی۔"

"لیکن کیوں؟" وہ آمیذن کی طرح پندرہ سال کا لڑکا نہیں تھا جو بلا حیل وحجت سب سن اور مان لیتا۔

"وہ سب تم نہیں سمجھو گے لیکن میں نے آج تک تمہیں بلاوجہ کوئی ہدایت دی ہے؟" آخر میں انہیں اس کی جانب سے یقین دہانی پانے کے لیے اپنے ماضی کا سہارا لینا پڑا۔

وہ سب بہن بھائیوں میں معاملات، حالات اور رویوں کی زیادہ سمجھ رکھتی تھیں۔ ان کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے کوئی متامل نہیں ہوتا تھا۔ وہ عمر میں اس سے کافی بڑی تھیں، ان کی تین بیٹیاں تھیں، کوئی بیٹا نہیں تھا، وہ سب سے چھوٹا بھائی تھا، وجہ ان میں سے کوئی ایک تھی یا ساری جو ان کی حمدان کے لیے محبت ممتا میں لپٹی محسوس ہوتی تھی۔ یہ بھائی ان کے لیے بڑا خاص تھا۔

"آپ غلط نہیں کہہ رہی ہیں لیکن کون زندگی تنگ کرے گا؟" اس بے ضرر لڑکی کے لیے کوئی برا سوچ بھی کیسے سکتا تھا وہ بھی اس کی چند معمولی عنایات کی وجہ سے؟ وہ حیران تھا۔

"امی۔"

"امی؟"

"ہوں، اور اب مزید سوال مت کرو۔ اس کے پیچھے لمبی ہسٹری ہے، بس آئندہ یوں ہی بی ہیو کرو کہ آمیذن یہاں موجود ہی نہیں ہے، ٹھیک ہے؟"

ایک عام سی بات پر سمجھدار بہن کا ایسا شدید ردعمل اور پھر یہ عجیب سی وجہ۔ انہیں علم ہی نہیں تھا انہوں نے اس رات آمیذن کو اس کے لیے کتنا خاص بنادیا تھا۔ جس کے خدشے انہیں ستا رہے تھے، ان کے اس عمل نے ان کے سچ ہونے کی بنیاد رکھ دی تھی۔

بہرحال اسے باجی پر اتنا بھروسا تھا کہ اس نے خود بخود اپنی ماں کے رویے پر غور کرنا شروع کیا اور جلد ان کے انداز سے ان میں آمیذن کے لیے چھپی نفرت بھانپ لی تھی اور یہ جان کر اسے جتنا دکھ ہوا اس پر وہ ششدر رہ گیا۔ یہ پہلا احساس تھا جس نے اسے چونکایا تھا۔

اس کے بعد وہ محتاط ہو گیا، خاص طور پر امی کی موجودگی میں لیکن آزادی چھنتے ہی انسان چور رستے ڈھونڈ لیتا ہے۔

جانے یہ رفتہ رفتہ پرورش پا کے ہونے والا حادثہ تھا یا اسی شب اس سفر کا آغاز ہو چکا تھا، اسے احساس مگر دھیرے دھیرے ہوا تھا۔

وہ جب بھی ہاسٹل سے گھر آتا، راستہ بھر قیاس کرتا رہتا، وہ اسے سب سے پہلے کہاں نظر آئے گی۔ لاؤنج میں امی کو چائے دیتے ہوئے، لان میں انہیں صبح کا اخبار دیتے ہوئے، ان کے کمرے میں ان کی الماری میں استری شدہ کپڑے رکھتے ہوئے یا راہداری میں ٹرے اٹھائے یا پھر قسمت مہربان رہی تو

وہ اسے تنہا اپنے آپ میں گم یا پڑھائی کرتے ہوئے لان کے گوشے میں دیکھ سکے گا۔

گھر آنے کا سارا جوش اور خوشی آمیذ ن کے دیدار سے وابستہ ہو کے رہ گئی تھی تاہم اسے سمیعہ کی بات پر اتنا یقین تھا کہ اس نے کبھی اس کے قریب جانے یا اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ اکثر فجر کے بعد لان میں اپنی کتابیں لے کر بیٹھتی تھی اور اس نے بھی چند دنوں کے قیام میں فجر کے بعد جاگنگ کے لیے جانا شروع کر دیا۔ آتے اور جاتے وقت ایک اچٹتی سی نگاہ اس کی نئی آکسیجن تھی۔ محبت اپنے سارے رنگوں اور جزئیات کے ساتھ ساتھ ابتدا سے ہی حد درجہ محتاط تھی۔ اسے سمیعہ کی بات بھولتی نہیں تھی اور گزرتے وقت کے ساتھ آمیذ ن کی تنگ زندگی مزید تنگ نہ ہو، اس سعی میں وہ بڑا کامیاب رہا۔

کبھی کسی کو اس کے دل کی خبر نہ ہو سکی۔ ویسے بھی الماس پروین کا اس کے ساتھ جو رویہ تھا، گھر کے بچے اپنے والدین کی ہدایت پر آمیذ ن کے ساتھ فری نہیں ہوتے تھے اور اس نے تو دل کی بے ایمانی کے بعد سخت سے سخت پہرے بٹھا دیے تھے۔

اسے ہر قسم کے عتاب و عذاب سے بچانے کی خواہش کو جھٹکا اس وقت لگا جب اس سے چند سال چھوٹی بھانجی ناجیہ سے اس نے سنا کہ آمیذ ن کے لیے کوئی رشتہ آیا ہے۔ وہ یکایک بن ہو گیا تھا۔ آس پاس اچانک لایعنی آوازیں تھیں جنہیں اس کا ذہن ڈی کوڈ کرنے سے قاصر ہو گیا تھا۔

یہ سچ تو اس نے اب تک نظر انداز ہی کیا تھا۔

”آخر تمہیں اسے عذاب اور عتاب سے ہی بچانا ہے نا!“ وہ مان جاتا لیکن اب ذہن ’مگر کیوں؟‘ کی تکرار جاری رکھتا۔

خیر اس رشتہ کی بات وہیں ختم ہو گئی کہ ابھی وہ پڑھ رہی تھی مگر حمدان کے لیے ایک نئی اذیت کا در کھول گئی۔ اگلی بار اس نے سنا خاندان سے ہی کسی نے رشتہ بھیجا ہے اور اس بار بھی انکار ہو گیا کہ امی مطمئن نہیں۔ وہ بلا کے حسن کی مالک تھی سو لوگوں کے لیے اس کا یتیم و یسیر ہونا یا سگے ماموں کی بے اعتنائی کوئی مسئلہ نہیں تھی۔

جب اس نے اپنے جذبات پوری ایمانداری سے قبول کر لیے تو ایک دن سمیعہ سے اپنی امی اور آمیذ ن کے انوکھے رشتے کی حقیقت پوچھ ہی لی۔

”ٹھیک ٹھاک تو پروپوزلز تھے، امی کیوں ”نا“ کہہ رہی ہیں؟“ ذرا دیر پہلے ناجیہ اپنی مما اور ممانیوں کے ساتھ اسی موضوع پر بات کر رہی تھیں۔ ان کے جاتے ہی اس نے سمیعہ سے پوچھا۔

”شاید امی نہیں کرنا چاہتیں اس کی شادی۔“

”لیکن کیوں؟“ اس کے سوال پر وہ چپ ہو گئیں۔

”کم آن باجی!“

اور انہوں نے اصل واقعہ کہہ سنایا۔

مکمل قصے کے بعد وہ دونوں کتنی دیر خاموش رہے۔

”امی کے لیے وہ آمیذ ن نہیں آئے تن ہے۔ وہ اسے فراز احمد کو ٹھکرانے کی سزا دے رہی ہیں۔ اگر وہ قبول کر لیتی تو ان کی طرح اس گھر میں آمیذ ن بھی مالکن ہوتی وہ اسی خیال کو جانے کسے باور کرا رہی ہیں خود کو، آمیذ ن کو یا آئے تن کی روح کو۔ امی کی سائیکی یہ ہی بن گئی ہے۔ تم فراز ماموں سے ان کی محبت جانتے ہو نا تو اسے نہ چھیڑو۔“

”لیکن اس طرح کسی کی زندگی سے۔“

اس کی بات انہوں نے درمیان میں کاٹ دی۔

”میں مناسب وقت اور مناسب رشتہ آنے پر مداخلت کروں گی۔ ابھی بے وقت چھیڑ کر خواہ مخواہ ایشو بنانا ٹھیک نہیں اور تم ان سب سے دور رہو۔ امی کا دماغ اس معاملے میں سینسیٹیو ہے۔ ماموں کا دکھ دیکھ رہے ہو نا، کیا کروا رہا ہے ان سے، تمہارے متعلق انہیں شک یا غلط فہمی بھی ہوئی تو سوچ لو۔ اس بے چاری کا کیا کریں گی۔“

”میرے بارے میں کیوں غلط فہمی ہو گی۔“

اس کے دل کا چور تھا کہ اس نے صفائی دی۔

”جب آمیذ ن کو گھر لانے کی بات چل رہی تھی

تو کسی نے امی سے کہا تھا" وہ ماں کی طرح حسین ہے اگر تمھارے یہاں پھر وہی کہانی دہرائی گئی تو۔" اس پر امی نے بڑے فخر اور یقین سے کہا تھا ایسا کبھی نہیں ہوگا، ان کی اولاد ماں کے اشاروں سے اس کے دل کا حال سمجھنے والی ہے اور ماموں سے پیار کرنے والی ہے، وہ کبھی ایسی غلطی نہیں کرے گی۔"

اور حمدان کو اپنا سانس رکتا محسوس ہوا تھا۔

آمیذن کا بی اے ہوتے ہی مزید اس قسم کی باتیں اس کے کانوں میں پڑیں لیکن کہیں بات نہیں بنی مگر اس نے یہ خسارہ قبول کرلیا کہ وہ ہمیشہ اس کی دسترس سے دور ہی رہے گی تب ہی خوش اور مطمئن رہ سکے گی۔ جتنا وہ اپنی امی اور ان کے آمیذن کے ساتھ رویے پر غور کرتا اسے سمیعہ کا تجزیہ صد فی صد درست محسوس ہوتا۔

ملازمت کے بعد اس کا آنا جانا کم ہوگیا تھا۔ وہ جب گھر جاتا خود کو ذہنی طور پر آمادہ رکھتا کہ گھر میں آمیذن کی شادی کی خبر سننے کو ملے گی لیکن ایسا کچھ نہ ہوا حتیٰ کہ گھر میں اس کی شادی کی باتیں ہونے لگیں۔

ایک سمیعہ باجی تھیں جن سے وہ آمیذن کا ذکر کرسکتا تھا لیکن اس پیش روی میں اس کا اپنا راز افشا ہونے کا خطرہ تھا کہ ان کی زیرک نگاہی کا وہ قائل تھا اور سب سے زیادہ مشقت اب تک ان سے چھپنے میں ہی کرنی پڑی تھی۔

ایک دو دفعہ جب وہ اس کے پاس آئیں تو اس کے دفتر کی ساتھی آئینہ سے ملنے کے بعد الماس پروین نے اسے گھر پر مدعو کیا۔ وہ اس کے ساتھ دو بار گھر آئی۔ جلد ہی وہ گھر میں سب سے گھل مل گئی تھی۔ اب اسے گھر آنے کے لیے اس کی ضرورت نہیں رہی تھی، وہ خود بھی سب سے ملنے آجاتی تھی۔

سب کو ان دونوں کے ایک دوسرے کے ساتھ ملوث ہونے کا اس قدر یقین تھا کہ اس کی مرضی پوچھے بنا ہی الماس پروین اس کا رشتہ لے کر آئینہ کے گھر پہنچ گئیں۔ وہ سب اسے یہ سرپرائز دے کر اس سے جو توقع کررہے تھے، اس نے بھی وہی ردعمل دیا۔ دنیاداری بہر حال دل کی دنیا سے الگ شے تھی، کم از کم اس کے لیے تھی!

کچھ فیصلے بس خانہ پری کے لیے کرنے پڑتے ہیں، اس نے بھی کرلیا لیکن اپنی منگنی والے دن ایک بار پھر اس کی دنیا بدل گئی تھی۔

ایئر ہوسٹس کی آواز پر وہ چونک کے سیدھا ہوا۔

☆☆☆

"ارے بیٹا! فون بھی نہیں کیا؟" آئینہ کو دیکھ کر وہ سب خوش گوار حیرت میں گھر گئے تھے۔ جواب میں وہ محض مسکرا کے رہ گئی۔

"ایک ساتھ ہی آتے نا، ہفتہ یا کچھ دن ہی تو تھے درمیان میں۔" بڑی بھابھی نے سب کے ذہن میں مچل رہی بات کو آواز اور الفاظ دیے۔

"اس ٹائم حمدان کو چھٹی نہیں مل رہی تھی، یہ تو ابھی اچانک اپروو ہوگئی ہے۔" اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

سارا گھر اپنی طرف سے چند دنوں بعد ان دونوں کی شادی کی امید اور انتظار میں تھا۔ وہ سب آئینہ کے والدین کے آنے کی توقع کررہے تھے۔

کچھ دیر بعد آئینہ نے باجی کے کان میں جانے کیا کہا کہ وہ بہانے سے اسے اور الماس پروین کو لے کر ان کے کمرے میں آگئیں۔

"سب ٹھیک تو ہے بیٹا؟" وہ جہاندیدہ خاتون تھیں۔ آئینہ نے کچھ کہنے کے بجائے سمیعہ کو دیکھا۔

"امی! آئینہ کے کچھ تحفظات ہیں حمدان کو لے کر۔" انہوں نے احتیاط سے الفاظ چنے تھے۔ الماس پروین جو بڑے آرام وسکون میں تھیں یکا یک چونکی ہوگئیں۔

کمرے کے دوسرے گوشے میں اسٹینڈ لگائے کپڑے استری کرتی آمیذن نے بھی سر اٹھا کے دنیا کی خوش نصیب ترین لڑکی کو دیکھا۔ آئینہ کی آمد کے بعد انہوں نے ہی اسے اس کام کے لیے کمرے میں بھیجا تھا۔

"انہیں کیا تحفظات ہوسکتے ہیں بھلا؟" اس نے واپس سامنے پھیلے دوپٹے پر بھاپ اڑاتی استری چلاتے ہوئے سوچا۔

"میں سن رہی ہوں۔" جب وہ دونوں چپ رہیں تو انہوں نے باری باری انہیں دیکھا۔

"آنٹی! کیا حمدان کو کوئی اور پسند تھا، آپ نے یہ انگیجمنٹ زبردستی کی تھی؟" چند پل واضح تعجب سے اسے دیکھنے کے بعد وہ ہنس دیں۔

"بیٹا! یہ انگیجمنٹ اس لیے کی تھی کہ ہم سب کو لگا تھا آپ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور اگر اسے کوئی پسند ہوتا تو وہ ہمیں ضرور خبر کرتا اور ہم سب خوشی خوشی اسے قبول کر لیتے لیکن ایسا کچھ نہیں ہے۔" انہوں شفقت سے سمجھایا۔ "اتنا لمبا عرصہ منگنی رکھنے کے لیے اسی لیے منع کرتے ہیں کہ وسوسے اور وہم ستاتے ہیں، ان پر توجہ نہ دو۔"

"آنٹی یہ بھی تو ہو سکتا ہے وہ کسی کو پسند کرتا ہو لیکن وہ نہیں یا کوئی دوسرا مسئلہ ہو جو آپ سے کہہ نہیں سکا یا کیا پتا کوئی اور بات ہوئی ہو۔" آئینہ کے لہجے میں سچ جاننے کی تڑپ تھی۔

"بیٹا! آپ اوور تھنکنگ کا شکار ہو رہی ہیں۔" انہوں نے دل میں ایک لمبی آہ کے ساتھ 'یہ آج کل کی نئی نسل!' کہنے کے بعد آئینہ کو مخاطب کیا تھا۔

"حمدان نے مجھ سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی، کیا کبھی تم سے کچھ کہا ہے؟" انہوں نے بیٹی نے دیکھا۔

"نہیں۔" سمیعہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھ سے نہ سہی لیکن اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ سمیعہ سے ضرور کہتا اس لیے آگے کی تیاری پکڑو، مستقبل کا سوچو۔ ہم سب ایک دو دن میں آتے ہیں اور شادی کی تاریخ طے کرتے ہیں بلکہ آج ہی سمدھن کو اپنی آمد اور مقصد سے آگاہ کر دیتی ہوں۔" وہ حتمی لہجے میں کہہ کر کھڑی ہوئیں۔

"میں نماز پڑھ لوں پھر ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔" اس دفعہ ان کی آواز ذرا بلند تھی اور آئینہ نے استری کا سوئچ آف کر دیا۔

وہ اٹھ کر غسل خانے میں گئیں اور اس نے ان کے مخصوص گوشے میں جائے نماز بچھائی پھر الماری سے نماز والا دوپٹا نکال کے جائے نماز کے قریب رکھی گول میز پر رکھا جہاں قرآن کریم کا نسخہ اور دیگر مسنون دعاؤں و اذکار کی کتب رکھی تھیں۔

"تم نے حمدان سے اس موضوع پر بات کی؟" باجی نے آئینہ سے پوچھا۔ وہ دوبارہ سابقہ جگہ آن کھڑی ہوئی تھی۔

"کئی بار باجی!" اس نے ہاتھ اٹھا کے گرائے۔

"حمدان کا ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ، ایسا کچھ نہیں۔ لیکن باجی آپ خود بتائیں، دو سال میں اس نے ایک بار بھی اپنائیت کا احساس نہیں دلایا۔ وہ مجھے ویسے ہی ٹریٹ کرتا ہے جیسے باقی سب کولیگز کو اور کولیگز کو یقین نہیں آتا کہ ہم انگیجڈ ہیں۔"

"یہ تو ان کے کلچر اور ہماری روایات اور لمٹس کا فرق ہے نا آئینہ۔"

"اس دور میں ہمارے ملک میں کوئی یہ پرانی روایتیں یاد نہیں رکھتا تو گوروں کے درمیان یہ لمٹس کسے یاد رہتی ہیں باجی۔" بات تلخ مگر جھوٹ بھی نہیں تھی۔

"میں لمٹس کراس کرنے کی بات نہیں کر رہی۔" اسے بھی اپنے بیان کے حد سے گزرنے کا احساس ہوا۔

"لیکن اپنائیت، انسیت، اٹیچمنٹ کا اظہار تو ہونا چاہیے نا۔ چلیں مانا پہلے کوئی فیلنگ نہیں ہوں گی لیکن جب یہ علم ہے کہ ہمیں ساری عمر ساتھ رہنا ہے تو دو سال میں کچھ تو بدلتا۔ اس کے اندر کوئی ایکسائٹمنٹ ہے نہ گرم جوشی اور میں اس سے یہ سب ایکسپیکٹ کرتی ہوں اس لیے میرے ساتھ اس کا روٹین اور عام رویہ جیسا وہ سب کے ساتھ رواں رکھتا ہے، زیادہ محسوس ہوتا ہے۔"

"دیکھو، اب تم خود کہہ رہی ہو کہ یہ اس لیے محسوس ہو رہا ہے کیونکہ تم ایکسپیکٹ کرتی ہو۔ کچھ افراد مختلف ہوتے ہیں، دیکھنا وہ تمہیں شادی کے بعد حیران کر دے گا۔" انہوں نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔ آئینہ نے ایک گہرا سانس لیا۔

"پاس بیٹھا انسان جب بہت دور محسوس ہو تو

اتنا بڑا فیصلہ کرتے ڈر لگتا ہے۔ حمدان یا تو بہت گہرا ہے کہ کوئی اس تک پہنچ نہیں سکا یا پھر وہ ان لطیف احساسات سے عاری ہے۔"

آخری دوپٹا تہہ لگا کے رکھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھم گیا۔ وہ بھی تو اس گہرائی تک دیر سے پہنچی تھی۔

"کبھی کبھی لگتا ہے جیسے اس نے خود کو کہیں کمٹ کر رکھا ہے اور بڑی سختی اور ایمان داری سے وہ کمٹمنٹ نبھا رہا ہے۔" سمیعہ پھر آئینہ کے قیاس رد کرتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھیں مگر اس کے کانوں میں ان کی نہیں کسی اور کی آواز گونجی تھی۔

"اوہ آئیڈن!"

کوئی حمدان کے لطیف احساسات سمجھتا بھی کیسے کہ یہ دو لفظ کتنے جذبوں سے بھرے تو اس کی تنہا شاید وہ تھی لیکن کیا وہ شب کسی خاموش وعدے کی گواہ بھی تھی؟

سمیعہ اب بھی اسے قائل کرنے میں توانائی خرچ کر رہی تھیں کہ وہ زود حس ہو رہی ہے اور حمدان کے آنے کے بعد وہ خود اس سے بات کریں گی۔

آئیڈن نے سوئچ بند کیا اور پلگ نکال کے استری اس کی جگہ پر رکھی پھر اسٹینڈ بند کر کے الماری اور دیوار کے درمیان والی درز میں کھسکا دیا۔ الماس پروین غسل خانے سے باہر آ کر دوپٹا باندھ رہی تھیں۔

"کھانے کی تیاری کرو۔" اس کی سمت دیکھے بنا کہے اس چار لفظی فقرے کی ٹھنڈک اگر آئینہ محسوس کر سکتی تو اسی وقت سر جھٹک کے حمدان سے اپنی شکایات کو 'جینیٹکس' کے سر ڈالتی اور ہنستی مسکراتی شادی کی تیاریاں کرنے دوڑ پڑتی۔

وہ سمیعہ اور آئینہ کے پاس سے گزر کر کمرے سے نکل گئی۔ اس گھر کے مکین اور ملنے جلنے والوں کے لیے اس کا وجود ایسا ہی غیر اہم اور ناقابل دید تھا۔

سب کے اصرار کے باوجود بھی آئینہ رکی نہیں۔

☆☆☆

اسلم بھائی کے بیٹے ارحم، اویس، عدنان بھائی اور ان کا بیٹا اشفاق اسے لینے ایئرپورٹ گئے تھے۔ باقی سب گھر میں منتظر تھے۔

چوں کہ ایئرپورٹ سے واپسی ڈیڑھ دو بجے متوقع تھی لہٰذا سکینہ خالہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ گھر چلی گئی تھیں۔ ان کی ضرورت کی صورت میں انہیں فون کر کے بلا لیا جاتا کہ ان کا گھر پاس ہی تھا۔

وہ کوئی جدی پشتی امیر نہیں تھے بلکہ اکرام اللہ نے اپنی محنت اور لگن سے یہ مقام حاصل کیا تھا جس کے بعد ان کے بچے پڑھ لکھ کے معاشرے کے قابل اور عزت دار افراد میں شمار ہوتے تھے۔ چند سال قبل دونوں بڑے بیٹوں نے ملازمت ترک کر کے اپنا کام شروع کیا تھا۔

ارادہ حمدان کا بھی یہ ہی تھا لیکن پھر اس نے بھائیوں سے گزارش کی کہ چند سال اسے اپنی تعلیم اور قابلیت کے مطابق ملازمت کرنے دیں پھر وہ ان کے ساتھ شامل ہوگا۔ اس کی مہارت آئی ٹی کے میدان میں تھی۔ کچھ وقت ملازمت کے بعد اسے بیرون ملک جانے کا موقع ملا تھا جو اس نے گنوایا نہیں۔

وہ اپنے بستر پر لیٹی چھت کو تک رہی تھی اور ساری حسیات تکیے کے پاس رکھے فون کی جانب تھیں جس میں ایک ہی نمبر سے کال آتی تھی اور وہ الماس پروین کا تھا۔ وہ کال کرتیں اور فون اٹھائے بنا رنگ ختم ہونے تک وہ ان کے سامنے کھڑی ہوتی۔ پہلے کالج جاتی تھی تو سہیلیوں سے بات چیت بھی تھی لیکن کالج چھوڑنے کے چند دنوں بعد جیسے سب سے روابط ختم ہو گئے تھے۔ آج سے پہلے کبھی اس نے فون بجنے کا انتظار نہیں کیا تھا۔ باہر کا شور اور ہنگامہ اسے قافلے کی آمد سے باخبر کر چکا تھا۔

فون کی بیل تو نہیں بجی لیکن دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے سمیعہ کی چھوٹی بیٹی حمنہ تھی۔

"مما نے کہا ہے، آپ کے ساتھ مل کر سب کے لیے چائے بنا لوں۔"

وہ دروازہ بند کر کے اس کے ساتھ ہو لی۔ لاؤنج سے آوازیں آ رہی تھیں۔ خوشی سے معمور، چہکتی اور مطمئن آوازیں!

اس نے چائے چڑھائی اور حمنہ بسکٹ، مفنز اور

نمکین پلیٹوں میں نکالنے لگی۔ ذرا دیر بعد ہی ایمل دوڑتی ہوئی آئی۔ وہ گھر میں سب سے چھوٹی تھی، عدنان کی اکلوتی بیٹی اور الماس پروین کی واحد پوتی۔

''آپ یہاں کیوں آگئیں، کتنا مزہ آرہا ہے ادھر۔'' اس نے چپس اٹھا کے منہ میں رکھا۔ ''چاچو سب کے گفٹس دے رہے ہیں۔''

''شروع بھی کر دیا۔'' حمنہ نے منہ پھلایا۔

''میں نے کہا بھی تھا ماموں سے میرے آنے تک وہ بیگ نہیں کھولنا۔''

''وہ آپ کا ویٹ کر رہے تھے لیکن کسی سے صبر نہیں ہو رہا تھا، آپ چلیں نا۔ آمیذن ویدی لے آئیں گی۔''

''تم یہ لے جاؤ، میں آرہی ہوں۔'' اس نے اسے بڑی ٹرے تھماتے ہوئے کہا۔

آمیذن اس وقت ادھر جانا نہیں چاہتی تھی لیکن اگر ابھی حمنہ چلی جاتی تو چائے اسے ہی لے جانا پڑتی۔

''چائے بھی ہو ہی گئی ہے۔'' خلاف عادت اس نے پہل کی۔

''آپ یہ دے آئیں تب تک میں نکال لیتی ہوں۔'' اس نے کپ ٹرے میں قطار سے رکھتے ہوئے کہا۔

''اوکے۔'' حمنہ دوسری ٹرے لیے چلی گئی اور اس نے اس کی واپسی تک حاضرین کی تعداد کے حساب سے گن کے کپ چائے سے بھر دیے۔

''آپ بھی آجائیں۔'' سمیعہ نے ٹرے اٹھاتے ہوئے اسے دعوت دی۔ تینوں بہنوں میں سب سے چھوٹی سمیعہ کا مزاج ماں کے مزاج کے قریب تر تھا۔ وہ بس سر ہلا کے مسکرا دی۔

اس کے جانے کے بعد وہ اپنا کپ لیے وہیں اسٹول پر بیٹھ گئی۔ فون کاؤنٹر پر رکھا تھا۔ الماس پروین کو جانے کب اس کی ضرورت پڑ جائے، کہہ نہیں سکتے تھے سو اس نے سب کے کمروں میں چلے جانے اور لاؤنج میں خاموشی ہونے کے بعد ہی اپنے کمرے میں جانے کا سوچا۔

ایک گھونٹ لینے کے بعد وہ کپ کے کنارے پر انگلی پھیرتی بیٹھی رہی اور چائے یونہی ٹھنڈی ہوگئی۔

کچھ کہانیاں مسلسل بیان ہوتی ہیں، ان کا نہ نقطۂ آغاز ہوتا ہے نہ انجام۔ یہ بھی ایسی ہی رواں داستان تھی جس میں انگلیوں پر گنے جا سکے اتنے لفظوں کی گفتگو اور چند روبرو ملاقاتیں ہی تھیں لیکن ایک لامتناہی سلسلہ تھا خاموش احساسات اور جذبات کا، لحظہ بھر پڑنے والی نظر میں چھپی بے شمار خواہشوں اور نہ ختم ہونے والے خیال و تصور کا۔

اسے یاد نہیں تھا کب وہ اتنا اہم، سب سے اہم ہوا تھا، شاید اس ٹھنڈے چاولوں کی پلیٹ کے ساتھ ہی تاہم اسے دیر سے سمجھ میں آئی اور اس سے بھی تعیق سے اس نے یہ قبول کیا۔

''لگتا ہے بیٹے کی آمد کی خوشی میں آج وہ مجھے بھول گئی ہیں۔'' جانے کتنی دیر بعد اس نے چائے سنک میں انڈیل کے کپ دھوتے ہوئے سوچا۔

فون اٹھا کے جانے ہی لگی تھی کہ حمنہ خالی کپوں کی ٹرے لیے اندر آئی۔

''نانو نے بلایا ہے آپ کو، وہ دراصل فون کمرے میں بھول گئی ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اطلاع دی۔

آمیذن سر ہلاتی لاؤنج کی سمت چل پڑی جہاں الماس پروین، ان کے دونوں بیٹے، بہوئیں، ان کے تین بیٹے، ایک بیٹی، بڑی بیٹی اور نواسی کے ہمراہ سب سے چھوٹے اور چہیتے بیٹے کے ساتھ موجود تھیں۔ چھوٹی شازمہ نہیں آسکی تھی۔ اگلے ایک دو دن میں اس کی آمد متوقع تھی۔

دور سے ہی کچھ قالین پر، کچھ صوفے پر بیٹھے، کھلے بیگ سے نکلا سامان پھیلائے افراد اسے نظر آرہے تھے لیکن اس نے ایک جھلک چرانے کی بھی کوشش نہیں کی اور دبے پاؤں چلتی الماس بیگم کی کرسی کے قریب جا کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے بھی خود

کو بھکنے یا خواہش کے آگے گھٹنے ٹیک دینے کی رعایت نہیں دی تھی۔

اس کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی انہوں نے اشارے سے اسے قریب ہونے کہا۔ اس شور شرابے میں ان کی بات سننے کے لیے وہ ان کے قریب جھک گئی۔

"یہ دونوں بیگ حمدان کے کمرے میں پہنچا دو اور کینڈلز جلا دینا۔" ان کا اشارہ ایک جانب رکھے دو بڑے ٹرالی بیگوں کی جانب تھا۔

ذرا دیر وہ اسی وضع میں ٹھہری رہی کہ آیا وہ مزید ہدایات دیں گی لیکن جب وہ مسکرا کے سامنے دیکھنے لگیں تو وہ بھی سیدھی ہو گئی۔ کمان سی حالت سے تیر بنتے ہوئے اس کی نگاہ اس چہرے پر پڑ ہی گئی، پورے دو سال ڈیڑھ ماہ اور دس بعد۔

☆☆☆

دیوار کے پاس کھڑے بیگ کے دستے کھینچ کے وہ اس کے کمرے کی جانب چل پڑی۔ کوئی اور متوجہ نہیں تھا ورنہ روکتا ضرور یا اس کی مدد کی خاطر کم سے کم ایک بیگ خود لے لیتا اور جس کا رواں رواں متوجہ تھا، اس نے اس کے معاملات میں مداخلت خود پر ممنوع کر رکھی تھی۔

دروازہ کھولنے کے بعد اس نے باری باری ایک ایک بیگ کھینچ کر اندر لیا اور دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔ دونوں بیگ پلنگ کے ساتھ والی دیوار سے لگا کر کھڑے کرتے ہوئے وہ بے خیال سی بیگیج ٹیگ ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگی۔

کچھ دیر بعد خود ہی اپنی بے خودی کا احساس ہوا اور وہ جھٹ ٹیگ چھوڑ کے دور ہوئی جیسے پتا نہیں کیا گناہ سرزد کر بیٹھی ہو۔

اتنی جلدی سب کے درمیان سے اٹھ کے ادھر آنا ممکن تو نہیں تھا پھر بھی وہ عادتاً محتاط تھی۔ وہ پلٹ کے کنسول میز کے پاس آئی۔ شیشے کے خوبصورت نقش والے چھوٹے سے مرتبان میں حرارت سے خالی زردی مائل سا موم منجمد تھا۔

سمیعہ کی منجھلی بیٹی ناجیہ نے کینڈل میکنگ شوقیہ شروع کی تھی اور پھر یہ کام اتنا پسند آیا کہ سنجیدگی سے اسے اپنا پیشہ بنا لیا۔

اس نے خوشبودار موم بتی کا پہلا تحفہ اپنے ماموں کو دیا تھا اور بھانجی کے بعد انہیں استعمال کرنے کا دوسرا شوق ماموں کو لاحق ہوا تھا۔ دراز سے لائٹر نکال کر اس نے موم کی سطح کے اوپر گردن نکالے جلنے کے لیے اپنا آپ پیش کر رہی ڈور میں شعلہ بھڑکا دیا۔ ونیلا کی نہایت ہلکی اور مسحور کرنے والی مہک کمرے کو بھرنے لگی۔ یہ کیک جیسی میٹھی اور تیز نہیں بلکہ دھیمی اور مسکن تھی۔

گھر میں رہتے ہوئے سب ہی باتیں اس کے کانوں میں پڑتی تھیں۔ حمدان نے اس مخصوص مہک کے لیے ناجیہ کی کتنی کوششیں رد کی تھیں پھر کئی 'ٹرائل' کے بعد اس خوشبو کو پاس کیا تھا۔

آج سے پہلے اسے کبھی خیال نہیں آیا تھا لیکن اس وقت خوشبو نے جیسے دل و ذہن میں جھما کا کیا۔

چھوٹی بھابھی ایمل کی سالگرہ کے دن کیک بنا رہی تھیں۔ باورچی خانے میں الیاس بیگم کا کھانا بنانے کے علاوہ وہ اکثر کام کی زیادتی یا وقت کی کمی کی صورت میں سکینہ خالہ اور ان کی بیٹیوں کا ہاتھ بٹا دیتی تھی۔

وہ بھی ایسا ہی دن تھا سالگرہ کے اہتمام میں بن رہی بریانی، قورمے اور کباب کی تیاری میں سب ہی بھاگ بھاگ کر کام کر رہے تھے۔ وہ سلاد اور رائتہ بنا رہی تھی۔ چھوٹی بھابھی کے ہاتھ سے ونیلا ایسنس کی شیشی پھسلی، انہوں نے گرتی شیشی پکڑنے سنبھالنے کی کوشش کی اور وہ جانے کیسے پاس کھڑی آمیدن نے دوپٹے اور دامن پر الٹ گئی۔ فرش پر گرنے سے پہلے شیشی اپنے لوازمات اس پر خالی کر چکی تھی۔ ونیلا کی میٹھی اور تیز خوشبو سارے باورچی خانے میں بھر گئی۔

اس نے ہاتھ روک کے وہیں سنک میں دوپٹا اور کرتے کا دامن دھویا تا کہ داغ نہ لگے۔

"انہیں فوراً اتار کے ڈٹرجنٹ میں ڈال دو۔" بھابھی نے مشورہ دیا۔

"جی۔" اسے بھی یہی مناسب لگا۔ وہ باورچی خانے سے باہر نکلی ہی تھی کہ فون بجنے لگا۔ اس نے دوپٹا اور دامن مزید قوت لگا کے نچوڑا، تین چار بار ہوا میں جھٹکا اور جب یقین ہو گیا کہ ان سے پانی کی بوندیں نہیں ٹپکیں گی تو الماس پروین کے پاس پہنچی۔ اس کے وجود سے ونیلا کی ہلکی مہک اب بھی آ رہی تھی۔

"مینو کو لے کر جاؤ اور حمدان کے روم کی صفائی کر دو" اس کی جانب دیکھے بنا انہوں نے حکم دیا۔

اس کا مطلب تھا وہ آج آ رہا تھا۔

اسے گیلے کپڑے بھول کر مینو کے ساتھ جانا پڑا۔ مینو تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔ اسے بھی احساس تھا باورچی خانے میں کافی کام ادھورا ہے۔

"آپ چادر اور غلاف بدل دیں گی پلیز۔" جب اس نے التجا کی۔

"میں کر لیتی ہوں۔ تم جاؤ۔" وہ مسکرا کے مان گئی۔ یہ پہلا اور آخری کام تھا جو اس نے اس کمرے میں کیا تھا۔

چوں کہ حمدان فی الوقت گھر میں موجود نہیں تھا اس لیے وہ اپنی رفتار سے کام کر رہی تھی۔ چادر بچھا کے اس نے تکیے کے غلاف بدلے اور میلی چادر اور غلاف لے کر باہر آ گئی۔ کچھ دیر بعد یاد آیا کہ وہ فون بھول گئی ہے۔ واپس کمرے میں آ کر فون ڈھونڈا جو پلنگ کے نیچے چلا گیا تھا۔ فون لے کر وہ کھڑی ہوئی تو دروازے میں حمدان کھڑا تھا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی اور رک گئی۔ راستہ مسدود تھا۔ حمدان ایک سمت ہوا اور وہ اس کے بازو سے گزر کر چلی گئی۔

"ونیلا!" وہ دھیرے سے بڑبڑائی اور باقی دو موم سے بھرے مرتبان کے کناروں پر انگلی پھیری۔

اچانک ہوا کے یخ جھونکے نے کھڑکی سے اندر آ کر شوں شاں کا شور مچایا اور اس نے بدن میں بھری ٹھنڈ کے جواب میں بے ساختہ ہاتھ باندھ لیے۔ اسے یاد آیا کہ وہ کافی دیر سے یہاں موجود ہے۔ اس خیال کے بعد وہ بتیاں بجھا کے تیزی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔

جب اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا تو لاؤنج سے آوازیں آ رہی تھیں۔ کیا پتا، چائے کے اگلے دور کی طلب ہو تو پھر اس کے دروازے پر دستک ہو۔ اس بار وہ بستر پر لیٹی تو ذرا دیر قبل کی طرح اس کا دھیان متوقع بلاوے کی طرف نہیں تھا۔ اس کی سبز آنکھیں بھیگی بھیگی سی تھیں۔

☆☆☆

چار بجے جب وہ سب کے درمیان سے اٹھا تو سمیعہ اس کے ساتھ کمرے تک آئیں۔

"آئینہ اور تمہاری لڑائی ہوئی ہے؟"

"نہیں۔" وہ اس سوال کی امید رکھتا تھا لیکن اتنی جلد نہیں۔

"حق ہا!" انہوں نے لمبا سانس آزاد کیا۔

"یعنی لڑائی سے بڑی بات ہے ورنہ تم پوچھتے، میں یہ سوال کیوں کر رہی ہوں۔"

وہ دھیرے سے ہنسا۔

"مجھے آئینہ کے فضول اندیشوں کا علم ہے، آپ زیادہ جاسوس نہ بنیں۔"

"یعنی اس بار شہنائیاں بجوا کے جاؤ گے۔" ان کی فکر کسی قدر کم ہوئی۔

"یہ تو آپ سب طے کریں گے۔ شہنائیاں، ڈھول یا کچھ اور۔" اس نے اصل جواب گول کرتے ہوئے کمرے کا دروازہ کھولا۔

"آں!" سمیعہ نے لمبی سانس اندر کھینچی۔

"امی کتنا خیال رکھتی ہیں۔" ان کا اشارہ۔ استقبال کر رہی خوشبو کی طرف تھا۔ اس کے چہرے پر تشکر بھرا تبسم بکھر گیا۔

"آرام کرو، شب بخیر۔" انہیں بھی اب نیند آ رہی تھی۔

"شب بخیر۔" وہ چلی گئیں اور حمدان اندر آیا۔

دروازہ بند کر کے اس نے بتیاں نہیں جلائیں۔ ہلکی سی سنہری روشنی اور دریچے سے آرہی چاندنی کی مہربانی تھی کہ کمرے کی ہر شے دکھائی دے رہی تھی۔ دروازے کے پاس رک کے ہی اس نے پہلے کنسول میز پر دھری جلتی موم بتی کو دیکھا پھر دیوار سے لگے بیگوں کو۔

کئی بار ہم خود کو کچھ زیادہ ہی بہادر اور سمجھ دار سمجھ لیتے ہیں اور اس سے بڑی غلطی دل اور جذبات کو زنجیریں ڈال کے زیر کر لینے، ان کی بغاوت کچل دینے کا زعم پال کے کرتے ہیں اور وہ یہ دونوں غلطیاں منگنی والی شب سے پہلے بڑی کامیابی سے کر رہا تھا۔

آگے جاکے اس نے بیگ اٹھا کے پلنگ پر رکھا اور کھول کر تبدیل کرنے کے لیے کپڑے نکالے۔ موسم سرد تھا اور اب نیند بھی آرہی تھی لیکن وہ نہانے چلا گیا۔ باہر نکل کے شیشے کے سامنے بال تولیے سے رگڑتے ہوئے اس کی نظر عکس میں اپنے پیچھے پڑی۔ اس نے پلٹ کے دیکھا اور کنسول میز کے پاس آیا جہاں ٹرے کے اس طرف فون دھرا تھا۔ اس نے پہلے ہتھیلی گھما کے موم بتی بجھائی اور مرتبان ڈھانکا پھر فون اٹھایا۔ اسے دیکھے، کھولے بنا بھی علم تھا کہ وہ کس کا فون ہے۔ فون مقفل نہیں تھا۔ کچھ دیر وہ یونہی ہاتھ میں لیے کھڑا رہا پھر واپس اسی جگہ رکھ دیا۔

☆☆☆

الماس پروین کے بھائی فراز احمد کو اپنی جوانی میں وکالت کے ساتھ ساتھ نیا نیا شاعری اور فارسی سیکھنے کا شوق چرایا۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے، خام اشعار کی صحت یابی کے لیے انہوں جس سے بھی ایک استاد اور اصلاح کار کا پوچھا سب نے انہیں کریم الدین کا پتا بتایا۔ کریم الدین کی پنساری کی دوکان تھی۔ طب پڑھ رکھا تھا یا بزرگوں سے سیکھا تھا جو اب وہ جڑی بوٹیوں سے خود بھی مریضوں کا علاج کرتے تھے۔ ان کے پاس تعلیم کی کوئی سند نہیں تھی لیکن مطالعے کا شوق اور شاعری کا ذوق رکھتے تھے، خود بھی فارسی اشعار کہتے تھے۔ شہر کے بہت سے نئے شاعر اصلاح اور رہنمائی کے لیے ان کے پاس جاتے تھے اور نوجوانوں میں یہ ذوق وشوق دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے اور پورے جوش سے ان کی مدد کرتے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں میں استاد جی کے نام سے مقبول تھے اور ان کے جاننے والوں اور اپنے محلے میں وہ غربت کے باوجود بڑے محترم اور باعزت تھے۔

آئے تن ان کی بیٹی تھی جسے اپنے ابا کی طرح شاعری سننے کا اور پڑھنے کا شوق تھا۔

فراز احمد، آئے تن کو دیکھتے ہی دل ہار بیٹھے تھے۔ اپنے نام کی طرح جس کا حسن بھی یکتا تھا۔ بھورے بال، کندنی سبز آنکھیں اور گلابوں کی ہلکی سرخیوں کو مات دیتی رنگت پر کسی ماہر بت تراش کے ہنر کا ثبوت جیسے نقوش۔ پہلی نظر ہی انہیں بت بنا گئی تھی۔

انہوں نے والدین سے پہلے بہن سے حال دل بانٹا اور انہوں نے بہن ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے والدین کو منا لیا جو آسان نہیں تھا کہ ان کے اور آئے تن کے خاندان کا کوئی میل نہیں تھا۔ ان کے نزدیک اپنے والدین کو منا کر انہوں نے بھائی کے لیے محبت کی جنگ جیت لی تھی۔ اب فراز احمد کی خوشیوں میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

انہیں کیا کسی کو بھی شک نہیں تھا کہ فراز احمد کے رشتے کو انکار ہو جائے گا۔ آئے تن کا رشتہ بچپن سے کزن بابر کے ساتھ طے تھا جو ان ہی کے ساتھ رہتا تھا۔

اس جواب سے ان کے والدین مطمئن ہو گئے تھے یہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہوا لیکن بھائی کی منتیں اور بے قراریاں دیکھ کر وہ خود آئے تن سے بات کرنے پہنچیں۔ انہیں یقین تھا وہ بھائی کا حال دل سنا کر اسے قائل کر لیں گی۔ انہیں لگتا تھا آئے تن سے پوچھے بنا، اسے اس رشتے کا بتائے بغیر ہی کریم الدین نے انکار کر دیا ہے۔

"آپ سچ کہہ رہی ہوں گی لیکن میری شادی

طے ہو چکی ہے۔" اس کے حسن نے انہیں بھی مبہوت کر دیا تھا۔

"ہوئی تو نہیں ہے نا اور فراز جیسی محبت تمہیں کوئی نہیں دے سکتا۔ وہ تمہیں ہاتھ کا چھالا اور دل کی رانی اور اپنے عالیشان گھر کی ملکہ بنا کے رکھے گا پاگل ہے وہ تمھارے پیچھے، کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دے گا، تمھارے منہ سے نکلنے سے پہلے ہر خواہش پوری ہو گی تمھاری۔" انہوں نے سارے لالچ ایک جملے میں سموئے۔ ان کی بات پر وہ دھیمے سے مسکرائی تھی۔

"اگر ایسا ہے تو ان سے کہیں جس سے میری شادی طے ہے میں بھی اس کے پیچھے پاگل ہوں، وہ سمجھ جائیں گے۔"

جب انہوں نے بابر کو دیکھا تو وہ کہیں سے بھی فراز سے بہتر نہیں تھا۔ یہ دونوں کی پسند سے ہوا رشتہ تھا۔ وہ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کرتا تھا، ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ انہیں اس حسین اور مغرور لڑکی پر بہت غصہ آیا۔ انہیں لگا وہ اس طرح فراز احمد کو تڑپا تڑپا کر اپنی انا کی تسکین کر رہی ہے، اس سے اس کا غرور مطمئن ہو رہا ہے۔

فراز احمد اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ اور اس کے مہینہ ڈیڑھ مہینہ بعد آئے تن کی شادی ہو گئی۔

سب نے سوچا تھا چند دن بعد محبت کا خمار اور بخار اترے گا تو لوٹ آئیں گے لیکن وہ بس والدین کی وفات پر آئے۔ کسی کی شادی میں بھی شامل نہیں ہوئے اور ان سب کی ذمہ دار آئے تن تھی۔ اس نے نہ صرف ان کا بھائی دور کیا تھا بلکہ اسے سراپا بدل دیا تھا۔

کچھ سال بعد جب انہوں نے وہیں کینیائی مسلم خاتون سے شادی کر لی تو وہ بری طرح ٹوٹ گئیں۔ کہاں وہ ایک حسین کے اسیر ہوئے تھے اور اب ان کا دل اور طبع نازک اس قدر جذبات اور احساسات سے عاری تھے کہ وہ ایک سیاہ فام سے شادی کر بیٹھے تھے۔ انہیں لگا ان کا بھائی خود کو محبت کی لاحاصلی کی سزا دے رہا ہے، خود سے ہی اذیت بھرا انتقام لے رہا ہے۔ آئے تن سے ان کی نفرت بڑھ گئی جو وقت کے ساتھ بڑھتی گئی۔ ایک عام سے انسان کے لیے جس نے ان کے ہیرے جیسے بھائی کو ٹھکرایا تھا۔ انہیں بھائی کا دکھ اور ویران دل جتنا یاد آتے، آئے تن کے لیے جذبات اتنے ہی منفی ہوتے جاتے۔

پہلے انہیں بابر کی وفات کی خبر ملی اور اس کے کچھ وقت بعد آئے تن کی۔ انہیں علم تھا کہ اس کی ایک بیٹی ہے۔ سال ڈیڑھ سال بعد پتا چلا کہ آئے تن کے والد بہت زیادہ بیمار ہیں۔ اسی دوران برسوں بعد فون پر انہوں نے فراز احمد کی آواز میں آئے تن کا نام سنا۔

"آپا آئے تن کی بیٹی اس کے بھائی کے گھر بڑے برے حال میں ہیں، استاد جی کا بیٹا ان جیسا نہیں اور ان کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں اگر آپ اسے گھر لے آئیں یا کوئی بہتر انتظام کر دیں تو مجھ پر بڑا احسان ہو گا۔"

ایک بار پھر وہ بھائی کی بات ٹال نہیں سکیں اور بھائی کی محبت میں، اس کی خواہش پوری کرتے ہوئے ان کی نفرت کو نشانہ مل گیا۔ فراز احمد کی یہ التجا ان کے سارے خیالات کی تصدیق تھی کہ وہ آئے تن کا دیا زخم دل سے لگائے ہیں۔

پہلی بار جب انہوں نے آمیدن کو دیکھا تو گنگ رہ گئیں۔ انہیں لگا ان کے سامنے آئے تن کا لڑکپن ہے۔ وہ اپنی ماں کا پرتو تھی۔ وہی گلابی رنگت کہ ہاتھ لگانے سے میلی ہونے کا خدشہ ہو، کندنی سبز آنکھیں، سلیقے سے تراشے گئے نقوش، سحر زدہ کرنے والا تبسم۔ وقت کے ساتھ اس کے انداز، چال ڈھال سب کچھ آئے تن جیسے ہوتے گئے۔ مانو وہ اُسے ہی جوان ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر انہیں لگتا سامنے وہی ہے، ان کے ہیرے جیسے بھائی کو، اس کی ہمراہی اور ایک پر آسائش زندگی کو ٹھکرا کے ان کے

فراز احمد کو ان سے دور کرنے والی، فراز احمد کے دکھ اور ان کے بن باس کی وجہ اور ہر گزرتے پل کے ساتھ اس لڑکی کے لیے ان کا دل پتھر ہوتا گیا۔ پہلے پہل انہوں نے ان احساسات سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی کہ وہ بچی ہے، معصوم ہے مگر وقت کے ساتھ جب وہ دوسری آئے تن میں ڈھلتی گئی تو ان احساسات کو جھٹکنا ناممکن ہو گیا۔ اس کی موجودگی ان کے بھائی کے ہرے زخموں کا ثبوت تھی ورنہ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں زندگی گزارتے فراز احمد کو کیا پڑی تھی۔

انہیں بھائی کی بات اور خواہش کا مان بھی رکھنا تھا کہ وہ لڑکی دربدر نہ ہو، محفوظ رہے، اسے پناہ گاہ میسر ہو، وہیں اپنی نفرت اور اس کی ماں سے ملا دکھ بھی نہ کم ہوتا تھا نہ بھولتا تھا۔ برسوں بعد بھائی نے دوسری بار ان سے کچھ مانگا تھا پہلی دفعہ تو وہ ناکام رہی تھیں اور اس بار وہ چاہتی تھیں تو بھی انہیں مایوس نہیں کر سکتی تھیں۔ ان دو متضاد اور مشکل احساسات میں توازن رکھتے رکھتے ان کا رویہ اس کے ساتھ یوں ہو گیا کہ انہوں نے اس کی مادی اور دنیاوی ضرورتوں میں کوتاہی نہیں کی لیکن اسے کوئی جذباتی سہارا دیا نہ جذباتی رعایت اور سہولت دی۔ اس کی حیثیت، مقام اور اپنی نفرت ہر ہر قدم اور ہر عمل سے اسے باور کروائی۔

اسے اپنی ہر نظر اور انداز سے سمجھایا کہ ان کی نظر میں وہ بھی ان حسرتوں اور محرومیوں کی حق دار ہے جو اس کی ماں کی وجہ سے ان کے بھائی کا مقدر بنی تھی۔ خوشی اور دل کے سکون پر اس کا کوئی حق نہیں تھا نہ کسی الفت بھری رفاقت کا۔

☆☆☆

اگلے دن سب ہی دیر تک سو رہے تھے لیکن الماس پروین سب سے پہلے اٹھ گئی تھیں۔ وہ لان میں نکلیں تو آئیڈن وہیں ٹہل رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ اس کا خیال تھا، ان سمیت کوئی بھی اتنی جلدی نہیں جاگے گا۔

"ناشتہ۔" انہوں نے تنفر بھرا ایک لفظی حکم جاری کیا اور وہ باورچی خانے میں آ گئی۔

اپنے سارے کام انہوں نے جب اس کے سپرد کیے تو سب ہی حیران تھے کہ گھر میں سکینہ خالہ پکانے پر مامور تھیں۔ یہ بات انہوں نے اس سے نہیں سکینہ خالہ سے ہی کہی تھی۔

"اب سے کچن کے میرے کام تم نہیں یہ کرے گی۔" ان کا اشارہ بلاوے پر قریب کھڑی آئیڈن کی سمت تھا۔

"آٹا گوندھنے سے لے کر میرے لیے سبزی گوشت یہ ہی صاف کرے گی اور پکائے گی بھی۔ ہفتہ بھر میں اسے سب سکھا دو۔"

وہ شوقیہ ہی باورچی خانے میں سکینہ خالہ اور بالی کا ہاتھ بٹاتے ہوئے کافی کچھ سیکھ چکی تھی۔ تاہم اس کے بعد اس کی باقاعدہ 'ٹریننگ' شروع ہوئی تھی۔

جب اس نے ناشتے کی ٹرے میز پر ان کے سامنے رکھی تو ہال میں ان کے علاوہ حمدان بھی موجود تھا۔ وہ پلٹ ہی رہی تھی کہ اٹھ کے اس کی طرف بڑھ چکے، چار قدم دور حمدان کی وجہ سے رک گئی۔ پہلی بار اس پر گھبراہٹ سوار ہوئی۔

"یہ شاید کمرے میں رہ گیا تھا۔" اس نے آگے آ کر فون میز پر رکھا تو وہ چونکی۔ اسے تو یاد بھی نہیں تھا کہ فون اس کے پاس نہیں ہے۔

"اچھا ہی ہوا، میں نے آج فون نہیں کیا ورنہ حمدان کی نیند خراب ہوتی۔" انہوں نے لہجے سے ہی اسے اس کا قصوروار ٹھہرایا جو ہوا ہی نہیں تھا۔

اس نے فون اٹھاتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں فون اٹھایا اور چوں کہ اس کی غفلت کی وجہ سے فون اس تک پہنچانے کی تکلیف وہ اٹھا چکا تھا اور نیند خراب ہونے کی تکلیف سے بچ گیا تھا، اس نے سب کی معافی اس سے بھی مانگ لی اور جانے کیسے آج اس کی نظر حمدان کی سمت اٹھ گئی۔

"سوری۔" اس میں آخر الذکر کی بھی معذرت

تھی۔

حمدان نے کچھ کہا نہیں لیکن آج وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔ آمیدن رفتار پکڑ چکی دھڑکنوں پر یوں گھبرائی مانو آواز کمرے میں گونج رہی ہو۔

"پہلی بار" سب کے لیے اور سب کا ہوتا ہی ہے۔ پہل ہمت سے مشروط ہے جس کی اس میں کمی پہلے بھی نہیں تھی تو اب کیا بدلا تھا؟

وہ سہا دل سنبھالتی ایک طرف کھڑی ہوگئی کہ ان کا ناشتہ ختم ہونے سے پہلے وہ وہاں سے جا نہیں سکتی تھی۔

"تم بھی کرلو ناشتہ۔" انہوں نے وہیں کرسی سنبھال چکے حمدان سے کہا۔

"نہیں امی! سب کے ساتھ کروں گا ویسے بھی بھوک ابھی نہیں ہے۔" وہ سامنے اخبار پھیلائے تھا۔

"میرا ارداہ ہے پرسوں آئینہ کے یہاں ہو آئیں لیکن اس سے پہلے ہم خود سب اتفاق سے شادی کی کوئی دو تین تاریخیں ذہن میں رکھیں پھر ان سے بات کریں گے۔"

"جی۔" اس نے اپنی توجہ اور نظر اخبار پر ہی رکھی۔ انہوں نے ایک تفصیلی نظر بیٹے پر ڈالی۔ آئینہ کی بات انہوں نے رد کردی تھی اور وہی ان کا یقین بھی تھا کہ ان کے بیٹے کی زندگی اور دل میں کوئی دوسری لڑکی نہیں ہے مگر اس وقت اس کے سرسری انداز نے انہیں ٹھٹکا دیا۔

"تم نے کوئی تاریخ یا خاص دن وغیرہ سوچا ہے؟"

"نہیں۔" اسی اخبار میں گم انداز میں اس نے انکار کیا۔

"دو سال کافی نہیں تھے؟ کیا تم مزید رکنا چاہتے ہو؟" وہ رکا تو تھا تاہم وجہ وہ انہیں بتا نہیں سکتا تھا۔

"ایسا کب کہا میں نے؟" اس نے ماں پر ایک نظر ڈال کے صفحہ پلٹا۔

پیچھے کھڑی آمیدن یہ سب سننا نہیں چاہتی تھی لیکن کانوں پر ہاتھ رکھنا بھی ممکن نہیں تھا۔

"تو بتاؤ کون سا دن اور تاریخ رکھیں۔" وہ اسے اس گفتگو میں فعال کردار ادا کرتے دیکھنا چاہ رہی تھیں۔

"امی! میں لمبے وقت کے لیے یہاں ہوں آپ اتنی جلد بازی نہ کریں جیسے میں بس ابھی چلا جاؤں گا۔" اب کے اس نے ان کی سمت دیکھتے ہوئے مسکرا کے بات مکمل کی۔ وہ نہال ہوگئیں۔

"آج پہلا ہی دن ہے۔"

"جیتے رہو۔" انہوں نے گردن ذرا ترچھی کی لیکن مڑ کر اسے دیکھا نہیں۔

"چائے ٹھنڈی ہوگئی ہے۔ دو کپ لانا۔"

ان کی بات کا مفہوم سمجھتے ہوئے وہ دوسری طرف سے ان کے قریب آئی اور میز سے ٹرے اٹھالی۔

دو کپ تازہ چائے بنا کر وہ واپس آئی اور لاؤنج کے دروازے پر ہی قدم رک گئے۔

"جو بھی بات ہے بیٹا صاف کہو۔"

"امی میں آئے۔" چھناکے کی آواز میں اس کا جملہ گم ہوگیا۔

وہ دونوں ایک ساتھ پلٹے۔ ٹرے چھوٹ کر زمین بوس ہوئی تھی، کپ کی چائے فرش پر بکھری تھی اور کپ ٹوٹ گئے تھے لیکن وہ ٹرے تھامنے کے انداز میں ہاتھ فضا میں معلق لیے کھڑی تھی۔ اسے دائیں پنجے پر گری گرم چائے کا بھی احساس نہیں تھا۔

"کیسے گرادیا؟" الماس پروین نے درشتی سے جواب طلب کیا۔

اسی وقت سکینہ خالہ اور بالی باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے اسے یوں دروازے میں بت بنی دیکھ کر اس طرف آئیں۔

"اوہو! کوئی بات نہیں بالی صاف کردے گی، آپ دوسری چائے بنالیں۔" سکینہ خالہ ماجرا سمجھ گئی

تھیں۔ انہوں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کے کہا تو وہ ہاتھ گرا کے فرش کو ہی دیکھتی رہی۔

''بیٹھیں امی!'' حمدان نے انہیں تھام کے واپس بٹھایا اور سر جھکائے کھڑی آمیدئہ ن کو دیکھا۔

''میں کہہ رہا تھا کہ میں آیا ہی یہ سوچ کر ہوں کہ کوئی ایکسائٹنگ اور انٹرسٹنگ پروجیکٹ ملا تو ہی اوور سیز جاؤں گا ورنہ نہیں۔'' اس نے ضروری دو لفظوں پر زور دیا تھا۔ جملے کے اختتام پر گھوم کے میز کے دوسری طرف جاتے ہوئے اس نے اسے دیکھا جس کے ساکت وجود میں حرکت ہوئی تھی۔ وہ ان دونوں کی سمت دیکھے بنا واپس پلٹ گئی۔ حمدان کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا۔

''یہ تو بڑی خوش خبری سنائی تم نے۔'' ان کی مکدر ہوئی طبیعت یکا یک بشاش ہوگئی۔

کچھ دیر بعد سکینہ خالہ خود ہی فرش صاف کر رہی تھیں۔

باورچی خانے میں دوبارہ چائے بناتے ہوئے وہ ذرا دیر پہلے والی کیفیت سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پل بھر میں اپنی دور تک اڑان بھر چکی سوچ اب اسے شرمندہ کر رہی تھی۔ بالی اسے سنا رہی تھی کہ کس طرح آج نمو اسکول کی چھٹی کرنے پر بضد تھی کہ ان کے ساتھ یہاں آسکے جو وہ غائب دماغی سے مسکرا کے سنتی رہی۔

جب وہ نئی ٹرے اور نئے کپ لیے پھر ادھر آئی تو باقی لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ آج شازمہ اور ان کے بچوں نے آنا تھا اور اس وقت وہی گفتگو کا مرکز تھے۔

☆☆☆

ہر سو خوشی کا ماحول تھا سوائے اس کے دل کے جس کے لیے اور جس کی وجہ سے یہ سارا اہتمام تھا۔ اس سے پہلے اسلم اور عدنان کی منگنی نہیں ہوئی تھی۔ رشتہ پکا ہونے کے بعد سیدھا شادی کی تقریب رکھی گئی تھی لیکن حمدان چونکہ بیرون ملک جا رہا تھا وہ بھی لمبے عرصے کے لیے، اس لیے یہ تقریب لازمی ہوگئی تھی اور اب بچے اتنے بڑے اور سمجھ دار تھے کہ انہوں نے ماموں اور چاچو کی منگنی کا شور ڈال رکھا تھا۔

رنگیں، آنچلوں اور سنگھار سے بھرے چہروں کے بیچ گہرے سبز آنچل اور کاجل لپ اسٹک سے مزین چہرے پر سجی ہیزل گرین آنکھوں والی وہ لڑکی اس کے دل میں جو کسک اور میس جگا رہی تھی، اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کی آنکھوں کا مخصوص شیڈ جاننے کے لیے اس نے کتنے جتن کیے تھے یہ بھی وہی جانتا تھا۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اس سے دور رہنا، اسے بے خبر رکھنا، دنیا کو بھنک بھی نہ پڑنے دینا، یہ سب اس کے انتخاب تھے۔

خوش باش اور ہنستے مسکراتے عنقریب دولہا بننے کے لیے کسی وعدے میں مقید ہونے والے اس شخص کی محرومی اور نقصان کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا تھا۔

آج وہ بھی سب کے ساتھ باتیں کرتی مسکراتی نظر آرہی تھی۔ جب گھر کے ملازمین بن ٹھن کے شامل تھے تو اس کا شامل نہ ہونا کیسے ممکن ہوتا۔

وہ لوگ آئینہ کے یہاں سے گھر پہنچے تو سب ہی تھکے تھے، جلد سو گئے لیکن اس کے احساس اور جذبات کی تھکن کے مقابلے میں جسمانی تھکن بڑی معمولی تھی سو وہ جاگ رہا تھا۔ کافی بنانے کے ارادے سے وہ اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ چونکہ اس کے لیے کھلے لان میں لاؤنج اور باورچی خانے کے درمیانی روش سے گزرنا پڑتا تھا، اس نے نئی نئی تحفتاً ملی شال اٹھا کے شانوں پر پھیلا لی۔

آگے بڑھ جانے کے بعد اسے احساس ہوا کہ شاید اس طرف کوئی ہے۔ وہ ٹھہر گیا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ادھر کوئی جاتا ہی نہیں تھا کجا کہ اس پہر کوئی موجود ہوتا۔ لیکن پھر اس کے قدم باورچی خانے میں داخل ہونے کے بجائے عقبی حصے میں جانے والی چھوٹی سی گلی کی سمت اٹھ گئے۔

وہ سب کے کمروں میں بند ہوتے ہی ادھر چلی

آئی تھی۔ متروک ہو چکے زینے کی آخری سیڑھی پر اس کا سردی سے کانپنا باقی تھا لیکن وہ کمرے میں نہیں جانا چاہتی تھی، اسے وہاں کا آرام اور حدت نہیں چاہیے تھی۔ وہ جیسے موسم کی زیادتی برداشت کرتے ہوئے وقت اور مقدر کی زیادتی سہنے کی مشق کر رہی تھی۔ آج اس کے ضبط وصبر، عقل وفہم، مصلحت و فراست کے سارے بندھ اور بھرم ٹوٹ گئے تھے۔

جس کا حصول اس نے گمان کے آس پاس پھٹکنے بھی نہیں دیا تھا، یکا یک اس کے چھن جانے کا احساس اسے خالی کر گیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا اس کا سب چھن گیا ہے، جینے کی وجہ، سانسوں کی آمدورفت کا پروانہ، ہنسنے مسکرانے کی اجازت، سب کچھ۔ اپنے ماں باپ اور نانا کی وفات کے بعد آج وہ اس قدر شدت سے رو رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے خود کو سنبھالے وہ اب ہلکے ہلکے لرز رہی تھی۔ دفعتاً اس کی نظر سامنے کھڑے حیرت سے بت بنے حمدان پر پڑی اور اسے لگا وہ اس کا تصور ہے۔ آنکھوں میں حسرت اور ارمان گڈمڈ ہوئے اور اپنا المیہ اس بری طرح دل کے آر پار ہوا کہ وہ مزید تڑپ کے رونے لگی۔ حمدان بے اختیار دو قدم آگے آیا اور آمیذان بت بن گئی۔ وہ مجسم سامنے تھا تصور نہ تھا۔

"اوہ آمیذان!" حمدان نے بایاں ہاتھ اٹھا کے بالوں میں پھنسایا۔

یہ انکشاف اس کے اب تک کیے گئے کتنے ہی فیصلوں کی بنیاد ہلا گیا تھا۔ ان دو لفظوں میں اپنی بے خبری کا افسوس، بے وقوفی کا پچھتاوا اور اس کے 'ہم سفر' ہونے کا دکھ تھا کیونکہ یہ سفر تنہا زیادہ سہل تھا۔ اپنی نارسائی قابل برداشت تھی اس کی نہیں۔

وہ ہوش میں آ کے کھڑی ہوئی۔ یکا یک ٹھنڈ کا احساس بڑھ گیا تھا۔ شیفون کا دوپٹا ناکافی سے بھی کم تھا۔ اب وہ باقاعدہ کانپ رہی تھی۔ حمدان سبک خرامی سے اس کے سامنے آ کے رک گیا۔ اس کے سرخ ہونٹوں اور بھیگے گلابی چہرے پر یخ ہوائیں مزید ستم ڈھا رہی تھیں۔ اس نے اپنی شال اتار کے اس کے گرد پھیلائی۔

وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ یہ دن کبھی نہیں آنا تھا، یہ قربت ناممکنات میں سے تھی، یہ التفات گمان سے پرے تھے۔ وہ پچھتا رہی تھی، حمدان پچھتا رہا تھا لیکن دونوں پچھتاووں کی نوعیت مختلف تھی۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے شال کو پھسلنے سے روکا۔ چند پل اسے ساری ہمت مجتمع کرنے میں لگے تھے اور پھر وہ یہ اس کے بازو سے گزر کے وہاں سے چلی گئی۔

دم سادھے کھڑا حمدان بے جان سا اس کی جگہ بیٹھ گیا۔ اسے نہ سرد ہواؤں کا ہوش تھا نہ کسی کے آ جانے یا دیکھ لینے کا ڈر۔ اس شب نے بس آمیذان کے آنسو دیکھے تھے لیکن رویا حمدان بھی تھا۔

"چاچو!" پیچھے سے ارقم کی تعجب بھری آواز ابھری تو وہ چونکا اور ماضی کا وہ منظر آگہی تحلیل ہو گیا۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" اس جانب کوئی نہیں آتا تھا۔

"سوچا، دیکھوں تو ادھر کیا ہے۔" وہ اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کے مسکرایا۔ ارقم کو اب بھی اس جگہ آنے کا تجسس سمجھ میں نہیں آیا لیکن یہ اتنا غور و فکر کرنے والی بات نہیں تھی۔

"ادھر سب آپ کا پوچھ رہے ہیں۔"

"چلو۔"

☆☆☆

ابھی اسے آئے تین دن ہی ہوئے تھے۔ گھر میں آپس میں مشورے اور صلاح چل رہی تھی کب آئینہ کے گھر جایا جائے کہ ادھر سے خبر آ گئی۔ آئینہ نے منگنی توڑ دی ہے۔ اس نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔

وہ سب اس کے سر ہو گئے۔ الماس پروین نے تب تو آئینہ کی بات چٹکیوں میں اڑا دی تھی لیکن اب انہیں یقین ہو رہا تھا ضرور ویسی ہی کوئی بات ہے جس کا شبہ اس نے ظاہر کیا تھا کیوں کہ حمدان ایک دم پرسکون تھا۔ اسے منگنی ٹوٹنے کا افسوس نہیں تھا نہ ہی وہ

سب کو دکھانے کو ہی افسوس کا ڈرامہ کر رہا تھا۔ جیسے یہ عین اس کی مرضی کے مطابق ہوا ہو۔
"ہماری طرف سے تو کوئی پابندی تھی نہ زبردستی۔ اگر تمہیں کسی اور میں دلچسپی تھی تو بتایا کیوں نہیں؟" اسلم بھائی نے پوچھا۔
"ایسی کوئی بات ہوتی تب بتاتا نا بھائی۔"
"دو سال کی انگیجمنٹ کوئی بھی لڑکی یونہی نہیں توڑ دیتی۔" بھابھی کی بات غلط بھی نہیں تھی۔
"میں شاید ان دو سالوں میں اس کی امیدوں پر پورا نہیں اتر پایا ہوں۔"
"وہی تو سوال ہے کیوں؟" شازمہ نے پوچھا۔ اس کے پاس انہیں دینے والا جواب نہیں تھا۔ بس بے بسی سے شانوں کو حرکت دے کے رہ گیا۔
"تمہاری جنریشن تو ہماری طرح نہیں۔ روشن خیال ہو، سب کچھ ہی آپس میں ڈسکس کر لیتے ہو اگر کوئی ایشو تھا تو باہمی گفتگو سے مل بیٹھ کر حل کر لیتے۔" عدنان بھائی کی بات معقول تھی۔
"کوئی ایشو ہوتا تو ضرور حل کرتے۔" اس کے پاس ایک سے جواب تھے۔
"ہو سکتا ہے، آئینہ کو کوئی اور پسند آ گیا ہو اور اب وہ ہمارے حمدان پر الزام لگا کر دامن چھڑا رہی ہو۔" چھوٹی بھابھی کی بات اس کے حق میں تھی لیکن اسے بہت ناگوار گزری۔
"ایسا بالکل نہیں ہے، شادی اور انگیجمنٹ سے پہلے آئینہ میری دوست بھی ہے یوں اس کی کردار کشی نہ کریں پلیز۔" اس کی بات پر کچھ دیر مکمل خاموشی چھائی رہی۔ آخر وہ ہی گویا ہوا۔
"اتنے دنوں میں شاید اسے اندازہ ہوا ہے کہ ہمیں شادی اور لائف پارٹنر سے مختلف چیزیں چاہئیں، ایک دوسرے سے ہماری ایکسپیکٹیشنز الگ الگ ہیں، شاید ہم کمپیٹیبل نہیں۔" وہ غلط یا جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا تاہم اصل وجہ اب بھی اس کی زبان پر نہیں آئی تھی۔

یہاں آنے سے پہلے آئینہ اور وہ کئی دن تک اس موضوع پر لمبی چوڑی بات کرتے رہے تھے جن میں زیادہ تر آئینہ کے سوال ہوتے تھے یا خیالی، فرضی منظرنامے جن میں وہ اس کا ردعمل اور عمل جاننا چاہتی تھی۔ وہ خوب سمجھ رہا تھا کہ آئینہ یہ سب کیوں کر رہی تھی۔ وہ مطمئن نہیں تھی، اسے لگنے لگا تھا اب بھی وقت ہے، اس کے پاس درست فیصلے کا وقت ہے کیونکہ یہ ہی سب اس کے اندر بھی چل رہا تھا۔ لاکھ کوشش کے بعد اب وہ بھی اپنی زندگی آئینہ کے ساتھ تصور نہیں کر پا تا تھا۔
سردی سے ٹھٹھرتی اس لڑکی کی حالت کی ذمہ دار محض موسم کی خنکی نہیں تھی۔
اس کے علاوہ سارا گھر منگنی ٹوٹنے پر ماتم میں ڈوبا تھا۔ الماس پروین نے آئینہ کی والدہ سے فون پر بات کی تھی لیکن انہوں نے بھی کوئی بڑی یا خاص وجہ نہیں بتائی تھی۔ بس اتنا کہا کہ دو سالوں میں اسے اندازہ ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے فٹ نہیں ہیں۔
نئی نسل تو پورا شادی کا موڈ بنائے تھی لہٰذا ان کے ماتم کی وجہ وہ نہیں تھی جو بڑوں کی تھی۔
"ہمیں اب لڑکی دیکھنا ہوگی۔" بڑی بھابھی کو فکر نے گھیرا۔
"حمدان سے ہی کہیں، وہ تلاش کرے اور ہمیں ملوا دے۔" شازمہ کا مشورہ حاضر تھا۔
"ویسے آئینہ سے بھی ہمیں اسی نے ملوایا تھا۔" چھوٹی بھابھی نے یاد دلایا۔
"اس نے اپنی دوست سے متعارف کروایا تھا جسے ہم سب نے منگیتر بنا دیا تھا۔" سمیعہ نے درست صورت حال پیش کی۔
"کہیں واقعی ایسا تو نہیں اسے کوئی پسند تھی اور اس کی شادی کہیں اور ہو گئی یا اس نے ہمارے حمدان کا دل توڑ دیا ہو اور جس کی یادیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔" اسلم بھائی بڑے سنجیدہ تھے۔
"اگر ایسا ہے تو ہم کچھ نہیں کر سکتے لیکن پھر

حمدان کو کم سے کم ہمیں سچائی بتا دینا چاہیے۔" عدنان بھائی کا انداز اداس سا تھا۔

جب اس نے سنا تو عجیب احساس میں گھر گئی۔ حیرانی، ڈر، بے یقینی، خوشی، گھبراہٹ اور ان سب سے بڑھ کے اب کیا ہوگا کی بے قراری۔ اس سے بچنے کی احتیاط اس نے دوگنی کر دی تھی۔

ان سب سے الگ حمدان بھتیجے، بھتیجی اور بھانجیوں بھانجے کے ساتھ مصروف تھا۔ اس کے پاس سب سوالوں کا ایک ہی جواب تھا۔ 'ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'

☆☆☆

الماس پروین اور سمیعہ سنجیدگی سے اس کے لیے لڑکیاں دیکھنے کا سوچ رہی تھیں اور وہ ان کے پاس ارم کی سفارش لے کر آیا کہ اسے حمنہ پسند تھی بلکہ یہ پسندیدگی دوطرفہ تھی۔

گھر میں ایک نیا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ کسی کو اعتراض نہیں تھا لیکن سب ناک کے نیچے چل رہے اس سلسلے پر حیران اور پھر خوش تھے۔ سب ان دونوں کا قافیہ تنگ کیے تھے۔ حمنہ کے والد بھی مان گئے تھے۔

سب کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ حمدان کی شادی کے ساتھ ان دونوں کے رشتے کا باقاعدہ اعلان اور منگنی ہوگی۔

وہ اس دن والے حادثے کے بعد حتی المقدور اس کے سامنے جانے سے بچتی رہی تھی اور منگنی ٹوٹ جانے کے بعد تو اور زیادہ محتاط ہو گئی تھی لیکن ہمیشہ چھپے رہنا بھی ممکن نہیں تھا۔

وہ الماس کے حکم پر ان کی الماری خالی کر کے صفائی کے بعد ان کی ہدایت کے مطابق دوبارہ ترتیب دے رہی تھی جب وہ حمدان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ ہی نہیں حمدان بھی اسے وہاں دیکھ کر چونکا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی رفتار بڑھا دی۔ انہیں الماری کے سب سے نچلے خانے سے کچھ کاغذات نکال کر اسے دینے تھے جسے ہاتھ لگانے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔

"دیکھو وہاں دو باکس فائل رکھی ہے۔" انہوں نے خود پلنگ پر بیٹھتے ہوئے الماری کی سمت ہاتھ اٹھایا۔

جب وہ اسے اپنی طرف آتا محسوس ہوا تو وہ ایک دم کھلے پٹ سے لگ گئی۔ جب وہ نیچے موڑ کے فرش پر بیٹھا تو اسے وہاں سے ہٹنے کی جگہ اور موقع نہیں بچا تھا۔ پٹ دیوار سے لگا تھا اور وہ پٹ سے۔ اس نے پیروں کی انگلیاں بھینچیں جو فرش پر بیٹھے اور دراز پر جھکے حمدان سے زیادہ دور نہیں تھیں۔ اس نے فائلیں نکالیں اور ترچھی نگاہ اس کے پیروں کی سمت گئی جہاں گرم چائے نے اپنے ثبوت چھوڑے تھے۔ بے اختیار اس کا دل کیا، اس کے پیر کے جلے حصے کو چھوئے اور اسی پل آئیڈن کو لگا وہ ابھی اس کے پیر پر ہاتھ رکھے گا۔

دونوں طرف ایک لطیف، خفیف اور کمزور سا خیال ہی تھا لیکن وہ لمحہ کس قدر لرزتے ہوئے گزرا، وہ دونوں ہی جانتے تھے۔ آرزو اور آس کی تتلی پھڑپھڑا کے آگے بڑھ گئی تھی۔

وہ فائلیں ہاتھ میں لیے کھڑا ہوا اور ادھر ادھر دیکھے بنا ماں کے پاس چلا گیا۔ کھلے پٹ کی اوٹ میں اس نے اندر خانے میں رکھے کپڑوں پر سر گرایا۔

"سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا پھر اب یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ حیران پریشان تھی۔

کیا برا تھا اگر وہ رات ان کی زندگی میں آتی ہی نا۔ لیکن اب تو دل ایک اور ایسی شب کا تمنائی تھا۔ وہ ان سے فائلیں لے کر چلا گیا جو اسے اسلم بھائی کو دینا تھیں اور وہ نماز پڑھنے کا عندیہ دیتی غسل خانے کی جانب بڑھیں تو وہ الماری سے ہٹ کے جائے نماز بچھانے لگی۔

☆☆☆

کچھ دن بعد چھوٹی بھابھی نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ ان کے بھائی کو آئیڈن اتنی بھائی تھی کہ وہ گھر والوں کے سمجھانے بجھانے کے بعد بھی بضد تھے اور

اب سب نے ان کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔اس خبر سے سب سے زیادہ سمیعہ خوش تھیں۔یہ ہی وہ وقت تھا جب انہیں آمیذن کے لیے آواز اٹھانی تھی۔

حسب معمول اب بھی انہوں نے انکار کر دیا تھا کہ انہیں ابھی اس کی شادی نہیں کرنی۔

''امی! اسے بی اے کیے بھی اب کئی سال ہوگئے ہیں۔یہ پرپوزل ہر لحاظ سے اچھا ہے، بھابھی کی فیملی سب جانتی بھی ہے، ان کی کوئی ڈیمانڈز بھی نہیں، میرے خیال سے تو یہ وقت اور پرپوزل دونوں آمیذن کی شادی کے لیے پرفیکٹ ہے۔''

اس کے حق میں بیٹی کی اتنی لمبی تقریر پر ان کے ماتھے کی شکنیں اور تنا چہرہ ناگواری کا اظہار کر رہے تھے۔وہ سختی سے لب بھینچے بیٹھی رہیں۔

''امی؟'' سمیعہ نے سوالیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے۔

''کہہ تو دیا، ابھی شادی کا ارادہ نہیں ہے۔''

''کب تک ارادہ ہے، انہیں یہ بتا دیں، وہ کر لیں گے انتظار۔'' انہوں نے ماں کے لفظوں کے انتخاب کو استعمال کیا۔

''یہ تم سب کا دردِسر نہیں ہے، مجھے کب کیا کرنا ہے مجھ پر چھوڑ دو۔'' ان کا لہجہ حتمی تھا۔

''آپ فراز ماموں سے مشورہ کرلیں، آخر ان کے کہنے پر ہی وہ یہاں ہے۔'' سمیعہ کچھ ٹھان لیں تو پھر ہار ماننے کا سوال نہیں ہوتا تھا۔

''سمیعہ! اب اس موضوع پر بات نہیں ہوگی۔ میں نے انہیں منع کر دیا ہے تو تم کیوں لیے بیٹھی ہو؟'' ان کی آواز میں غصہ تھا۔

''اس لیے امی کہ آپ انہیں انکار کر کے غلطی کر رہی ہیں۔'' انہوں نے رسان سے کہا اور وہ چیخ پڑیں۔

''مجھے مت سمجھاؤ تم، سب سے زیادہ تفصیل تو تمہیں پتا ہے۔'' ان کا لہجہ تیز ہوگیا تھا۔

''امی! ماموں اپنی زندگی میں، اپنی بیوی بچوں کے ساتھ مگن اور خوش ہیں، جو آپ کی نظر میں ان کی قصوروار تھیں وہ کب کی دوسرے جہان سدھار چکیں تو پھر آپ کیوں ماضی کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہیں؟''

''زندگی، بیوی بچے۔؟ ان کی حقیقت کا علم بھی ہے تمہیں؟'' سمیعہ نے جیسے ان کے زخم میں ناخن گاڑ دیے تھے۔

''اس عورت اور اس کے حسن کا ایسا زخم خوردہ ہے کہ فراز نے حسن خود پر حرام کرلیا اور ایک سیاہ فام سے شادی کرلی، پلٹ کے اس شہر میں قدم نہیں رکھا جہاں اس کی محبت کی بے قدری ہوئی تھی، دل ٹوٹنے پر اس خود اذیتی کو اپنا لیا کہ خود کو اپنوں سے دور کرلیا اور۔اور۔''

انہوں نے ہاتھ دروازے کی سمت اٹھایا جس کے باہر کہیں دور آمیذن کا کمرہ تھا۔

''اب بھی اس کی بیٹی کی پروا۔اس کی وہ محبت اب تک زندہ رہنے کا ثبوت ہے، وہ اب بھی اول دن کی طرح گھائل اور دکھی ہے۔جس نے میرے بھائی کی ساری زندگی عذاب کردی اس سے میں اپنی مرضی جیسا سلوک روا رکھنے کا حق رکھتی ہوں۔تم نے اپنے بھائیوں یا بہن کو اس تکلیف میں دیکھا ہوتا تو میری بات سمجھتیں۔''

''میں آپ کی ہر بات، ہر جذبہ سمجھ رہی ہوں لیکن آپ کو بس یہ سمجھانا چاہ رہی ہوں کہ وہ آمیذن ہے آئے تن نہیں۔وہ اس معاملے میں انوالو ہی نہیں ہے۔''

''ہے۔'' انہوں نے طیش میں پتھروں سے سخت لہجے میں کہا۔

''وہ بھی شامل ہے ورنہ وہ اس گھر میں نہ ہوتی اور نہ ہوتی تو مجھے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا تھا لیکن اب۔کوئی مجھے اس معاملے میں ایک لفظ نہ کہے۔'' ان کا لہجہ اٹل تھا۔

''تم ہی کچھ مدد کرو۔'' سمیعہ نے فون میں مصروف خاموش بیٹھے حمدان کو گھسیٹا جس کا تحمل آج

آسمان چھو گیا تھا۔

"فراز ماموں آرہے ہیں۔" اس نے فون کی اسکرین سامنے کی۔ "ان کا میسج ہے وہ فیملی کے ساتھ آرہے ہیں۔"

"ہیں؟" اس بحث اور گرما گرمی کے درمیان اچانک اس خبر پر وہ دونوں جتنا حیران ہوتیں کم تھا۔

"واقعی؟ بتاؤ مجھے۔" سمیعہ نے اس کے ہاتھ سے فون لیا۔

اندر کہیں انہیں ذرا ڈھارس بندھی کہ اب وہ فراز ماموں کے ذریعے اپنی ماں کو قائل کرلیں گی لیکن آنے والے وقت کے انکشاف کا انہیں اندازہ نہیں تھا۔

☆☆☆

گھر میں حمدان کے استقبال سے بڑھ کے تیاریاں ہو رہی تھیں آخر فراز ماموں بیوی بچوں کے ساتھ پہلی بار آرہے تھے۔ سمیعہ کی دونوں شادی شدہ بیٹیاں بھی ان کے آنے سے ایک دن قبل بچوں کے ساتھ آگئی تھیں۔ جب سے اس نے سنا تھا عجیب سی بے چینی گھیرے تھی۔

ذرا سے وقت میں بہت کچھ ہو گیا تھا جس کی اسے عادت نہیں تھی۔ بنا کسی ہلچل اور بڑے وقوعے کے زندگی بڑی سیدھی سرل چل رہی تھی۔ دو سال قبل والی شب کے اثرات اس نے قابو کر کے سنبھالے ہی تھے کہ وہ واپس آگیا، منگنی ختم ہو گئی، اس کے انداز بدل گئے، بھابھی کے بھائی کا پیام اور اب فراز احمد کی آمد۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا اور ان سب سے فرار بھی ممکن نہیں تھا۔ ایک ہی ماموں تھے جنھوں نے اسے یہاں چھوڑنے کے بعد ایک بار دنیا داری کے لیے بھی پلٹ کے پوچھا نہیں تھا۔ وہ زندہ ہے یا مر گئی۔ انہیں پروا نہیں تھی۔ ان کی عادات اور مزاج کی وجہ سے ہی نانا کو اندازہ تھا وہ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کے ساتھ کیسا سلوک کریں گے تب ہی انہوں نے الماس پروین کی یقین دہانی کے بعد سکون سے آنکھیں بند کرلی تھیں۔

گھر میں جاری تیاریوں اور ہلچل کے بیچ اچانک بارش شروع ہو گئی اور جاڑے کی بارش خنکی کئی گنا بڑھا دیتی ہے۔ یوں ابھی سردیوں کا آغاز ہی تھا لیکن بارش ہوتے ہی سب کے سوئٹر، جرسیاں اور شالیں باہر آگئیں۔

"ارے حمدان!" اچانک چھوٹی بھابھی کو یاد آیا۔

"سمیعہ باجی نے انگیجمنٹ کے وقت تمہیں شال گفٹ کی تھی، وہ کہاں ہے؟" انہیں وہ پشمینہ شال حد سے زیادہ پسند آئی تھی جو سمیعہ کے میاں نے اپنے کشمیری دوست سے منگوائی تھی۔

"وہ ساتھ لے گیا ہوگا نا، کیوں حمدان؟" سمیعہ نے اسے دیکھا اور اس نے فوراً تائید کی۔

"جی اور وہ وہیں ہے۔ مجھے کہاں علم تھا، یہاں بارش ہوگی یا اس قدر ٹھنڈ۔"

"خیر سردیاں تو یہاں ایسی ہی شدید ہوتی ہیں مگر۔" وہ فون کی طرف یوں اشارہ کرتے گویا کال ہو، وہاں سے اٹھ گیا۔ شکر تھا کہ سمیعہ چھوٹی بھابھی کے ساتھ اس وقت وہ شال دیکھنے کو بے قرار نہیں ہوئی تھیں۔

جب وہ مہمانوں کے کمروں کا جائزہ لے رہی تھیں تو ساتھ اسے بھی رکھا تھا۔ جو کمیاں انہیں نظر آرہی تھیں وہ اسے گنوا رہی تھیں کہ وہ سب اسے مینو اور بالی سے ٹھیک کروانی تھیں۔

"کل صبح یا ہمارے واپس آنے سے پہلے لان سے تازہ پھول لا کر گلدانوں میں سجا دینا۔" آخری ہدایت اس کے لیے تھی۔

اگلی صبح سب ہی انہیں لینے ایئرپورٹ گئے تھے۔ کسی نے بتایا نہیں تھا تاہم اس نے جہاز کی آمد کا وقت سنا تھا۔ اسی اندازے سے وہ لان سے پھول اکٹھا کر رہی تھی کہ بارش شروع ہو گئی۔ اسے سب ہی گلدانوں کے لیے پھول بہرحال جمع کرنے تھے سو وہ بارش سے بے نیاز ہو کر اپنا کام کرتی رہی۔

ایئرپورٹ پر گلے شکووں اور جذبات، جدائی

کے دکھ، ملن کی خوشی سب کی آنکھوں کے راستے خوب باہر نکلی تھی۔

سب نے فراز احمد کی بیگم اور دونوں بچوں کو تصاویر اور ویڈیوز میں ہی دیکھا تھا۔ یہ ان سب کی ان سے پہلی ملاقات تھی۔ بچے ٹھیک ٹھاک اردو جانتے تھے جب کہ ان کی بیگم شہناز ٹوٹی پھوٹی۔

وہ اپنے کمرے میں ہی تھی کہ یہ الماس پروین کی ہدایت تھی جو سکینہ خالہ نے اس تک پہنچائی تھی۔ آج انہوں نے کھانے کے اوقات میں بھی اسے کال نہیں کی تھی۔ وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ وہ اسے فراز احمد کے سامنے نہیں لانا چاہتیں۔ وہ اسی شخص کی وجہ سے ایک بہتر مکان اور مقام پر تھی اور اسی کی وجہ سے بے مقام اور بے مکاں بھی تھی۔ وہ جتنا بھی سوچتی، اسے کبھی فراز احمد پر غصہ نہیں آتا تھا بلکہ ایک ہلکا سا خوف تھا کہ ان کا سامنا ہوگا تو کیا ہوگا۔ وہ اس کو دیکھ کر چیخیں گے، چلائیں گے، نفرت سے منہ پھیر لیں گے یا پھر وہ بہت پیار اور نرمی سے پیش آئیں گے کہ اس کی بھلائی کے خیال سے ہی تو انہوں نے اس کے یہاں رہنے کو ممکن بنایا تھا۔ وہ ایک ہی بات سب سے زیادہ سوچ رہی تھی کہ یہ واپس کب جائیں گے۔

"شاید ان کے قیام تک وہ مجھے فارغ ہی رکھیں۔" اس نے سوچا۔

وہ اپنے کمرے میں بند تھی۔ بارش میں بھیگنے کے بعد اب اسے چھینکیں آرہی تھیں۔

☆☆☆

سب کے لاؤنج سے اٹھتے ہی انہوں نے سمیعہ کو آواز دے کر روکا تھا۔

"تم نے فراز سے اس کے بارے میں کیا کہا ہے؟" انہوں نے آمیذن کا نام نہیں لیا تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ فراز ماموں سے بات کرنے کے بعد سمیعہ ان کی جانب سے باز پرس کی منتظر ہی تھیں۔

"یہی کہ اچھا رشتہ آیا ہے۔"

"جب انکار ہوچکا تو اب کون سا رشتہ؟" وہ سمیعہ کی نادانی پر ازحد طیش میں تھیں کہ برسوں بعد چار دن کے لیے ان کا بھائی آیا ہے اور اس میں بھی سب سے غیر ضروری انسان کا ذکر چھیڑ کے اسے ماضی میں دھکیل کر دکھی کیا جائے۔

"امی!" سمیعہ اس کے لیے تیار تھیں کہ ان کے مطابق یہ ہی ایک موقع تھا جب آمیذن کے لیے کوئی مناسب فیصلہ کروایا جا سکتا تھا۔ فراز احمد اگر مداخلت کرتے اور شادی کے لیے کہتے تو وہ انکار نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ یہ سنہری موقع گنوانا نہیں چاہتی تھیں۔

"آپ ماموں جان کے کہنے پر اسے گھر لائی تھیں اب بھی انہیں بتادیں اگر وہ کہیں، کردیں شادی تو کردیجیے گا۔" وہ خوب جانتی تھیں یہ اتنی سیدھی بات نہیں جتنی انہوں نے اس جملے میں بنادی تھی۔

الماس پروین نے سختی سے منہ بند کیا۔ وہ بیٹی کے سامنے ضبط کر رہی تھیں اور سمیعہ کو لگا لوہا گرم ہے۔

"امی! مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا، آپ کو ماموں جان سے کتنی محبت ہے کہ آپ جیسی محبت میرے اور حمدان کے رشتے میں بھی منتقل ہوئی ہے لیکن امی! آپ نے فراز ماموں کو دیکھا نا، وہ کس قدر مطمئن اور خوش ہیں تو آپ کیوں پرانی باتیں دل سے لگائے ہیں اور پھر ان سب میں آمیذن۔"

"پرانی باتیں۔۔۔؟ اگر یہ سب پرانا ہوگیا ہوتا تو وہ اتنے برس پردیس میں نہیں گزارتا، مطمئن اور خوش۔ ہونہہ جیسے میں اس کو جانتی ہی نہیں۔"

"ہوسکتا ہے نا امی! کہ آپ غلط سوچ رہی ہوں۔" وہ جو کہنے جارہی تھیں یہ تلخ اور مشکل تھا لیکن کہنا بھی ضروری تھا کہ وہ اپنی ماں کو بھی اس اذیت سے نکالنا چاہتی تھیں۔

"یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ماموں جان وہاں جاکے آئے تن کو بھول گئے ہوں، کام میں بزی ہوگئے ہوں، دنیاداری اور کریئر کو اہمیت دینے لگے ہوں،

آپ ان کی بے اعتنائی یا بدلے جذبات، خیالات کو قبول نہیں کرسکیں اور چوں کہ آپ بھائی کی غلطی یا خطا مان ہی نہیں سکتی تھیں اس لیے ان سب کا الزام کسی اور کے سر دے کر ساری عمر اس سے نفرت کی، اتنی کہ اس کے جانے کے بعد اس کی اولاد سے بھی وہ نفرت نبھاتی رہیں۔"

انہیں بیٹی کی بات سے تکلیف پہنچی تھی اور یہ ان کے چہرے سے واضح تھا۔

"امی پلیز۔ میری بات سمجھیں، ہوسکتا ہے آپ بنا کسی بنیاد کے ہی نفرت کا محل تعمیر کیے خود کو تکلیف دے رہی ہوں اور پھر کسی اور کے بدلے کی نفرت کہاں تک درست ہے اور اس ہستی کے بعد اس سے منسلک فرد سے اس لیے نفرت کہ ان کے درمیان کوئی تعلق ہے۔ کیسے کوئی ہوش مند اسے جائز ٹھہرا سکتا ہے؟"

"تمھاری تمام باتوں کا جواز یہ ہے کہ فراز اسے بھول گیا تھا اور یہ ہی سراسر غلط ہے۔ اس لیے بیٹا یہ بات یہیں ختم کرو۔" انہوں نے خود کو سنبھال اور سمیٹ کر مضبوط اور استبدادی لہجے میں کہا۔

"اچھا یہ بتائیں ان سب میں آمیڈن کہاں اور کیوں قصوروار ہے؟" وہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھیں کہ یہ پہلا اور آخری موقع تھا۔

"وہ اس عورت کی بیٹی ہے جس کے حسن سے زخمی ہوا میرا بھائی اب بھی تڑپ رہا ہے۔ اتنے برسوں بعد یہاں اس کی صورت دیکھ کر وہ اپنے گھر میں بھی سکون سے نہیں رہے گا کہ وہ اسی کا پرتو ہے جس نے اسے ٹھکرا کے اس کی زندگی ویران کردی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ ایسی زندگی گزارنے پر مجبور ہے جو کبھی اس کا خواب نہیں تھی۔ اس لیے یہ بحث یہاں ختم ہوتی ہے۔ آج کے بعد اس موضوع پر تم کچھ نہیں کہو گی، مجھ سے نہ کسی اور سے۔ اس لڑکی کو فراز نے میرے سپرد کیا ہے، اس کے لیے مجھے جو مناسب لگے گا وہ کروں گی۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور پلٹتے ہی انہیں دروازے میں بت بنے فراز احمد دکھائی دیے۔

"فراز!" ان کی لرزتی آواز پر سمیعہ نے بھی اٹھ کے دروازے کی طرف دیکھا۔ الماس پروین بے دم ہو کے واپس صوفے پر گر سی گئیں۔

"ماموں جان!" شرمندہ سی سمیعہ ان کے پاس آئیں لیکن انہوں نے نہ انہیں دیکھا نہ سنا۔ وہ خواب کی سی کیفیت میں چلتے صوفے تک آئے۔

"آپا!" ان کی آواز عجیب سی شرمندگی اور حیرت کا آمیزہ تھی۔

"مجھے معاف کردیں۔" انہوں نے ان کے ہاتھ تھام کے آنکھوں سے لگائے۔

"فراز۔!" الماس پروین نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا تو آواز آنسوؤں سے تر تھی۔

"آپا!" سمیعہ کی بات اور بہن کی سوچ اور یقین نے انہیں جیسے نیند سے جگا دیا تھا کہ انہوں نے اس نہج پر کبھی کیوں نہیں سوچا کہ ان کے لیے نہ سہی مگر یہاں اس شہر میں، اس گھر میں ماضی اب بھی اس آب و تاب سے زندہ ہوسکتا ہے اور ان کے واپس نہ آنے کی وجہ سب ناکام محبت سمجھتے ہوں گے۔ وہ آگے بڑھ گئے تھے تو انہوں نے سوچا سب آگے بڑھ گئے ہوں گے۔

"میری پیاری آپا!" انہوں نے اب بھی ان کے ہاتھ تھام رکھے تھے۔

"مجھے معاف کردیں۔ اتنے سال میری وجہ سے آپ نے اس اذیت میں گزارے۔ مجھے شدت سے اپنی کوتاہی، اپنی غفلت، اپنی بے وقوفی کا احساس ہو رہا ہے لیکن اس وقت آپ کی محبت پر خود کو دنیا کا سب سے نازاں بھائی بھی فیل کر رہا ہوں اور آپ سے بے حد شرمندہ بھی ہوں۔"

"کیا کہہ رہے ہو فراز۔" ان کے انداز الماس پروین کو کھٹک رہے تھے۔

"مجھے آپ سے کھل کر ہر بات کرنا چاہیے تھی، ویسے ہی جس طرح میں یہاں رہتے ہوئے کرتا تھا لیکن اتنی دور سے فون پر اتنی تفصیلی بات کا وقت اور

وسائل نہیں ہوتے تھے ان دنوں۔" انہوں نے خود کو آمادہ کیا۔ وہ سب بیان کرنے جو کئی سال پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔

"اس وقت آئے تن کے لیے میرے جذبات سچ تھے تو میری یہ خوش حال فیملی اور ان سب سے میری محبت بھی سچ ہے۔ میں نے شہناز سے محبت کے بعد ہی شادی کی تھی کسی دھوکے، یاد، دکھ، انتقام یا اذیت کی خاطر نہیں۔ آئے تن کو میں جانتا نہیں تھا مگر شہناز کو اچھی طرح جاننے سمجھنے کے بعد مجھے اس سے محبت ہوئی تھی۔ آپ اسے جو چاہے سمجھیں۔ میچورٹی، عمر کا تقاضا یا صرف محبت کہ رنگ نسل اور دنیا کے اسٹینڈرڈ والی خوبصورتی کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ میں ان دنوں جس لاء فرم میں ملازم تھا وہ 'پرو بونو' کچھ کیسز پر بھی کام کرتی تھی۔ اسی طرح کے کیسز میں ایک شہناز کا کیس تھا جو ایک حادثے میں اپنی فیملی کھو دینے کے بعد غیر قانونی طور پر لندن آئی تھی۔ اسے ڈی پورٹ ہونے سے بچانے اور اس کی وہاں موجودگی کو قانونی بنانے میں، میں اس کا وکیل تھا اور ہمارا یہ پروفیشنل رشتہ اور ہماری ملاقاتیں کچھ وقت کے بعد پسندیدگی اور محبت میں ڈھل گئی تھی۔

یہ میرے وہاں جانے کے ڈیڑھ دو سال کے دوران کی بات ہے اس کے بعد مجھے اس کی حفاظت یا اسے بیوی بنانے سے پہلے خود کے لیے وہاں کی شہریت چاہیے تھی، جس کے لیے معینہ مدت تک وہاں رہنا لازمی تھا۔

پھر شادی کے بعد بھی اس کا کیس اور اس کی کچھ قانونی پیچیدگیاں تھی جن کی وجہ سے شہناز ملک چھوڑ کے نہیں جا سکتی تھیں اور میں اسے تنہا چھوڑ کے جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کہا بھی تھا آپ سے۔"

انہیں یاد تھا کہ فراز احمد نے نہ آنے کی وجہ بیوی کی کچھ دفتری سی وجہ بتائی تھی جو انہیں صد فی صد بہانا لگی تھی۔

"پھر بچوں کی آمد کے بعد مصروفیت بڑھ گئی اور فون ویڈیوز پر میں آپ سب سے مسلسل رابطے میں تھا تو کبھی محسوس نہیں ہوا کہ ہم دور ہو گئے ہیں یا بہت وقت گزر گیا ہے کیوں کہ ہمارے رابطے مضبوط اور مستقل تھے۔ استاد جی میرے لیے محض آئے تن کے والد نہیں تھے بلکہ میں انہیں دل سے استاد تسلیم کرتا تھا، اب بھی کرتا ہوں، ان کا احترام، مقام اب بھی میرے دل میں ویسا ہی ہے۔ مجھے میرے دوست نے فون کیا تھا استاد جی نے نہیں کیا تھا۔ دوست نے بتایا کہ استاد جی بیمار ہیں اور اپنی نواسی کے لیے بے انتہا فکر مند۔ مجھے تب تک آئے تن اور اس کے شوہر کی وفات کا علم نہیں تھا۔ میں اپنی زندگی کا یہ باب بند کر کے آگے بڑھ چکا تھا۔ میں نے آمیدن کی مدد استاد جی کی وجہ سے، ان کے لیے کی تھی آئے تن کی وجہ سے نہیں آپا۔"

انہیں پچھتاوے گھیر چکے تھے جواب لہجے اور آواز کو نڈھال کر رہے تھے۔

الماس پروین اب بھی بے یقین تھیں۔ اتنے سالوں سے جو ان کا سچ تھا اسے یک لخت غلط تسلیم کر لینا ممکن نہیں تھا۔ بھائی کے اجڑے دل کا دکھ بھی ان سے دور نہیں ہوا تھا اور اب کھلا کہ یہ دکھ تنہا ان کا تھا۔

"آپ یہ خیال دل سے نکال دیں آپا! کہ میں خوش نہیں یا اتنا عرصہ میں نے کسی اذیت یا محرومی میں بسر کیا ہے۔ میں اللہ کے کرم، آپ کی دعاؤں اور شہناز کی ہمراہی میں آسودہ رہا ہوں۔ بے شک آئے تن کے وقت میں غم زدہ اور مایوس تھا لیکن وہ میری زندگی کا محض ایک فیز تھا اور آپا۔" وہ کچھ متامل ہوئے۔

"آمیدن۔ میری کہانی میں اس کا تو کوئی کردار ہی نہیں ہے۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار تھا، اب بھی ہوں کہ آپ نے بروقت میری بات مان کے مجھے اپنے استاد جی کے مقابل سرخرو کیا کہ میں انہیں مطمئن کر سکا، ان کے لیے کچھ کر سکا۔"

الماس پروین کا سانس رکنے لگا۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”میں کمرے میں ہوں۔“ وہ غائب دماغی سے کہتی آگے بڑھ گئیں۔ سمیعہ ان کے پیچھے جانے لگی تھی کہ فراز احمد نے روکا۔

”انہیں کچھ وقت تنہا رہنے دو بیٹا۔“ لمبا سانس بھر کے انہوں نے بھی پشت صوفے سے ٹکائی اور چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

”کچھ دن پہلے حمدان اچانک ملنے آیا اور یہاں آنے کا اصرار کیا، میں تب بھی سمجھ نہیں پایا۔“ ان کا انداز خود کلامی سا تھا لیکن سمیعہ ٹھٹکیں۔

”حمدان آپ سے ملنے آیا تھا؟“

”ہاں وہ فرینکفرٹ سے لندن آیا تھا اور وہاں سے ادھر۔ وہ جتنے دن ٹھہرا مجھے کنوینس کرتا رہا کہ اتنے برسوں سے میں آپا سے ملا نہیں، یہاں آیا نہیں، کوئی میری فیملی سے ملا نہیں اور بچوں کو بھی ان کی ایکسٹینڈڈ فیملی سے ملنے کا شوق ہوگا وغیرہ تو اب ہائی ٹائم ہے کہ میں ایک چکر لگاؤں۔ اس سے مل کر اور اس کی باتوں سے بچے اور شہناز بھی ایکسائیٹڈ ہوگئے تھے اور اس نے ان سے وعدہ لیا کہ ہم سب اس ماہ ہی آئیں گے کہ اس کی شادی ہوگی اور ہم شادی میں شرکت کریں۔“

”اچھا۔ اتنے برسوں سے امی کو دیکھتے ہوئے اسے یہ موقع مناسب لگا ہوگا کہ آپ کو بلایا جائے، امی کی اداسی اور آپ کو یاد کرتے رہنا اب اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا ہوگا۔“ سمیعہ نے سر ہلایا۔ انہیں اپنے چھوٹے بھائی پر بے تحاشا پیار آیا تھا۔

”اسے شاید آپا کی سوچ، ان کا رویہ پریشان کر رہا تھا۔ اس نے صاف صاف تو کوئی ایسی بات نہیں کی تھی لیکن اب آپا کی بات سننے کے بعد مجھے یقین ہوگیا ہے، یہ ہی وجہ تھی، وہ نہ آپا سے کہہ سکتا تھا کہ وہ غلط ہیں، نہ مجھ سے کہ آپا میری وجہ سے کیا کر رہی ہیں، کیا سوچتی ہیں، لہٰذا اس نے مناسب سمجھا کہ ہمیں آپس میں بات کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔“

وہ پرسوچ سے بول رہے تھے اور سمیعہ الجھ گئیں۔ اگر ایسا تھا تو اس نے ان سے بات کیوں نہیں کی؟ جب کہ وہ گھر میں آمیدَن کی سب سے ’ووکل سپورٹر‘ تھیں۔

اپنے کمرے میں پہلی بار الماس پروین کو اپنے بھائی پر غصہ آرہا تھا۔ ان کا حال ایسا تھا مانو ایک لمبی دوڑ کے بعد جب تمغہ لینے کا وقت آیا تو انہیں غلط ٹریک پر دوڑنے کا پروانہ تھما دیا گیا۔

”اس نے جیسے آئے تن سے اپنی محبت کا ذکر کیا تھا ویسے ہی یہ بھی شیئر کرنا چاہیے تھا۔“

”اس نے تو کیا تھا، تم نے ہی کبھی یقین نہیں کیا۔“ وہ خود سے الجھ رہی تھیں۔

پہلی حیرت، غصہ اور بے یقینی کی شدت تھی جو دھیرے دھیرے کم ہو کر اب پچھتاوے میں ڈھل رہی تھی۔

لوگ محبت میں اندھے ہوتے ہیں یا نفرت میں اور وہ دونوں میں نابینا ثابت ہوئی تھیں۔ انہیں لگتا تھا بھائی کے دکھ میں انہوں نے زندگی میں کئی بھاری، غمگین راتیں گزاری ہیں لیکن آج کی شب کا ان راتوں سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔

☆☆☆

اگلے دن سمیعہ اور فراز احمد، کسی نے بھی الماس پروین سے گزشتہ شب والی گفتگو کا ذکر نہیں چھیڑا کہ وہ خود چپ سی تھیں۔ یہ انکشاف کسی صدمے سے کم نہ تھا۔

فراز احمد خود کو قصوروار سمجھ رہے تھے۔ سب سے بڑی غلطی ان سے ہوئی تھی۔ جو باتیں ہمارے لیے اہم ہوتی ہیں، اگر وہ کبھی غیر اہم ہو جائیں تو انہیں ضرور خبر کرنی چاہیے جن کے لیے وہ باتیں ہمارے جتنی ہی اہمیت رکھتی ہیں۔

چوں کہ ان سب کا قیام محدود وقت کے لیے تھا لہٰذا بچوں نے ہر دن کا پروگرام طے کر رکھا تھا شہناز اور بچوں کو اپنے شہر کی سیر کروانے کے لیے اور ملک سے متعارف کروانے آج کا پورا دن باہر گزارنے کا

منصوبہ تھا۔

الماس پروین میں کل تک جو جوش تھا، وہ اب ماند پڑ گیا تھا لیکن وہ سب کے ساتھ جانے سے انکار بھی نہیں کرسکتی تھیں۔

دوپہر کا کھانا بھی سب نے باہر ہی کھایا تھا۔ شام سے پہلے سمیعہ کو مینو کا فون آیا۔

”آمیذن دیدی کو بخار ہے، کیا کروں؟“

”کب سے بخار ہے؟“

”پتا نہیں وہ کمرے سے باہر ہی نہیں نکلیں دن بھر تو ابھی آ کے دیکھا۔“

”پاس والے کلینک میں دکھا لو۔“ انہوں نے معقول مشورہ دیا۔

”باجی اس وقت بارش بہت ہے ادھر۔“ مینو نے بے بسی جتائی۔

”اگر تمھارے پاس ہو تو کروسین دے دو یا چوکیدار سے کہو وہ فارمیسی سے لے آئے گا۔ ہمیں آتے آتے رات ہو جائے گی۔“ وہ شہر سے دور تھے۔

”جی۔“ مینو نے فون رکھ دیا۔

وہ سب کے درمیان سے اٹھ کے دور آ کھڑی ہوئی تھیں جب پلٹیں تو پیچھے حمدان کھڑا تھا۔

”سب ٹھیک ہے؟“

”ہاں۔ آؤ۔“ انہوں نے مختصر جواب دیا اور اس سے پہلے آگے بڑھ گئیں۔

گزشتہ رات کے انکشافات کے بعد وہ اس وقت یہ معمولی سی بات الماس پروین اور فراز احمد دونوں سے مخفی ہی رکھنا چاہتی تھیں کہ سب کے ساتھ کسی طرح ان دونوں کی طبیعت اور مزاج بحال ہوا تھا۔ اس وقت آمیذن کے ذکر پر جانے وہ دونوں کیا ردعمل دیتے۔

انہیں دیر رات تک باہر ہی رہنا تھا۔ لیکن اب حمدان ”موسم کچھ ٹھیک نہیں کسی بھی وقت بارش شروع ہو جائے گی۔“

”بہتر ہے ہم آج یہیں رکتے ہیں اور واپس چلتے ہیں، باقی کل دیکھیں گے۔“ سب تھک بھی گئے اور کچھ موسم بھی بے اعتبار سا تھا سو سب کو حمدان کی بات ٹھیک لگی۔

شہناز اور دونوں بچے تھکے تھے تاہم انہیں سب کے ساتھ لطف آ رہا تھا۔ پہلی بار فراز احمد کے خاندان سے مل کر وہ سب خوش تھے۔ ننھیال تو ان کا کوئی تھا نہیں اور پہلی بار اپنی پھپھو، کزنز اور ہم عمر بھتیجے بھانجیوں سے مل کر انہیں اپنا یہ بڑا سا خاندان اچھا لگ رہا تھا۔

ان کے گھر پہنچتے تک پھر بارش شروع ہو گئی تھی۔ راستے میں سب کچھ نہ کچھ کھاتے رہے تھے سو گھر پہنچنے کے بعد کسی کو کھانے کی حاجت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ سب سونے کے ارادے سے سیدھا کمروں میں چلے گئے۔

”بیٹا! ذرا آمیذن کو دیکھ لو۔“ سمیعہ کی گود میں ان کا نواسا تھا جو سو گیا تھا۔ وہ اسے لیے کمرے میں جانے سے پہلے حمنہ کو کہہ گئیں۔

کچھ دیر بعد حمنہ ان کے پاس آئی۔

”مما! آپ آئیں ذرا۔“

وہ آمیذن کے کمرے میں پہنچیں تو ٹھنڈ سے بری طرح کانپ رہی تھی۔ حمنہ نے بتایا کہ کھڑکی کھلی تھی۔ اس کی وہ حالت نہیں تھی کہ وہ اٹھ کے کھڑکی بند کر سکتی۔

کسی طرح اسے اٹھا کے ان دونوں نے اسے دوا دی اور گرم لحاف میں چھپایا۔ فراز احمد کی آمد کے بعد سے اسے کسی نے دیکھا نہیں تھا۔ جانے وہ کب سے بیمار اور بھوکی پیاسی تھی۔ مینو نے چوکیدار سے بخار کی دوا منگوا کے کھلا دی تھی۔

اس کی کپکپاہٹ کم ہوئی تو وہ حمنہ کو اسے کھانا کھلانے کی تاکید کرتی باہر آ گئیں۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اپنے کمرے کی سمت جاتے ہوئے لاؤنج میں بیٹھے حمدان کو دیکھ کر انہوں نے حیرت سے سوال کیا۔

”کچھ نہیں۔ میری ضرورت ہے تو کہیں۔“

اس نے سر سے ادھر اشارہ کیا جہاں سے وہ آئی تھیں۔

"اس وقت اسپتال جانے جیسی کنڈیشن نہیں ہے، صبح دیکھیں گے۔ تم بھی سو جاؤ۔"

"جی۔ کچھ ضروری ای میلو دیکھنی ہیں پھر جا رہا ہوں۔" اس نے اپنا فون دکھاتے ہوئے کہا۔

"دیر مت کرنا۔" وہ بھی تھکی ہوئی تھیں، چلی گئیں۔

کچھ دیر بعد حمنہ بھی اسے دیکھ کر چونکی۔

"آپ سوئے نہیں؟"

"بس جا رہا ہوں۔" وہ مسکرایا لیکن اس کے چہرے مہرے نے حمنہ کو اگلے سوال پر مجبور کیا۔

"کچھ چاہیے؟" اسے دیکھ کر ہی لگ رہا تھا وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔

"چائے کافی؟ میں بنا دیتی ہوں۔" وہ باورچی خانے کی طرف پلٹی تھی کہ اس نے شتابی سے روکا۔

"نہیں حمنہ! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ کچھ کام ہے وہ ختم کر کے جا رہا ہوں۔"

"آرام کریں ماموں! آپ نے لمبی ڈرائیونگ کی ہے آج۔" وہ مسکراتی چلی گئی۔

☆☆☆

جب بخار مکمل اتر گیا تو وہ اپنے اوپر پڑا واحد لحاف ہٹا کے اٹھ بیٹھی۔ حمنہ کے اصرار پر اس نے تھوڑا سا کھانا کھایا تھا۔ پلیٹ اب بھی پلنگ کے ساتھ والی میز پر ڈھکی رکھی تھی۔ اب شدید بھوک کا احساس جاگا تھا لیکن باورچی خانے میں جا کے کھانا گرم کرنے جتنا صبر نہیں تھا۔ اس نے وہی ٹھنڈی پلیٹ اٹھالی۔

دن بھر وہ تیز بخار کے زیر اثر سوتی رہی تھی۔ اب بخار بالکل نہیں تھا تو دوبارہ نیند کا سوال ہی نہیں تھا۔ باہر بارش اس وقت تھمی تھی لیکن ہر سو پانی اور نمی بکھری تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکلنا چاہتی تھی۔ سوئیٹر لینے کے لیے اس نے الماری کھولی تو سامنے ہی وہ شال تھی۔ دوپہر میں مینو نے اس کے لیے جرسی سوئیٹر کمبل جیسی شے ڈھونڈتے ہوئے سب کچھ اوپر نیچے کر دیا تھا۔ اس نے وہ شال اٹھالی۔ ان دو سالوں میں وہ الماری میں بند تھی۔ کئی موقعے آئے جب اسے اس شال میں چھپی حدت کی خواہش اور طلب ہوتی تھی، وہ اس کے لیے دستِ مسیحا تھی لیکن پھر بھی اس نے کبھی اسے الماری سے نکالنے کی ہمت نہیں کی تھی لیکن اس وقت اسے اپنے گرد لپیٹ کر باہر آگئی۔

رات کے اس پہر کس نے اسے دیکھنا تھا، دیکھ بھی لیتا تو کس نے پہچاننا تھا۔ باہر آتے ہی خنکی کا احساس بڑھ گیا۔ وہ لان کے گزیبو میں جا کے بیٹھنا چاہتی تھی۔

"لائٹس آف کرنا بھول گئے سب۔" لاؤنج کی روشنی دیکھ کر وہ بتیاں بجھانے کے ارادے سے ادھر آئی اور دروازے میں ہی، دروازے پر نظریں جمائے حمدان کو دیکھ کر تھم گئی۔ اگلے پل ہی اس نے جو پیر چوکھٹ کے اندر رکھا تھا وہ واپس باہر کر لیا۔

حمدان اپنی جگہ سے کھڑا ہوا لیکن آگے نہیں آیا۔

"آمیذن!" اس کا پلٹنے کا ارادہ بھانپ کے اس نے روکا اور وہ پلٹی نہیں۔

"طبیعت کیسی ہے؟" وہ آواز اتنی ہی تھی کہ صوفے سے دروازے تک کا سفر کر سکے۔

"اچھی ہے۔" اس نے دونوں ہاتھ میں تھامے شال کے کنارے کھینچ کے قریب کیے۔ یہ شاید براہ راست اس کی حمدان سے پہلی بات تھی۔

اس کا گلابی چہرہ قرمزی ہو رہا تھا، کنڈلی سبز آنکھوں کے گلابی جال اور بکھرے بال، وہ بستر سے اٹھی مریض ہی لگ رہی تھی۔

"ہمم۔" یہ 'ہمم' رازوں کا وہ خفیہ خزانہ تھی جسے دنیا سے چھپا کے کہیں دفن کیا جاتا ہے اور پھر اس کی چابی کہیں دور سمندر میں پھینک دی جاتی ہے۔

"میں جا رہا ہوں۔" اسے پلٹنے کے لیے پر تولتے دیکھ حمدان نے کہا۔

"تم جس کام سے باہر نکلی تھیں، وہ کرو۔" وہ

اس کے سامنے سے گزرتا اندر بڑھ گیا۔

وہ کتنی دیر وہیں کھڑی رہی پھر اندر جا کے بتیاں بجھائیں اور واپس کمرے میں آ کے بستر پر ڈھے گئی۔

"یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟"

اگلی صبح سمیعہ جاگنے کے بعد اسے دیکھنے آئیں۔ کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل نہیں تھا۔ انہوں نے دستک دی لیکن کوئی جواب نہ پا کر وہ فکرمند سی دروازہ کھول کے اندر آ گئیں۔

آمیذان بے خبر سو رہی تھی۔ انہوں نے احتیاط سے اس کا ماتھا چھوا، بخار نہیں تھا۔ وہ اسی خاموشی سے واپس جانے لگیں کہ نظر تکیے کے اس طرف تہ کر کے رکھی شال پر پڑ گئی۔

☆☆☆

دروازے پر بے صبری دستک پر اس کی آنکھ کھلی اور اس نے تیزی سے اٹھ کے دروازہ کھولا۔ سامنے سمیعہ تھیں جو اسے ایک طرف کرتی اندر داخل ہوئیں۔ وہ دروازہ بند کر کے پلٹا۔ ابھی اس عجلت کی وجہ دریافت کرنے منہ کھول ہی رہا تھا کہ انہوں نے ہاتھ میں تھامی شال اونچی کی۔ اس کی بچی کھچی نیند بھک سے اڑ گئی۔

ایک گہرا سانس لے کے اس نے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کے بے اختیار بکھرنے والے اپنے تاثرات سمیعہ سے چھپائے تھے۔ پھر وہی ہاتھ بالوں پر پھیرتے ہوئے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے روک کے اس نے انہیں دیکھا۔

"میں آپ سے کہنے ہی والا تھا۔" یہ جھوٹ نہیں تھا۔

"کب؟ جب میں ماموں کی مدد سے اس کی شادی عاصم سے طے کروا دیتی؟"

"نہیں۔ اس سے پہلے ہی۔" وہ آگے جا کے پلنگ کے کنارے ٹک گیا۔

"تم اسی لیے لندن گئے تھے؟" وہ اس کے پیچھے آئیں۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"یا اللہ!" انہوں نے سر پر ہاتھ رکھا۔ "اب یہ مت کہنا انگیجمنٹ بھی تم دونوں نے اس وجہ سے آپسی صلاح مشورے سے اینڈ کی ہے۔"

"نہیں۔ یہاں اَن ایکشنلی آئینہ نے میری مدد کی ہے۔"

"ورنہ تم کرنے والے تھے؟" وہ چپ رہا۔ اس نے سوچا تھا آئینہ سے سب سچ کہے گا۔

"حمدان!" وہ بھی اس کے بازو میں بیٹھ گئیں۔

"اب تک مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"مجھے خود انگیجمنٹ کے بعد علم ہوا۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکیں۔

"تب تک میں سمجھتا رہا میری فیلنگز ون سائیڈڈ ہیں اور بہتر ہے اس وجہ سے میں اسے مشکل میں نہ ڈالوں کہ آپ نے مجھے امی کے ارادوں اور احساسات سے پہلے ہی باخبر کر دیا تھا۔" وہ کچھ دیر رک گیا۔

"لیکن اس رات اتفاقاً۔ میں نے جانا کہ میں اکیلا مبتلا نہیں ہوں۔ تب انگیجمنٹ ہو چکی تھی، میری چار دن بعد کی فلائٹ تھی، دو سال کا کانٹریکٹ تھا۔ ان دو سالوں میں کوشش کے باوجود میں آئینہ کے ساتھ زندگی سوچ سکا، نہ آمیذان کے بنا زندگی کا تصور کر سکا۔ فائنلی طے کیا کہ پہلے ماموں اور امی کو ملایا جائے پھر ماموں خود ہی امی کا رویہ دیکھ کے کیا اور کتنا غلط ہو رہا ہے سمجھ جائیں گے، نہ سمجھتے تو میں انہیں سمجھا دیتا کہ اس معاملے میں امی ہم میں سے کسی کی کوئی دلیل، کوئی بات نہیں سنیں گی، یہ آپ بھی جانتی ہیں۔"

"اور آگے کیا سوچا تھا؟"

"مجھے آپ اور ماموں سے مدد مانگنی تھی۔"

"کیسی مدد؟"

"ماموں ہی امی سے اس خواہش کا اظہار کریں کہ وہ چاہتے ہیں آمیذان اور میری۔"

اس نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

''واہ!'' وہ خفیف سا مسکرائیں۔
''اور اگر ماموں کے جذبات وہی ہوتے جیسا امی سمجھتی رہی ہیں تو پھر کیا کرتے؟''
''تب میں انہیں ان کی محبت کا واسطہ دیتا کہ مجھے تو محروم نہ رکھیں، ان کے اختیار میں ہے، دو محبت کرنے والوں کو دو دور نہ ہونے دیں۔'' اس کے انداز میں ہلکی شوخی تھی۔
''اور وہ پھر بھی نہ مانتے تو؟''
''تو آپ کے سر ہو جاتا کہ کچھ بھی کریں، اس مسئلے کا وہ حل سوچیں جو مجھے چاہیے۔'' اس نے بڑے یقین سے کہا۔
''چلو!'' انہوں نے اس کے بازو پر ہاتھ مارا ''اتنے دن مجھ سے چھپایا اور اب مسکا لگا رہے ہو۔''
''مجھے برسوں پہلے کی آپ کی بات کبھی نہیں بھولی تھی باجی کہ میری دلچسپی اس پر زندگی تنگ کر دے گی۔''
''اسے تمہارے اس پلان کا علم ہے؟'' ان کے سوال پر اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔
''باجی! ساری زندگی چند لفظوں کے تبادلے کے علاوہ ہماری کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔'' انہوں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔
''آپ کی باتوں نے ہی مجھے ہمیشہ اتنا محتاط رکھا۔''
وہ کھڑی ہوئیں۔
''سب جاگ جائیں تو آج موقع دیکھ کے ماموں سے بات کرتے ہیں۔''
''جی۔''
''سنبھال کے رکھو اب اسے۔'' انہوں نے شال پلنگ پر رکھی۔ ''میرے تحفے کی یہ قدر کی۔'' سمیعہ نے مصنوعی ناراضی لہجے اور چہرے میں سموئی۔
''میں نے کسے دی، اسی بات سے اس کی قدر کا اندازہ لگائیں۔'' وہ بھی کھڑا ہوا اور ان کے ساتھ دروازے تک آیا۔
''شرم کرو۔ بڑی بہن سے کیسی باتیں کر رہے ہو۔'' سمیعہ کی بات پر وہ ہنس دیا۔

☆☆☆

اسے ٹھیک ٹھیک یاد تھا کہ شال اس نے سرہانے رکھی تھی لیکن اب سارا کمرہ چھان مارا تھا مگر کہیں بھی شال کا نام و نشان نہ تھا۔
حمنہ دستک دے کر اندر آئی۔
''کیسی طبیعت ہے اب؟''
''الحمد اللہ۔ ٹھیک ہے۔''
''ابھی کچھ کھانے کے بعد بخار نہ بھی ہو تو دوائی لے لیجیے گا۔'' حمنہ کی بات پر اس نے سر ہلایا۔
اس کا ذہن شال میں اٹکا تھا۔ خود پر غصہ آرہا تھا کہ کیا ضرورت تھی اوڑھنے کی۔ اس کا غائب ہونا اچھی بات نہیں تھی۔ کوئی بھی اسے دیکھ کر پہچان لیتا اور وہ اس کے پاس کیسے آئی اس سوال سے بچنے کے لیے وہ آج تک اسے چھپا کے رکھتی آئی تھی۔ رات جانے کس خیال کے زیر اثر وہ اسے اوڑھ کے باہر نکلی تھی اور اب وہ مل نہیں رہی تھی۔
''چلیں، سب کے ساتھ بریک فاسٹ کریں۔'' حمنہ نے کہا تو وہ حیران سی اسے دیکھے گئی۔
''آئیں۔'' وہ باہر نکلی۔
اس کے دل میں کئی سوال تھے اور اس سے زیادہ خوف۔ تاہم وہ حمنہ کے ساتھ باہر آگئی۔ حمنہ میز لگانے میں مینو اور بالی کی مدد کر رہی تھی۔ وہ بھی ان کے منع کرنے کے باوجود شامل ہوئی کہ کام کر کے سب کے آنے سے پہلے کمرے میں بند ہو جائے گی۔
وہ میز پر ہر کرسی کے آگے پلیٹیں اور گلاس رکھ رہی تھی۔ ابھی کوئی آیا نہیں تھا۔ اس کے ذہن پر شال اور فراز احمد سے ملاقات اس قدر حاوی تھے کہ مکمل طور پر اطراف سے کٹ گئی تھی۔
''شال میرے پاس ہے۔'' جب اس کے بغل والی میز پیچھے کھینچتے ہوئے حمدان نے سرگوشی کی تو اس کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا جسے حمدان نے

زمین بوس ہونے سے بچالیا۔

اس کی اطلاع نے اسے مزید بدحواس کر دیا۔

"کیا وہ کمرے میں آئے تھے؟" اس کا دل بند ہونے لگا۔

وہ مزید کچھ کہتا یا اس سے گھبراہٹ میں کوئی خطا سرزد ہوتی، پیچھے آوازیں ابھریں۔ سب ایک ساتھ اندر داخل ہو رہے تھے۔

وہ گلاس میز پر رکھتا کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ جانے لگی تھی کہ سمیعہ نے پکارا۔

"آمیذن!" وہ رک گئی۔

"ماموں! یہ آمیذن ہے آپ کے استاد کی نواسی اور آمیذن بیٹا! یہ فراز ماموں ہیں تمھارے نانا کے طالب علم جواب تک پکے شاعر ہیں۔"

اس نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے جواب دے کر اس کا احوال پوچھا۔ پھر وہ اس سے نانا کے متعلق بات کرنے لگے۔ انہوں نے اسے اپنی بیوی اور بچوں سے بھی اسی رشتے سے متعارف کروایا۔

سب سے آخر میں الماس پروین آئی تھیں۔ سب بیٹھ گئے تھے لیکن وہ فراز احمد اور شہناز کے ساتھ کھڑی تھی جو اسے نانا کی کوئی بات سنا رہے تھے۔

"آجاؤ فراز۔" اپنی جگہ سنبھالتے ہوئے انہوں نے بھائی کو آواز دی۔

"جی آپا۔" وہ بیوی کے ساتھ میز کی طرف بڑھے اور وہ دروازے کی طرف۔

"تم بھی آؤ۔" انہوں نے مڑ کے آمیذن دیکھا۔ یہ ان کے لیے آسان نہیں تھا لیکن اب بھی یہاں فراز احمد کی موجودگی اور بہن کی بھائی کے لیے محبت ہی آسانی بھی بنی تھی۔

"آمیذن۔" اس کا نام پکارنے سے پہلے جو وقفہ تھا وہ سب پر بھاری گزرا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"آجاؤ۔" سمیعہ نے پکارا اور اپنے بازو والی خالی کرسی پر ہاتھ رکھا۔

وہ حیران پریشان سست قدم اٹھاتی کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کے سامنے دائیں جانب حمدان تھا۔ بے اختیار ہی اس کی آنکھیں اس پر ٹھہر گئیں۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ نگاہیں ملتے ہی وہ مسکرایا اور پلیٹ پر جھک گیا لیکن اس مبہم تبسم میں تسلی تھی، یقین دہانی تھی۔

☆☆☆

"آپا! حمدان کی انگیجمنٹ ختم ہو گئی ہے، ہم تو اس کی شادی میں شرکت کے ارادے اور تیاری سے آئے تھے۔ اس قلیل وقت میں نئی دلہن ڈھونڈنے سے اچھا ہے قریب ہی دیکھ لیا جائے؟"

"قریب کون ہے؟"

"اگر آپ اور حمدان کو اعتراض نہ ہو تو استاد جی کی نواسی موجود ہے۔" فراز احمد نے بہن سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"خوبصورت ہے، پڑھی لکھی اور دیکھی بھالی بھی پھر مجھے ہمیشہ کے لیے اطمینان رہے گا اور جو تلخی غلط فہمی کی بنا پر ہوئی ہے، اس کی اس سے بہتر تلافی کیا ہو سکتی ہے!" سمیعہ نے اپنے ماموں کو خوب 'ٹریننگ' دی تھی۔

"لیکن حمدان مانے گا؟ وہ تمھاری میری مرضی کے آگے دل پر پتھر رکھ کے ہاں نہ کر دے۔" تلافی والی بات کہیں ان کے اندر رہ گئی تھی۔

ان کی سوچ اور یقین اس قدر غلط ثابت ہوئے تھے کہ انہیں اپنے خیالات اور قوت فیصلہ پر بھروسا نہیں رہا تھا۔ ان کے علاوہ ہر کوئی درست تھا۔ سمیعہ بھی، فراز احمد بھی۔ بس وہ ہی ایک بات کو سچ مان کے اسی پر اڑی رہیں اور پھر اسی عینک سے سب کچھ دیکھا فراز احمد کو بھی اور آمیذن کو بھی۔ اس وقت وہ خود کو کوئی بھی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں سمجھ رہی تھیں اور اپنے بھائی کے چہرے اور انداز کی ندامت بھی ان کو اداس کرنے والی تھی۔ ان کی محبت اب بھی بھائی کو ساری رعایتیں دینے پر مصر تھی۔

"آپ سمیعہ سے کہیں، وہ حمدان سے اس کی مرضی معلوم کروالے گی۔" مشورہ حاضر تھا۔

باقی گھر والے اچانک اس تجویز پر شش و پنج میں تھے، سب ہی نے الماس پروین میں تبدیلی محسوس کی تھی۔ وہ پہلے بھی آمیذن، الماس پروین اور فراز احمد والے معاملے سے دور رہتے تھے، اب بھی سب نے وہی کیا تاہم آخری فیصلہ حمدان پر چھوڑ دیا گیا۔

اور پھر سارے گھر نے دیکھا کہ سمیعہ نے پوچھا اور حمدان اور آمیذن کا رشتہ پکا ہوگیا۔ سب کے نزدیک یہ فراز احمد کی خواہش تھی جسے حمدان اور الماس پروین نے قبول کیا تھا۔

"دوسروں سے اپنی وفا ثابت کرنے کے لیے ہم ان کے ساتھ زیادتی کر جاتے ہیں جن کا ہماری طرف کوئی حساب ہی نہیں نکلتا ہے۔ یہ کیسا انصاف، کیسی محبت ہوتی ہے؟ محبت ثابت کرنے کے لیے کسی سے نفرت کرنا پڑے تو اس محبت کو کس کھاتے میں رکھا جائے گا؟"

جب سب حمدان کو مبارک باد دے رہے تھے تو کبھی سمیعہ کی کہی بات ان کے کانوں میں گونجی۔

یہ تلخ سی بات ان کی سوچ بن کر ابھری اور اداس ہوتے ہوتے اچانک ان کے اندر اطمینان پھیلا کہ وہ دیر سے سہی سنبھل گئی تھیں اور انہیں فوراً تلافی کا موقع بھی مل گیا تھا۔

اسے بتانے سمیعہ ہی آئی تھیں اور وہ پلکیں جھپکائے بنا بت بنی انہیں تک رہی تھی۔

"مبارک ہو۔" انہوں نے بڑھ کے اسے گلے لگایا اور وہ جیسے ہوش میں آئی۔ ان کے گلے لگی وہ یک دم پھوٹ پھوٹ کے رودی۔

جانے کس کس دکھ، کون کون سے زخم اور کیسی کیسی باتوں پر اس کے جمع آنسو بہہ نکلے تھے یا پھر یہ محض خوشی کے آنسو تھے۔

سمیعہ کو ان دو معصوموں اور ان کی خاموش محبت پر بڑا ناز محسوس ہوا۔

باری باری سب ہی اسے مبارک باد دینے آرہے تھے لیکن سب سے اداس ان سب میں نمو تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا، آمیذن بازی مار گئی تھی۔

فراز احمد کے جانے سے قبل شادی تھی اور ساتھ ہی حمنہ اور ارقم کی منگنی بھی۔

☆☆☆

آج حمنہ اور ارقم کی رسمِ منگنی کے ساتھ ان دونوں کا نکاح ہوا تھا۔

ایمل، وغیرہ کے لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی بار بار اس کی آنکھیں بھر آرہی تھیں باوجود ضبط کے ایک آدھ آنسو چھلکنے کی جرأت بھی کر رہا تھا۔

"میں ہوتی تو خوشی کے مارے اس سے زیادہ روتی۔" نمو کی حسرت زدہ آواز پر اس سمیت سب ہنس پڑیں۔

"اب ایسی آہیں سوچ سمجھ کے بھرا کرو۔" ایمل نے اس کے سر چپت لگائی۔ "ورنہ آمیذن دیدی ڈنڈے سے پٹائی کردیں گی۔" "نہیں۔" اس نے پورے یقین سے کہتے ہوئے اسے دیکھ کر تائید چاہی۔ "انہیں پتا ہے، وہ تھوڑی ماریں گی مجھے۔"

"کیا پتا ہے؟" امیمہ، سمیعہ کی بڑی بیٹی نے پوچھا۔

"کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا، ان کی شادی ہوگئی ہے۔" ان سب کے بلند قہقہوں میں اس کا تبسم بھی شامل تھا۔

وہ سب اس سے وعدہ لے کر نکلی تھیں کہ اب وہ ضبط کرے گی اور ان کے جانے کے بعد وہ واقعی خود کو رونے سے روکنے کی کوشش کرتی رہی کہ اس سے جذبات اور خوشی سنبھل نہیں رہی تھی۔ اس کا دل، دامن، آنکھیں سب اس افتاد پر ہکا بکا آنسو بہانے پر مصر ہوئے پڑے تھے۔ تھوڑا وقت خود کو سنبھالنے میں خرچ کرنے کے بعد اس نے نظریں گھمائیں اور دائیں جانب کنسول میز پر دھری ٹرے دیکھ کے ٹھٹک گئی۔

''سب اسے کیسے بھول گئے؟'' اس نے سوچا اور بے اختیار ہی پلنگ سے نیچے اتر گئی۔

وہ اپنا عروسی جوڑا سنبھالتی سست قدموں سے میز کے پاس پہنچی اور دراز سے لائٹر نکال کر ابھی مرتبان کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ پیچھے سے حمدان کی سرگوشی ابھری۔

''اب اس کی ضرورت نہیں۔'' وہ اپنے درمیان خاموشی اور غیر صوتی رابطوں کے عادی تھے جہاں تصور اور خیال پر اس عزیز کا قبضہ انہیں اردگرد کی آہٹوں سے بے نیاز کر دیتا تھا۔ جیسے اس وقت اپنے خیال میں گم اسے کمرے کی کوئی آہٹ سنائی نہیں دی تھی۔ اس کا ہاتھ لرزا اور پیچھے کھڑے حمدان نے اس کے ہاتھ سے لائٹر لے کر میز پر رکھ دیا۔ وہ ہنوز اسی وضع میں ایستادہ تھی۔ ایک دوسرے کے روبرو کھڑے ہو کر بات کرنے کا وقت آ گیا تھا اور یہ کیسے کرنا ہے، وہ اناڑی تھی۔

''جب تم پاس ہو۔'' حمدان نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کے اپنا سر اس کی کنپٹی سے لگایا۔

''تو کمرے میں ان جھوٹے بہانوں اور تسلیوں کی کیا ضرورت!'' اس نے اس کا رخ اپنے سامنے کیا۔

اس روپ میں سامنے دیکھ کر اسے خود ہی خواب کا گماں ہونے لگا۔

''ہم اگر اتنے برسوں کی شناسائی اور ہماری گفتگو کو بیلنس کرنے کی کوشش کریں تو اگلا ایک سال مسلسل باتیں کرتے گزر جائے۔'' اس کی آواز دھیمی تھی لیکن بات میں شامل جذبات اور خواہشات دھیمی نہیں تھیں۔

''اور میرے پاس ہے بھی اتنا کہ کچھ تم سے کہنے کہ یہ بھی پا کافی ہوگا۔'' وہ نظر اٹھا کے اسے دیکھ بھی نہیں پا رہی تھی۔

''یہ خواب نہیں ہے۔'' ذرا دیر کے توقف کے بعد حمدان نے اس کا خیال پڑھ کے جواب دیا۔

آئیدن نے آہستہ سے سر اونچا کیا۔ اس نے بارہا تصور میں منگنی والی شب کی طرح ایک رات سجائی تھی جب اسے بلند آواز میں اس کا نام لینا تھا، چند پل اس چہرے، ان آنکھوں کو دیکھتے رہنا تھا۔

اسے بتانا تھا کہ اس نے اس کی زندگی کو کس قدر خوبصورت بنایا ہے، اسے وہ سب رنگ دکھانے تھے جو اس کے ہونے سے اس کے آس پاس بکھرے رہتے تھے۔

اس سے کہنا تھا کہ وہ دکھی اور افسردہ روح نہیں بلکہ اس نے اسے اس سرزمین پر ایک مست اور بے خود روح میں بدل دیا ہے، جو سیراب ہے، سرخرو ہے، بس ایک ایسی رات کا تصور اور تمنا کی تھی اس نے اور جب وہ بھی سجائی رین حقیقت بنی تو وہ گونگی ہو گئی تھی۔

اس کے چہرے پر رقم سارے احساسات، سارے تشکرات حمدان پڑھ سکتا تھا، پڑھ رہا تھا۔ پھر اس کا خوشی سے لبریز دل، آنکھوں سے چھلکنے کو بے تاب ہوا۔ کب اس کے گمان میں تھا کہ ایک ایسی رین قدرت نے ان کے لیے بھی سجا کے رکھی ہے۔

''کچھ تو کہو۔'' حمدان نے اس کا چہرہ اونچا کیا۔ ایک زمانے کی خاموش مسافت اور صدیوں کا انتظار تھا اس کا اور اب اسے خاموشی نہیں الفاظ اور آواز چاہیے تھی۔

''آج مجھے یقین ہو گیا ہے۔'' اس نے آخر بولنا شروع کیا۔

''کہ طلب کی شدت اور جذبوں کا خلوص دنیا کی سب سے پُراثر دعا ہے۔''

اس کی بڑی بڑی کنڈنی سبز آنکھیں اس وقت بھی بھیگی تھیں۔ اس نے نہ بھی ہاتھ اٹھا کے اس کے حصول کی دعا مانگی تھی نہ دل میں گڑگڑائی تھی کہ اس کی نیت اور مقصد حمدان کی آسانی تھا اور اس نواز نے والے کو تو کوئی بھی ادا بھا جاتی ہے!

''اوہ آئیدن!'' اسے قریب کرتے ہوئے وہ بڑی فراخی سے مسکرایا تھا۔

اتنی بڑی دنیا میں اتنی سی جگہ کی ہی تو خواہش تھی

اسے۔ اس نے آنکھیں موندیں تو گال بھیگ گئے تھے۔

☆☆☆

فراز احمد لوٹ گئے تھے۔ باقی سب بھی جا چکے تھے۔ اگلی صبح سمیعہ کی واپسی تھی۔

''اب یہ تم دونوں پر منحصر ہے اسے ساری عمر راز رکھتے ہو یا دنیا کو اس پریم کہانی کی خبر ہو جاتی ہے۔''

''جو بھی ہو، اب کیا فرق پڑتا ہے۔'' حمدان کو واقعی اب پروا نہیں تھی۔

''مجھے ڈر لگتا ہے کہ یہ سچ جاننے کے بعد امی کے اندر پھر کوئی منفی جذبہ نہ ابھرنے لگے۔'' سمیعہ نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''اب ایسا نہیں ہوگا باجی۔'' اسے یقین تھا کہ وہ ماں کا مزاج اور فطرت جانتا تھا۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''زیادہ دیر باہر مت رکنا۔ موسم ٹھیک نہیں۔ کہیں آمیذن پھر بیمار نہ پڑ جائے۔'' جاتے ہوئے انہوں نے تاکید کی مگر وہ بھی ان کے پیچھے جانے کے لیے کرسی چھوڑے کھڑی ہو گئی۔

''تم کہاں چلیں؟'' ہاتھ پکڑ کے اسے روکتے ہوئے وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

''اندر چلتے ہیں۔''

''کیوں؟ تمہیں ٹھنڈ لگ رہی ہے؟'' حمدان نے اس کے گرد لپٹی شال درست کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔ لیکن۔'' اس نے لاؤنج اور کمروں کی طرف دیکھا۔ ''کوئی بھی ادھر آسکتا ہے۔''

''ہمیں یوں دیکھ کر الٹے پیر واپس بھاگ جائے گا۔''

''یہ اچھی بات تو نہیں۔'' آمیذن کی آواز اتنی دھیمی تھی مانو ڈر ہو کہ کوئی سن نہ لے۔ وہ اس نئی قربت اور بے تکلفی سے مانوس ہو رہی تھی۔

''کیا اچھی بات نہیں؟'' حمدان کے سوال پر وہ کچھ دیر چپ رہی مگر چہرے پر شرمگیں سا تبسم بکھر گیا۔

''میں نے اتنی احتیاط اور اتنا خود کو کنٹرول کیا ہے کہ میرے پاس یہ چیزیں بیلنس بچی ہی نہیں ہیں۔'' حمدان نے اس کے سرخ رخساروں پر آرہی لٹیں پیچھے کیں۔

الماس پروین تب سے اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی لان میں دیکھ رہی تھیں جب وہاں سمیعہ بھی موجود تھیں۔

ان کی باتیں، مسکراہٹیں، ہنسی، آمیذن کی جھجک، شرم اور حمدان کا چہرہ، اس کی نگاہیں۔ انہیں ہمیشہ سمیعہ اور حمدان میں فراز اور وہ نظر آتے تھے اور آج اس تصویر میں انہوں نے ان کے ساتھ آمیذن کو بھی دیکھا۔

کئی منظر واضح ہوئے اور ان کی آنکھوں کے سامنے کڑی سے کڑی جڑتی گئی۔

''حق ہا! میرا بیٹا محبت میں آئے تن لکلا!'' وہ زیر لب بڑبڑائیں۔

لان میں وہ آمیذن کا چہرہ تھام رہا تھا۔ الماس پروین مسکرائیں اور ان کی دائمی خوشیوں کی دعا کرتی وہاں سے ہٹ گئیں۔ وہ جو اپنے بھائی کے لیے نہیں کر سکی تھیں، ان کی بیٹی نے اپنے بھائی کے لیے کر دکھایا تھا اور اس کامرانی کی وجہ یہ فرق تھا کہ دونوں جانب جذبات ایک سے تھے۔ انہیں سمیعہ پر بڑا پیار آیا۔

آمیذن نے گھبرا کے ادھر ادھر دیکھا اور اس کا ہاتھ ہٹانا چاہا لیکن بس سوچ کے رہ گئی۔

''ہم اندر کمرے میں چلیں۔'' اسے سرعام اس کی یہ بے باکیاں بوکھلا رہی تھیں اور جو زبان سے پھسلا، اس پر خود ہی بے طرح خجل ہو گئی۔ حمدان ساختہ زور سے ہنسا۔

''اوہ آمیذن!''

☆☆

آمنہ اشرف

کوشش

"کھانا ایسا بنایا ہے کہ —— حلق سے نیچے نہ اُترے۔" ساس کی سرگوشی اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ "ارے طیبہ! یہ کھانے کی ٹرے اٹھا کر لے جا، ابھی میرا جی متلا رہا ہے۔" صفیہ بیگم نے لہجے کو میٹھا بناتے ہوئے اپنی اکلوتی بہو کو آواز لگائی۔

طیبہ جو اپنی ساس کی سرگوشی سن چکی تھی، اپنے



آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے آئی اور چپ چاپ کھانے کی ٹرے اٹھا کر چل دی، باورچی کھانے میں جا کر ٹرے کاؤنٹر ٹاپ پر رکھ کر طیبہ نے سالن چکھا۔ سالن میں نمک نہ ہونے کے برابر تھا اور گلے میں لگی مرچیں اس بات کا ثبوت دے رہی تھیں کہ شوربا بھی کچا ہی اتار لیا گیا تھا طیبہ سالن کے ذائقہ سے مزید بدمزہ ہوئی۔

وہ برتن دھونے میں مصروف تھی جب اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ ہاتھ دھو کر دوپٹے سے خشک کرنے کے بعد اس نے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔ ”جی ٹھیک ہے، میں پھوپھو کو بتا دیتی ہوں۔ اللہ حافظ۔“

”پھوپھو! حسن کا فون تھا، وہ بتا رہے تھے کہ شام کو عنایا اور واصف ہماری طرف آرہے ہیں۔ کھانے کا اچھا سا انتظام ہونا چاہیے۔“ یہ بات بتاتے ہوئے طیبہ جیسے خود بھی متذبذب تھی۔

”ہائے میری بچی پرائے ملک جا رہی ہے نہ جانے کب واپس لوٹے گی۔ ماں کے گھر سے تو سیر ہو کر جائے۔“ طیبہ کی ساس نے اداسی سے کہا۔ تھوڑی دیر پہلے کی ساس کی سرگوشی نے اس کے ذہن پر دستک دے کر اس کو مزید بوجھل کر دیا۔ ساس، طیبہ کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئیں۔ ”طیبہ، تو ایسا کر کہ تانیہ کو فون کر دے تاکہ وہ آکر کھانے کا انتظام کر دے۔“ صفیہ بیگم نے بڑی بیٹی کو جو کہ پڑوس میں بیاہی گئی تھی بلانے کے لیے کہا۔ طیبہ اپنی بڑی نند کو فون کرنے کے بعد باورچی خانے میں گھس گئی۔

تانیہ کے آنے سے پہلے طیبہ نے کھانا پکانے کے لیے ہر چیز تیار کر رکھی تھی۔

”ماں! کیا کیا بنانا ہے؟“ تانیہ نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

”آجا بیٹھ جا پہلے پانی پی لے سانس تو لے لے۔“ صفیہ، بیٹی کے لیے فکر مند ہوگئیں۔ ”امی، بٹھانے کے لیے بلایا ہوتا تو میں بیٹھ بھی جاتی اب آپ نے بلایا ہی کام کرنے کے لیے ہے تو وہی کرلوں۔“

تانیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا اور چادر اتار کر دوپٹا لیتے ہوئے ماں کا جواب سنے بغیر باورچی خانے کی طرف چل دی۔

”باجی! آپ بیٹھیں، تھوڑی دیر میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

”رہنے دو طیبہ! میں کھانا بناتے ہوئے خود بنا کر پی لوں گی اور مجھے بتا دو کہ کیا کیا پکانا ہے کھانے کا بتا کر تم گھر کا ایک دفعہ جائزہ لے لو۔ کہ کہیں جھاڑ پونچھ کی ضرورت تو نہیں۔“ تانیہ نے بھابھی کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

مہمانوں کے آنے سے پہلے طیبہ سارے گھر کو چمکا چکی تھی۔ تانیہ نے سیدھا سیدھا کھانا رکھا تھا اور کھانا پکا کر وہ ماں کے پاس جا بیٹھی تھی۔ طیبہ کو جب گھر کی صفائی سے فرصت ملی تو اس نے باورچی خانے میں جھانکا جہاں دھونے والے برتن اس کا منہ چڑھا رہے تھے۔ اتنے میں باہر شور و غل بلند ہوا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ مہمانوں کی آمد ہو چکی ہے۔

مہمانوں سے ملنے کے بعد طیبہ نے چائے کے ساتھ لوازمات پیش کیے۔ جب سب چائے پی چکے تو طیبہ نے سارے برتن اٹھائے اور کچن میں جا کر سب برتن دھوئے جبکہ تانیہ ماں، بہن اور بہنوئی کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔

طیبہ برتن صاف کر کے مہمانوں کے پاس بیٹھنے لگی کہ صفیہ بیگم نے حکم صادر کیا۔ ”طیبہ بیٹے کھانا لگا لو۔“ طیبہ نے اثبات میں سر ہلایا اور منظر سے ہٹ گئی۔ کھانا کھانے کے دوران ہر ایک کی زبان پہ تانیہ کے ہاتھ کے بنے کھانے کی تعریف تھی۔ ماں فخر سے اپنے داماد کے سامنے اپنی بیٹیوں کی شان میں قصیدے پڑھ رہی تھیں۔ طیبہ نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ کسی نے اس کو کسی بات میں، کسی رشتے کی حیثیت سے بھی یاد نہیں رکھا۔ کھانا کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔

مہمان رخصت ہوئے تو طیبہ کے سر پہ باورچی خانے میں پھیلے بکھیڑے کو سمیٹنے کی تلوار لٹک رہی تھی۔

ثانیہ بھی اپنے گھر جا چکی تھی۔ وہ رات کو کافی لیٹ باورچی خانے کا کام نپٹا کر جب اپنے کمرے میں گئی تو شوہر کو اپنا منتظر پایا۔

"طیبہ! کہاں رہ گئی تھیں پیٹ بھر کر اتنے مزے کا کھانا کھایا ہے تو نیند آ رہی ہے۔" حسن نے تبصرہ کیا۔

"جی آپ سو جائیں۔ مجھے صبح امی کی طرف بھی چھوڑنے جانا ہے۔ آپ نے۔" طیبہ یہ کہہ کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔

☆☆☆

طیبہ ماں کے گھر آ کر بھی چپ چپ تھی، وہ یہی سوچ کر اداس تھی کہ کسی نے اس کو نہیں سراہا۔ کوئی اس کی محنت کو خاطر میں نہیں لایا، سب نے صرف کھانے کی تعریف کی۔ اب وہ ماں کی طرف آئی ہے تو تھوڑا بہت کھانا بنانا سیکھ کر جائے گی۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کیا۔

شام کو باورچی خانے میں کھانا بنانے جانے لگی تو بھابی نے نہیں جانے دیا کہ "دو دن کی مہمان ہو۔ مزے کرو، آرام کرو، سسرال میں یہی کچھ تو کرنا ہے۔" طیبہ خاموشی سے ماں کے پاس بیٹھ گئی۔ طیبہ کی ماں کو ساری بات سمجھ میں آ گئی کہ میری بیٹی سسرال میں کھانا پکانا نہ آنے کی وجہ سے مات کھا رہی ہے باقی تو اسے ہر کام بخوبی آتا ہے۔

"طیبہ بیٹی! ایک دو دن میں کوئی کام احسن طریقے سے نہیں سیکھا جا سکتا گھر جا کر روز کچھ نہ کچھ دل سے پکاؤ۔ میری بیٹی سیکھ جائے گی۔" ماں نے شفقت سے سمجھایا۔

"جی امی میں سیکھ لوں گی۔" طیبہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ گھر آنے کے بعد جو پہلا سوال کیا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ کھانے میں کیا پکا ہے تو بیٹی کو گھر سے ہی سب کچھ سمجھا کر اور سکھا کر بھیجنا چاہیے۔ ماں کے دل میں ملال اٹھا۔ ادھر طیبہ کو بھی افسوس تھا کہ اس نے خود کو محض تعلیم حاصل کرنے میں ہی کیوں مگن رکھا۔ عملی زندگی کے لیے خود کو تیار کیوں نہیں کیا؟

شادی کوئی فیری ٹیل نہیں ہے وہی لڑکیاں سسرال میں اپنا نام بناتی ہیں جو ماں باپ کے گھر سے ہی بنیادی کام، رکھ رکھاؤ اور سلیقہ سیکھ کر گئی ہوں۔ جنہوں نے محض ایک ہی چیز کو اپنا جنون نہ بنایا ہو۔ اور جو ایسا نہیں کرتیں اور سسرال میں صرف خواب سجا کر جاتی ہیں، بعد میں سسرالی زندگی میں ان کو طیبہ کی طرح شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔

☆☆☆

طیبہ چار دن بعد جب سسرال واپس لوٹی تو عزم کر چکی تھی کہ وہ کسی کی بات کو دل پہ لگا کر اپنی بہتری کا سفر نہیں روکے گی۔

رات کو جب سب کھانا کھا رہے تھے تو طیبہ اپنی ساس سے بلند آواز میں مخاطب ہوئی۔

"پھوپھو! تعلیمی مصروفیت اور لاڈ پیار کی وجہ سے میں نے ایک بنیادی اور اہم ہنر کو پس پشت ڈال دیا اور میں سمجھتی ہوں کہ اس میں میری غلطی ہے کیونکہ سمجھ دار تو وہی ہوتا جو اپنی ذمہ داریاں بخوبی ادا کرتا ہے میں بھی اپنی غلطی تسلیم کر کے اپنی ذمہ داری قبول کرتی ہوں اور اب دل سے کھانا بنانا سیکھوں گی۔"

طیبہ کی اس بات پہ ساس مسکرا دیں اور دل سے اپنی بہو کو دعا دی۔ اگلے ایک ماہ طیبہ نے اپنی ساس اور نند کے زیر نگرانی کھانا بنانا سیکھا۔

چند دنوں بعد حسن کی پروموشن کی خوشی میں گھر میں ایک چھوٹی سی دعوت کا انتظام کیا گیا۔ جس میں طیبہ کے میکے والے بھی مدعو تھے۔ دعوت کا سارا کھانا طیبہ نے پکایا۔ کھانا بے حد لذیذ تھا سب نے دل کھول کر کھانے کی تعریف کی۔ "بالآخر میری بیوی نے کر دکھایا۔" حسن نے ستائشی انداز میں کہا تو طیبہ شرما گئی۔ وہ دل سے رب کی شکر گزار تھی۔ اس نے چاہ دکھائی اور رب نے اس کو اس چیز پر مہارت بخش دی۔ غلطیاں زندگی کا حصہ ہیں لیکن ان کو تسلیم کر کے اچھی نیت کے ساتھ سچے دل سے خود کو بدلنے کی کوشش کرنا دانش مندی ہے۔

☆☆

آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے آئی اور چپ چاپ کھانے کی ٹرے اٹھا کر چل دی، باورچی کھانے میں جا کر ٹرے کاؤنٹر ٹاپ پر رکھ کر طیبہ نے سالن چکھا۔ سالن میں نمک نہ ہونے کے برابر تھا اور گلے میں لگی مرچیں اس بات کا ثبوت دے رہی تھیں کہ شوربا بھی کچا ہی اتار لیا گیا تھا طیبہ سالن کے ذائقہ سے مزید بدمزہ ہوئی۔

وہ برتن دھونے میں مصروف تھی جب اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ ہاتھ دھو کر دوپٹے سے خشک کرنے کے بعد اس نے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔ ”جی ٹھیک ہے، میں پھوپھو کو بتا دیتی ہوں۔ اللہ حافظ۔“

”پھوپھو! حسن کا فون تھا، وہ بتا رہے تھے کہ شام کو عنایا اور واصف ہماری طرف آ رہے ہیں۔ کھانے کا اچھا سا انتظام ہونا چاہیے۔“ یہ بات بتاتے ہوئے طیبہ جیسے خود بھی متذبذب تھی۔

”ہائے میری بچی پرائے ملک جا رہی ہے نہ جانے کب واپس لوٹے گی۔ ماں کے گھر سے تو سیر ہو کر جائے۔“ طیبہ کی ساس نے اداسی سے کہا۔ تھوڑی دیر پہلے کی ساس کی سرگوشی نے اس کے ذہن پر دستک دے کر اس کو مزید بوجھل کر دیا۔ ساس، طیبہ کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئیں۔ ”طیبہ، تو ایسا کر کہ تانیہ کو فون کر دے تا کہ وہ آ کر کھانے کا انتظام کر دے۔“ صفیہ بیگم نے بڑی بیٹی کو جو کہ پڑوس میں بیاہی گئی تھی بلانے کے لیے کہا۔ طیبہ اپنی بڑی نند کو فون کرنے کے بعد باورچی خانے میں گھس گئی۔

تانیہ کے آنے سے پہلے طیبہ نے کھانا پکانے کے لیے ہر چیز تیار کر رکھی تھی۔

”ماں! کیا کیا بنانا ہے؟“ تانیہ نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

”آ جا بیٹھ جا پہلے پانی پی لے سانس تو لے۔“ صفیہ، بیٹی کے لیے فکرمند ہوگئیں۔ ”امی، بٹھانے کے لیے بلایا ہوتا تو میں بیٹھ بھی جاتی اب آپ نے بلایا ہی کام کرنے کے لیے ہے تو وہی کر لوں۔“

تانیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا اور چادر اتار کر دوپٹا لیتے ہوئے ماں کا جواب سنے بغیر باورچی خانے کی طرف چل دی۔

”باجی! آپ بیٹھیں، تھوڑی دیر میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

”رہنے دو طیبہ! میں کھانا بناتے ہوئے خود بنا کر پی لوں گی اور مجھے بتا دو کہ کیا کیا پکانا ہے کھانے کا بتا کر تم گھر کا ایک دفعہ جائزہ لے لو۔ کہ کہیں جھاڑ پونچھ کی ضرورت تو نہیں۔“ تانیہ نے بھابھی کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

مہمانوں کے آنے سے پہلے طیبہ سارے گھر کو چمکا چکی تھی۔ تانیہ نے سیدھا سیدھا کھانا رکھا تھا اور کھانا پکا کر وہ ماں کے پاس جا بیٹھی تھی۔ طیبہ کو جب گھر کی صفائی سے فرصت ملی تو اس نے باورچی خانے میں جھانکا جہاں دھونے والے برتن اس کا منہ چڑھا رہے تھے۔ اتنے میں باہر شوروغل بلند ہوا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ مہمانوں کی آمد ہو چکی ہے۔

مہمانوں سے ملنے کے بعد طیبہ نے چائے کے ساتھ لوازمات پیش کیے۔ جب سب چائے پی چکے تو طیبہ نے سارے برتن اٹھائے اور کچن میں جا کر سب برتن دھوئے جبکہ تانیہ ماں، بہن اور بہنوئی کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔

طیبہ برتن صاف کر کے مہمانوں کے پاس بیٹھنے لگی کہ صفیہ بیگم نے حکم صادر کیا۔ ”طیبہ بیٹے کھانا لگا لو۔“ طیبہ نے اثبات میں سر ہلایا اور منظر سے ہٹ گئی۔ کھانا کھانے کے دوران ہر ایک کی زبان پہ تانیہ کے ہاتھ کے بنے کھانے کی تعریف تھی۔ ماں فخر سے اپنے داماد کے سامنے اپنی بیٹیوں کی شان میں قصیدے پڑھ رہی تھیں۔ طیبہ نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ کسی نے اس کو کسی بات میں، کسی رشتے کی حیثیت سے بھی یاد نہیں رکھا۔ کھانا کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔

مہمان رخصت ہوئے تو طیبہ کے سر پہ باورچی خانے میں پھیلے بکھیڑے کو سمیٹنے کی تلوار لٹک رہی تھی۔

ثانیہ بھی اپنے گھر جا چکی تھی۔ وہ رات کو کافی لیٹ باورچی خانے کا کام نپٹا کر جب اپنے کمرے میں گئی تو شوہر کو اپنا منتظر پایا۔

"طیبہ! کہاں رہ گئی تھیں پیٹ بھر کر اتنے مزے کا کھانا کھایا ہے تو نیند آرہی ہے۔" حسن نے تبصرہ کیا۔

"جی آپ سوجائیں۔ مجھے صبح امی کی طرف بھی چھوڑنے جانا ہے۔ آپ نے۔" طیبہ یہ کہہ کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔

☆☆☆

طیبہ ماں کے گھر آکر بھی چپ چپ تھی، وہ یہی سوچ کر اداس تھی کہ کسی نے اس کو نہیں سراہا۔ کوئی اس کی محنت کو خاطر میں نہیں لایا، سب نے صرف کھانے کی تعریف کی۔ اب وہ ماں کی طرف آئی ہے تو تھوڑا بہت کھانا بنانا سیکھ کر جائے گی۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کیا۔

شام کو باورچی خانے میں کھانا بنانے جانے لگی تو بھابھی نے نہیں جانے دیا کہ "دو دن کی مہمان ہو۔ مزے کرو، آرام کرو، سسرال میں یہی کچھ تو کرنا ہے۔" طیبہ خاموشی سے ماں کے پاس بیٹھ گئی۔ طیبہ کی ماں کو ساری بات سمجھ میں آگئی کہ میری بیٹی سسرال میں کھانا پکانا نہ آنے کی وجہ سے مات کھا رہی ہے باقی تو اسے ہر کام بخوبی آتا ہے۔

"طیبہ بیٹی! ایک دو دن میں کوئی کام احسن طریقے سے نہیں سیکھا جا سکتا گھر جا کر روز کچھ نہ کچھ دل سے پکاؤ۔ میری بیٹی سیکھ جائے گی۔" ماں نے شفقت سے سمجھایا۔

"جی امی میں سیکھ لوں گی۔" طیبہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ گھر آنے کے بعد جو پہلا سوال کیا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ کھانے میں کیا پکا ہے تو بیٹی کو گھر سے ہی سب کچھ سمجھا کر اور سکھا کر بھیجنا چاہیے۔ ماں کے دل میں ملال اٹھا۔ ادھر طیبہ کو بھی افسوس تھا کہ اس نے خود کو محض تعلیم حاصل کرنے میں ہی کیوں مگن رکھا۔ عملی زندگی کے لیے خود کو تیار کیوں نہیں کیا؟

شادی کوئی فیری ٹیل نہیں ہے وہی لڑکیاں سسرال میں اپنا نام بناتی ہیں جو ماں باپ کے گھر سے ہی بنیادی کام، رکھ رکھاؤ اور سلیقہ سیکھ کر گئی ہوں۔ جنہوں نے محض ایک ہی چیز کو اپنا جنون نہ بنایا ہو۔ اور جو ایسا نہیں کرتیں اور سسرال میں صرف خواب سجا کر جاتی ہیں، بعد میں سسرالی زندگی میں ان کو طیبہ کی طرح شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔

☆☆☆

طیبہ چار دن بعد جب سسرال واپس لوٹی تو عزم کر چکی تھی کہ وہ کسی کی بات کو دل پہ لگا کر اپنی بہتری کا سفر نہیں روکے گی۔

رات کو جب سب کھانا کھا رہے تھے تو طیبہ اپنی ساس سے بلند آواز میں مخاطب ہوئی۔

"پھوپھو! تعلیمی مصروفیت اور لاڈ پیار کی وجہ سے میں نے ایک بنیادی اور اہم ہنر کو پس پشت ڈال دیا اور میں سمجھتی ہوں کہ اس میں میری غلطی ہے کیونکہ سمجھ دار تو وہی ہوتا جو اپنی ذمہ داریاں بخوبی ادا کرتا ہے میں بھی اپنی غلطی تسلیم کر کے اپنی ذمہ داری قبول کرتی ہوں اور اب دل سے کھانا بنانا سیکھوں گی۔"

طیبہ کی اس بات پہ ساس مسکرا دیں اور دل سے اپنی بہو کو دعا دی۔ اگلے ایک ماہ طیبہ نے اپنی ساس اور نند کے زیر نگرانی کھانا بنانا سیکھا۔

چند دنوں بعد حسن کی پروموشن کی خوشی میں گھر میں ایک چھوٹی سی دعوت کا انتظام کیا گیا۔ جس میں طیبہ کے میکے والے بھی مدعو تھے۔ دعوت کا سارا کھانا طیبہ نے پکایا۔ کھانا بے حد لذیذ تھا سب نے دل کھول کر کھانے کی تعریف کی۔ "بالآخر میری بیوی نے کر دکھایا۔" حسن نے ستائشی انداز میں کہا تو طیبہ شرما گئی۔ وہ دل سے رب کی شکر گزار تھی۔ اس نے چاہ دکھائی اور رب نے اس کو اس چیز پر مہارت بخش دی۔ غلطیاں زندگی کا حصہ ہیں لیکن ان کو تسلیم کر کے اچھی نیت کے ساتھ سچے دل سے خود کو بدلنے کی کوشش کرنا دانش مندی ہے۔

☆☆

سمیرا حمید

پردیس

اجالا گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی تھی ایک شادی کی تقریب میں برطانیہ سے اس کے دور کے رشتے دار آتے ہیں۔ آنٹی اپنے بیٹے شہریار کے لیے اسے پسند کر لیتی ہیں۔ اس کا رشتہ مانگتی ہیں۔ گاؤں میں سب اس کی قسمت پر رشک کرتے ہیں کہ اجالا بیاہ کر امریکا چلی جائے گی۔

شادی کے بعد امریکہ آکر اجالا پر انکشاف ہوتا ہے کہ شہریار پہلے بھی ایک شادی کر چکا تھا۔ گاؤں میں آنٹی کے کیے سارے دعوے جھوٹے تھے، امریکا میں وہ اور ان کے سارے بچے نوکری کر کے گزارا کرتے ہیں جبکہ اجالا کو نوکری کر کے نہ صرف اپنا بلکہ شہریار کا بوجھ بھی اٹھانا ہے۔ شہریار یکسر مختلف انسان ہے۔ جس میں اخلاقی برائیاں ہیں پر اب وہ بری طرح ان کے چنگل میں پھنس چکی تھی جس سے فرار مشکل تھی۔

ادھر گاؤں میں سب آنٹی کے دکھائے سہانے سپنوں کو سچ سمجھتے ہیں۔ شہریار اسے شراب کی فیکٹری میں ملازمت دلواتا ہے اور اس کے لیے اس کے خوب صورت لمبے بال کٹوا دیتا ہے۔ شراب کی فیکٹری میں اجالا کے لیے مسائل پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اسے جاب چھوڑنا پڑتی ہے۔

اجالا کی دونوں نندوں کا رویہ اس سے اچھا ہے آنٹی کے رویے کے باعث عینی ان سے دور جاب کرنے پر مجبور ہے۔ سارہ یونی ورسٹی میں عورتوں کی آزادی کے لیے بڑھ چڑھ کر بولتی ہے۔ اجالا ایک ڈاکٹر کے گھر میں الماس کے ساتھ کام کرتی ہے جس کی دوسری کم عمر بیوی روشن پر اس کی ساس نندیں تشدد کرتی رہتی ہیں۔ اجالا روشن کو اس چنگل سے نکالنے کے لیے سارہ کی مدد لیتی ہے تا کہ روشن پاکستان اپنی بیمار ماں کے پاس لوٹ جائے وہ کامیاب ہو جاتی ہے اس سلسلے میں پاکستانی قونصل خانہ ان کی مدد کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے گھر والوں کو سخت سزا ملنے کا امکان ہے لیکن وہ حیلے بہانے کر کے روشن سے ملتے ہیں اور اسے بہلا پھسلا کر قائل کر لیتے ہیں عدالتی کارروائیاں شروع ہو جاتی ہیں۔

بالآخر روشن کو ڈاکٹر صاحب کی قید سے چھٹکارہ مل جاتا ہے وہ اپنی وکیل کی لاکھ منتوں کے باوجود ان پر کوئی کیس کرائے بغیر اپنے گاؤں چلی جاتی ہے۔

اجالا الماس کے ذریعے ایک نئی جگہ کام کرتی ہے جہاں گاؤں سے آئی گل باجی بظاہر خوش نظر آنے والے خاندان کے ساتھ رہتی ہیں ان کی خوب صورت بیٹی اپنے خاندانی روایات کے خلاف صحافی بننا چاہتی ہے باپ اس کا نکاح ایک بچے کے باپ سے کرنا چاہتا ہے اور وہ عین نکاح سے فرار ہو جاتی ہے۔

آٹھویں قسط

گل کی مشعل......
اندھیروں کی مشعل......

بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں۔ گھر کی رونق ہوتی ہیں۔ ان کی ہنسی کی آواز دل کی اداسی دور کر دیتی

مکمل ناول



ہے۔خزاں ویرانوں میں صرف ایک عورت کی ہنسی بہار لے آتی ہے۔اس کی آواز کا ترنم کوئی غم بھلا دیتا ہے۔

ایک عورت......صرف ایک وجود......اس کے بغیر اس جہاں کا حسن پھیکا ہے۔یہ ہنستی ہے تو ہنسا دیتی ہے۔روتی ہے تو رلا دیتی ہے۔چیزیں اس کے حق میں نہیں بدلتیں، تو یہ خود بدل جاتی ہے۔

حقیقتیں اس کے لیے تلخ رہتی ہیں، یہ اپنی تلخی مٹا دیتی ہے۔گیلی مٹی کے مزاج سی عورت، حالات کے چاک پر بدلتی چلی جاتی ہے۔اس کی مورت، اندھیرا، اجالا، سلسلوں میں ڈھلتی بدلتی رہتی ہے۔

☆☆☆

اندھیرا گہرا......

گل بستر پر نیم خوابیدہ پڑی تھی۔اس کی پلکیں لرز رہی تھیں۔جاگی سوئی آنکھیں تھرا رہی تھیں۔جب جب اس کی آنکھ کھلتی، وہ اندھیرے میں بنتی بگڑتی تصویریں دیکھ کر بے قراری سے کلبلانے لگتی تھی۔چیخ اس کے حلق میں دب کر رہ جاتی تھی۔اس کے پورے وجود کو باندھ دیا گیا تھا۔وہ بے بس کیفیت میں تھی۔اسے پیروں کی طرف مشعل دکھائی دی۔اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔

"تم آگئیں......تم سے کہا تھا گھر نہ آنا......"

"آپ بھول گئیں؟ آپ نے ہی کہا تھا گھر آجاؤ......"

"میں نے......کب؟"

"فون پر......"

"مجھے تمہاری یاد آرہی تھی مشعل! میں تمہاری تصویریں دیکھتی رہتی ہوں۔میں نہیں جانتی تھی، میں تمہیں اتنا یاد کروں گی۔ماں کی جان، ادھر آؤ......اب کہیں نہ جانا......ادھر بیٹھو......"

مشعل نے بڑھ کر اپنی ماں کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آپ کو تیز بخار ہے۔"

"یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا۔میں نے کہاں اللہ کو ناراض کر دیا۔اس اللہ نے مجھ پر رحم کرنا کیوں چھوڑ دیا......واپس آجاؤ......ورنہ مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ......یہ میں نے کیا کر دیا۔" وہ خود نہیں جانتی تھی وہ کیا کہہ رہی ہے۔

"آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

"تم چھوٹی سی تھیں جب میں تمہیں گود میں بھر کر تم سے ڈھیروں باتیں کیا کرتی تھی۔گاؤں میں میری ایک سہیلی تھی، اس کی بہت دور دوسرے گاؤں میں شادی ہو گئی۔اس کے چلے جانے پر میں بہت روئی تھی۔جب تم پیدا ہوئیں تو مجھے ایسا لگا میری سہیلی واپس آگئی۔"

"آج سے پہلے آپ نے کبھی مجھے سہیلی نہیں کہا تھا۔" وہ ہنس دی۔

"مجھے ڈر تھا کہ تم بھی دور نہ چلی جاؤ۔مائیں بیٹیوں کو سہیلی بنا لیں تو پھر ان پر حکم نہیں چلا سکتیں، ان پر سختی نہیں کر سکتیں۔"

مشعل ہنس دی۔"یہ تو ڈبل گیم ہو گئی ماما! بڑی چالاک ہیں آپ۔"

"ابھی مجھے تمہیں وہ دکھ بتانے تھے جو میرے سینے میں دفن ہیں۔یہ دکھ میرا سینہ چھلنی کرتے ہیں مشعل۔تم سے وہ باتیں کرنی تھیں جو ایک ماں صرف اپنی بیٹی سے کر سکتی ہے۔ابھی......ابھی تو مجھے تمہاری پیشانی چومنی تھی۔تمہاری آنکھوں پر پیار کرنا تھا۔میں نے تمہیں جی بھر کر دیکھا ہی نہیں۔ہمیشہ کاموں میں مصروف رہی......تمہیں دیکھنا بھول گئی......میری بیٹی کتنی حسین ہے......تم حور لگتی ہو......جب تم بالوں میں سرخ رومال باندھتی ہو تو میری تم پر سے نظریں نہیں ہٹتیں۔ایک دن شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر تم فرضی رپورٹنگ کر رہی تھیں۔تمہاری چیزیں فرش پر بکھری ہوئی تھیں اور وہی تمہاری رپورٹنگ کا جائے وقوعہ تھیں۔میں دروازے کی اوٹ سے تمہیں دیکھتی رہی۔تمہیں دیکھ دیکھ کر میں نہال ہوتی رہی۔"

''یعنی آپ میری رپورٹنگ کی پہلی سامع ہیں۔''

''مجھے تمہاری ساری باتیں پسند ہیں۔ میں چاہتی تھی کہ تم جرنلسٹ بن جاؤ۔ مجھے اس میں کوئی برائی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ تم اپنا ہر خواب سچ کر دکھاؤ۔ میں تمہارے ساتھ کھڑی ہونا چاہتی تھی۔ تمہاری ماں خواب دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکی، لیکن وہ تمہاری جرأت کو پسند کرتی تھی۔''

''آپ نے کبھی میری حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ہمیشہ مجھے ڈانٹ کر چپ کروا دیا۔''

''ہاں! کیونکہ تمہارے خوابوں کو قبول کر لینے کی جرأت بھی میرے اندر نہیں تھی۔ لیکن میری بچی! مجھے تم پر یقین تھا۔ میں نے کبھی تم پر شک نہیں کیا۔ میں جانتی تھی کہ تم نالاں ہو باغی نہیں۔ میں سب جانتی تھی مشعل! لیکن بڑی مجبور ہوں۔''

''اگر مجبور نہ ہوتیں تو مجھے اس حال تک نہ پہنچاتیں؟'' مشعل نے ناراضی سے کہا۔

''میری حالت تمہارے سوال کا جواب ہے۔ میری ماں کہتی تھی، عورت ساری عمر جدائیاں کاٹتی رہتی ہے۔ وہ سچ کہتی تھی۔ پہلے میں سہیلی کی جدائی سے گزری، پھر ماں سے جدا ہونا پڑا، اور اب بیٹی سے۔ میری مشعل مجھ سے دُور ہو گئی۔''

''چلیں پھر سچ بتا دیں کہ میں جرنلسٹ بن جاؤں گی تو آپ خوش ہوں گی۔''

''ہاں...... بہت...... اگر میں کمزور نہ ہوتی تو تمہیں اپنے سینے سے لگا کر رکھتی، ورنہ تمہیں لے کر کہیں دُور نکل جاتی۔'' گل بڑبڑا رہی تھی۔

وہ جھک کر ماں کی پیشانی چومنے لگی۔ ''آپ مجھ سے اتنی محبت کیوں کرتی ہیں۔''

''تم میرا حصہ ہو...... تم سے محبت لازم ہے......''

خوشی سے مشعل کے گال دہکنے لگے۔ وہ نرمی سے ماں کے گال سہلانے لگی۔

''تم نے اپنے باپ سے بات کی......''

''ہاں! انہوں نے کہا، وہ ٹیبل ٹاک کے لیے تیار ہیں۔''

☆☆☆

ٹیبل ٹاک...... یہ فقرہ بازگشت بن گیا۔ اس کی گونج نے گل کو بیدار کر دیا۔ گل نے نیم اندھیرے کمرے میں سر گھما کر دیکھا۔

''مشعل...... مشعل...... تم سے کہا تھا میرے پاس رہنا۔ ماں کے پاس آؤ۔''

وہ اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے دیور کی بیوی مینا کمرے میں آئی۔

''گل بھابھی! اٹھ گئیں...... سوپ لاؤں...... آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے لیکن پہلے کچھ کھا لیں۔''

اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا کہ وہ گھر میں کب آئی۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''آپ گر گئی تھیں، کاکا نے فون کر کے بلایا تھا۔ اُٹھ جائیں گل بھابھی! آپ نے دوا کھانی ہے۔ کاکا بہت ناراض ہو رہے ہیں۔''

''میں سو رہی تھی......''

وہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی کہ وہ گری کیوں تھی۔ کیا ہوا تھا۔

''مشعل کہاں گئی...... اپنے کمرے میں ہے...... بلاؤ اسے......''

مینا نظریں چرا گئی۔ ''نہیں گل بھابھی! مشعل کیوں آئے گی...... وہ......''

ایک دم سے گل کو پولیس اور سارا منظر یاد آ گیا۔ جھٹکے سے لحاف کو خود پر سے کھینچا اور پیر نیچے اتارے۔ اٹھ کر کھڑی ہوئی تو لرزتی ہوئی ٹانگوں نے اسے واپس بیڈ پر گرا دیا۔ سر میں درد کا طوفان آ گیا۔ اس کی نظر سامنے کھڑکی پر پڑی۔ یہ کھڑکی، ہر کھڑکی، اس یاد دلاتی تھی کہ اس کی بیٹی چھین لی گئی ہے۔ اس پر دروازے کا راستہ تنگ نہ ہوتا تو وہ کھڑکی کا راستہ نہ اپناتی۔

''گل بھابھی! آپ جب ہوش میں آتی ہیں

بھی کرتی ہیں۔ کاکا کتنی بار مجھے کہہ چکے ہیں کہ آپ کو ہوش میں لاؤں۔ دیکھیں، گھر کی کیا حالت ہو گئی ہے۔ بچوں نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا۔ تھوڑی ہمت کریں، چلیں میرے ساتھ۔"

مینا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا کہ اسے سہارا دے کر کھڑا کر سکے۔ اس نے مینا کا ہاتھ جھٹک کر پرے کیا۔

"گل بھابھی! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔"

جواب دیے بغیر وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ گہرا سانس کھینچ کر دیوار پر ہاتھ ٹکا دیا۔

"تمہارے کاکا کہاں ہیں؟"

"نیچے......"

"تم چلو، میں آرہی ہوں۔"

"کتنی ضدی ہیں آپ۔" وہ چڑ گئی۔ سہارے کے لیے کمر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مینا پرے ہو جاؤ، مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ مشعل آئی تھی، تم جھوٹ بول رہی ہو۔ بختیار نے ضرور کچھ کہا ہوگا۔ مجھے اپنی بہن کہتی ہو اور مجھ سے چھپاتی ہو۔"

"جب میں گھر آئی تو مشعل یہاں نہیں تھی، میں کچھ نہیں جانتی۔" اس نے نرمی سے بتایا۔

"تم سب جھوٹ بولتے ہو۔ تم اپنے کاکا سے ڈرتی ہو۔ وہ آئی تھی، بختیار نے اسے مارا ہوگا۔" کہتے کہتے وہ ہانپ گئی۔

"گل بھابھی! میں کل رات سے یہاں ہوں، میرے سامنے ایسا کچھ نہیں ہوا۔ لیکن آپ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔"

اس نے بے زاری سے مینا کی طرف دیکھا۔ اسے ہر انسان سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ قدموں کو گھسیٹتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ در و دیوار پانی میں ڈوب رہے تھے۔ ہر شے ہوا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ شاید دوا کا اثر تھا۔ وہ گرنے لگی تو مینا نے لپک کر سہارا دے کر تھام لیا۔ بڑی مشقت سے وہ نیچے آئی۔ بختیار اسپورٹس دیکھ رہے تھے۔ دونوں بچے اپنے کمرے میں تھے۔ ہانپتی ہوئی وہ بختیار کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔

"میری مشعل کہاں ہے بختیار؟"

بختیار نے ٹی وی سے سر گھما کر گل کی طرف دیکھا۔

"میں نہیں جانتا گل......"

"پولیس......وہ کیوں آئی تھی......"

"وہ کالج نہیں جا رہی، اس کی فرینڈز نے رپورٹ کی تھی۔ پولیس پوچھنے کے لیے گھر آئی تھی۔"

بختیار کی شکل بگڑ گئی۔ وہ ہیبت ناک دکھائی دینے لگا۔ درد کا طوفان جھٹکوں میں بدل گیا۔ سر اتنا وزنی ہو گیا کہ گل کے لیے اس کا بوجھ سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

"آپ نے کیا بتایا پولیس کو؟"

"جو سچ تھا بتا دیا......وہ اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر گئی ہے۔ وہ کہاں ہے اور کیسی ہے ہم نہیں جانتے۔"

"ہم؟" گل نے سوالیہ پوچھا۔

بختیار نے اطمینان سے کہا۔ "تم جانتی ہو وہ کہاں ہے؟"

مینا نے گل کو سہارا دے کر بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ گل نے پھر سختی سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"یہی تو میں پوچھ رہی ہوں، وہ کہاں ہے؟"

وہ نکتہ جہاں بچا کھچا ہوش بھی ہاتھ سے پھسل جائے، گل اس وقت اس نکتے پر تھی۔ وہ کسی بھی لمحے مکمل دیوانگی کی طرف چھلانگ لگا جانے کو تھی۔

"مینا! تم نے گل کو کھانا کھلا دیا؟"

"گل بھابھی کچھ کھا ہی نہیں رہیں۔ الٹا مجھ پر ناراض ہو رہی ہیں۔"

بختیار نے سخت نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ "گل! تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔"

گل نے سر ہلا دیا۔ "ہاں میں نے وعدہ کیا تھا......وعدہ......مجھے یاد ہے......ایک وعدہ ...... مجھے ازبر ہے۔"

وہ بچوں کی طرح سر ہلاتے ہوئے تکرار کرنے لگی۔ مینا نے درد بھری نظر سے گل کی طرف دیکھا۔

"میں نے وعدہ کیا تھا...... میں وعدہ نہیں توڑوں گی......"

وہ بختیار کے صوفے کے قریب کارپٹ پر بیٹھتی چلی گئی۔ صوفے کے کنارے پر سر رکھ دیا۔ وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ مینا نے اس کے گال پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے تھپکا۔

"گل بھابھی! ہوش کریں......"

لیکن صوفے پر سر ٹکائے وہ بڑبڑاتی رہی۔

"میں نے وعدہ کیا ہے...... تم نے بھی وعدہ کیا ہے......"

☆☆☆

ان کے درمیان وعدہ ہوا تھا۔

مشعل کے گھر سے جانے کے ڈیڑھ ماہ بعد وہ بختیار کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ جب سے مشعل گئی تھی انہوں نے کبھی مل بیٹھ کر بات نہیں کی تھی۔ وہ بختیار سے نظریں چراتی رہتی تھی۔ وہ اسٹور کی رسیدیں پھیلائے، رجسٹر میں اندراج کر رہا تھا۔ وہ چپ کھڑی رہی۔ بختیار نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"گل......" سوالیہ پوچھا۔

"میں نے آج تک اپنے لیے کچھ نہیں مانگا۔"

بختیار نے گہرا سانس لیا۔ وہ جانتا تھا وہ کیا کہنے آئی ہے۔ پھیلی ہوئی چیزوں کو ہاتھ سے پرے کیا۔ وہ اس کو سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو چکا تھا۔

"بختیار! میرا یقین کرو، میں ہر وقت اسے سمجھاتی رہتی تھی۔ اس کے ساتھ سختی کی، اس سے ناراض ہوئی۔ اس سے کہا کہ میں کبھی تمہاری شکل نہیں دیکھوں گی اگر تم نے اپنے پاپا کی بات نہ مانی۔ بختیار! میں نے ہر طرح سے اس کو سیدھا کرنا چاہا لیکن وہ بہت ضدی نکلی۔"

"میں جانتا ہوں۔" بختیار نے سرد مہری سے کہا۔ "مجھے اس سے متعلق کوئی بات نہیں کرنی گل!"

"ہاں ہاں! میں بھی کبھی اس کا ذکر نہیں کروں گی۔" وہ صوفے کے کنارے پہ بیٹھ گئی اور اپنے شوہر کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"اس کا فون آیا تھا، وہ رو رہی تھی...... وہ تم سے محبت کرتی ہے۔"

"اب وہ اس گھر میں کبھی نہیں آسکتی۔"

"میں نے اسے بتا دیا ہے۔ میں خود اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔ من مانی کی عادت پڑ چکی تھی اسے...... ت...... تم......"

بختیار کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

"تم اس پر سب دروازے بند رکھو...... نافرمان اولاد...... سر پھری......"

زلزلے زمین کی تہوں میں قید ہوتے ہیں اور اندیشوں کی آندھیاں ماں کے سینے میں۔ اولاد کے لیے وہ پل پل کئی طوفانوں سے گزرتی ہے۔

باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ کئی فٹ اونچی برف جمی ہوئی تھی۔ برفیلی بارش اسے کبھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ ایک عجیب طرح کی بے قراری محسوس کرتی تھی۔ موسم درد مقید کر لیتے ہیں۔ کچھ ماضی کے، کچھ آنے والے کل کے۔

"گل! تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

بڑی لڑکیوں والے گھر کی مالکن چھوٹی ہمت کو بڑا کرنے لگی۔

"تم اسے کچھ مت کہنا...... اس...... اسے کوئی نقصان نہ پہنچانا۔ ہم سمجھ لیتے ہیں کہ ہماری کوئی بیٹی تھی ہی نہیں۔" برفیلے موسم کا درد، سائبان کے اندر در آیا۔

"رزق مرد کماتا ہے...... عزت عورت کماتی ہے......"

"جانتی ہوں...... مم......"

"ہم کسی سے رزق نہیں چھینتے اور عزت چھیننے نہیں دیتے۔" بختیار کے لہجے میں اس کے آبائی گاؤں کے سارے مرد للکار رہے تھے۔

"وہ ہماری سگی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔"

لوگ کہتے ہیں قیامت آئے گی، آئے گی۔ وہ

یہ نہیں جانتے کہ قیامت کئی بار آتی ہے، ایک ماں پر تو بہت بار آتی ہے۔

"میں سب جانتی ہوں، تم میرے ٹکڑے کر دو، میں اُف نہیں کروں گی۔ تم میرے دل کے ٹکڑے کو کچھ نہ کہنا۔"

عورت ماں بن جاتی ہے تو پھر وہ صرف ماں ہی رہ جاتی ہے۔ بیوی، بہن، بیٹی، عورت، ہر عہدے کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ وہ کتنی ہی قسمیں کھائے، عہد نبھائے، لیکن وہ صرف "اولاد" سے محبت کرتی رہ جاتی ہے۔

"مجھ سے وعدہ کرو...... مشعل ......اسے کچھ......" گل نے بختیار کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر وعدہ لینا چاہا۔

بختیار گہری نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ گل سے شادی اس کی ماں کی پسند سے ہوئی تھی، لیکن اس کی اپنی پسند زیادہ تھی۔ گل کے کئی طلب گار تھے۔ وہ امریکا سے ماں کو خط لکھتا تھا کہ وہ گل کا رشتہ کہیں اور نہ ہونے دے۔ ان دنوں اسے لگتا تھا کہ اسے ساری دنیا کی سرداری مل گئی تب بھی وہ خوش نہیں رہ سکے گا۔ اگر گل اس کی بیوی نہ بنی۔ امریکا کی سختیوں میں محبوب کا خیال خوش کن تھا۔

وہ گاؤں کا پہلا لڑکا تھا جو امریکا آیا تھا۔ اور پہلا ہی لڑکا تھا جو شادی کے بعد بیوی کو ساتھ لے آیا تھا۔ گل نے کبھی اسے مایوس نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے ہر حکم پر سر جھکاتی تھی۔

صرف ایک بار وہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی جب وہ مشعل کو گاؤں بھیج رہا تھا۔

اس نے کہا تھا کہ جائیں گے تو وہ سب جائیں گے، ورنہ مشعل بھی نہیں جائے گی۔ جوانی کی محبت، عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ دیوانے کا خواب لگنے لگتی ہے۔ محبت کے دن بے وقوفی کا زمانہ بن جاتا ہے۔

ان دونوں کے درمیان اختلافات اتنے بڑھ گئے کہ گاؤں سے فون آنے لگے کہ گل کو چلتا کرو۔ اس عورت کو اتنا سر چڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے اسے چلتا کرنے کی تیاری کر لی تھی۔

فلائٹ سے ایک دن پہلے وہ اپنے ماموں زاد کے گھر سے واپس آئی اور سامان باندھنے لگی۔ اس کا خیال تھا وہ اسے منانے کی کوشش کرے گی لیکن وہ خاموش تھی۔ اس نے کبھی گل کو اتنا اداس نہیں دیکھا تھا۔

"تمہیں شوہر سے زیادہ اپنی اولاد عزیز ہے۔" اس نے تلخی سے شکوہ کیا تھا۔

گل کے دل کو تکلیف پہنچی تھی۔

"تم سے ہی عزیز داری شروع کی ہے۔ تمہارے خون سے محبت کی ہے، کون سا گناہ کر دیا۔" اس نے اپنے شوہر کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تھا۔

محبت کی ہی تو بات تھی...... پھر گناہ کیسا۔

☆☆☆

بختیار نے اسے جانے سے روک دیا۔ یہی طے پایا کہ وہ جہاں کہے گا، مشعل کی شادی وہیں ہو گی۔ وہ مشعل کو اس سلسلے میں پہلے سے تیار کرے گی۔ لیکن ہواؤں کے رخ کوئی نہیں بدل سکتا۔ آندھیاں آ کر رہتی ہیں۔ ان میں صرف اپنے چھپنے کی جگہ ڈھونڈی جا سکتی ہے، پورے آشیانے کو نہیں چھپایا جا سکتا ہے۔ مشعل کی پہلی منگنی ٹوٹی تو ساری بجلی گل پر گری تھی۔ گاؤں سے اسے لمبے لمبے فون کیے گئے۔ اسے خوب پھٹکارا گیا۔ وہ بے وفا عورت کہلائی، جو شوہر کی نہیں بنی، لیکن اولاد کے ہاتھوں کا کھلونا بن گئی۔

گاؤں سے ہدایت ملی کہ مشعل کو یہاں بھجوا دو، ہم اس کی شادی کر دیں گے۔ بختیار نے پاکستان چکر لگانے کا ارادہ ظاہر کیا تو مشعل بھانپ گئی۔ اس نے صاف صاف دھمکی دی کہ اسے اس کی مرضی کے خلاف کہیں لے جایا گیا تو وہ پولیس کو کال کر دے گی۔ اس رات بختیار نے بڑی گہری نظر سے مشعل کی طرف دیکھا تھا، اور پھر گل کی طرف۔

"میں اسے منالوں گی بختیار......"

کمرے میں جا کر گل نے منت سے کہا تھا۔

بختیار نے خاموشی سے سر ہلا دیا تھا۔ گل ہمیشہ سے بختیار کی خاموشی سے ڈرتی تھی۔

گھر کے ہنگامے اس کے اگلے نکاح تک تھم گئے۔ جلد ہی اس کا دولہا امریکا آ گیا۔ اس کے آنے کی خبر گل تک کو نہیں ہونے دی گئی۔ اسے اندازہ تھا کہ مشعل انکار کرے گی، لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ گھر سے بھاگ جائے گی۔ وہ ضدی ہے، خودسر ہے، لیکن وہ اس سے ڈرتی تھی۔ اسے ڈرنا چاہیے تھا۔ اتنی جی داری بختیار کو گوارا نہیں تھی۔ اس کے گھر سے جانے کی خبر گاؤں تک پہنچ چکی تھی۔ لیکن ہر طرف خاموشی تھی۔ گل کو کوئی فون نہیں آیا تھا۔ لعنت ملامت نہیں ہوئی تھی۔ امریکا میں آباد بختیار کے دونوں بھائیوں تک نے ایسے ظاہر کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہر شے اپنی صورت پر مکمل رہی۔ گل نے چھپ کر ان کی باتیں سنیں، لیکن کہیں مشعل کا ذکر نہیں تھا۔ گاؤں سے آنے والے فون کی سن گن لینے کی کوشش کی، لیکن مشعل کسی گفتگو کا حصہ نہیں تھی۔

اتنی خاموشی ...... اتنی خاموشی تو طوفان سے پہلے نہیں ہوتی ......

کیا ہر شے نے اپنی زبان کاٹ لی تھی؟

☆☆☆

''مجھ سے وعدہ کرو بختیار! میری وفا میری اطاعت کا کچھ صلہ دو، میری بیٹی کو چھوڑ دو۔''

پھر یہ عورت صرف اولاد کی ہی وفادار نکلی۔ محبت کی بازی جیت کر شادی کرنے والی عورتیں بھی، اولاد کے آگے یہ بازی ہار جاتی ہیں۔ ہونہہ! بے وفا عورتیں۔ پہلے باپ کے لیے جان دیتی ہیں، پھر شوہر کو سر آنکھوں پر بٹھاتی ہیں، پھر اولاد کے آگے بچھ جاتی ہیں۔ ہر نئے پڑاؤ پر اپنا دل بدل لیتی ہیں۔ آخری محبت پر اپنا پڑاؤ پتھر کر لیتی ہیں۔ پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھتیں۔ یہ موم کی عورتیں، اولاد کے علاوہ ہر دوسری چیز کے لیے پتھر ہو جاتی ہیں۔

''تم نے اسے گھر سے نکالا تھا۔'' باہر برفیلی بارش تھی، اندر برفیلی سرد مہری۔

''مجھے مشعل کی قسم ہے بختیار! میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اگر اسے بھاگتے ہوئے دیکھ لیتی تو اسے روک لیتی...... جانے نہ دیتی...... م...... میرا یقین کرو......''

''تم اس شادی پر خوش نہیں تھیں۔''

''میں اس کی اور تمہاری ہر خوشی میں خوش ہوں بختیار! مجھے سوالوں کے کٹہرے میں کھڑا نہ کرو۔ میرا کوئی وکیل نہیں ہے۔ میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ میں گاؤں کی سیدھی سادی عورت ہوں۔ میں نے کبھی اپنے لیے کوئی آسائش نہیں مانگی۔ تم نے بڑے سکھ میں رکھا، مجھے گھر کی مالکن بنایا۔ اب بس ماں کے دل کو اطمینان دے دو۔ مشعل کو معاف نہ کرو، اور سزا ابھی نہ دو۔''

وہ عورت کیسی عجیب باتیں کر رہی تھی۔

''اس کا فون آیا تھا، میں نے کہہ دیا کہ تم ہمارے لیے مر چکی ہو۔ اللہ تم جیسی ناخلف اولاد کسی کو نہ دے۔ میری بات مان جاؤ۔''

گل جھوٹ بول رہی تھی لیکن وہ ایسے کئی جھوٹ بولنے کے لیے تیار تھی۔

''میں تمہارا اور بچوں کا خیال رکھوں گی...... تمہاری گل بن کر رہوں گی...... تم اس ایک وعدے کا مان رکھ لو۔''

بختیار نے سر ہلا دیا۔ اندر کا سارا طوفان گل کی آنکھوں میں امڈ آیا۔ بختیار کی ہتھیلی کو اٹھا کر آنکھوں سے لگا لیا۔

''تم جو کہو گے، میں وہی کروں گی۔''

اس کی آواز میں خوشی تھی...... لرزہ تھا...... اور خوف تھا۔

خوف جو اس کی جان ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔

☆☆☆

بختیار یہی وعدہ یاد دلا رہا تھا کہ ان کی کوئی بیٹی نہیں ہے۔ وہ اپنا اور گھر کا خیال رکھے۔ گل گڑبڑا گئی۔

"کل وہ لوگ آئیں گے تم سے معلومات لینے، ان کے سوالوں کے جواب دے دینا۔" بختیار نے عام سے لہجے میں کہا تھا۔

"انہوں نے کچھ بتایا...... مشعل کہاں گئی۔" بیمار عورت نے بڑی ہمت کر کے پوچھا۔

بختیار نے ابرو اچکا کر اس کی طرف دیکھا۔ گل سر ہلا کر رہ گئی۔ سر پر دوپٹہ درست کیا۔

"مینا! اپنی بھابھی کے لیے کھانا لاؤ...... اسے دوا ضرور دے دینا......"

بختیار نے ٹی وی کی آواز اونچی کر دی۔ امریکی ٹی وی پر اسے اسپورٹس پروگرامز پسند تھے۔ وہ نیوز سنتا تھا لیکن انہیں زیادہ پسند نہیں کرتا تھا۔ "یہ گورے اور ان کے مسئلے۔" بڑبڑا کر چینل بدل دیتا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن پولیس آئی، ساتھ ایک اردو بولنے والا لائی تھی۔ اس سے سوال جواب ہوتے رہے۔ وہ مختصر جواب دیتی رہی۔ پھر بڑی آس سے پوچھا۔

"میری مشعل کہاں ہے۔"

"ہم اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔"

وہ لب سی کر رہ گئی۔ وہ دہل کر رہ گئی۔

"آپ کی آخری بار اس سے کب بات ہوئی تھی؟"

"پیرس جانے سے پہلے اس نے مجھے کال کی تھی۔"

"آپ کے درمیان کیا بات چیت ہوئی تھی؟"

"میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ جلد سے جلد یہ جگہ چھوڑ دے۔"

"آپ نے ایسا کیوں کہا؟"

"وہ واپس گھر آنا چاہتی تھی......"

"آپ دونوں ایسا نہیں چاہتے تھے۔"

گل نے سر ہلا دیا۔

"وہ بار بار کہتی تھی کہ وہ یہ ملک یا اسٹیٹس چھوڑ دے گی۔ میں نے اس کے فیصلے کی حمایت کی۔"

اس نے بڑے ضبط سے ساری کارروائی میں تعاون کیا تھا۔ پولیس نے مشعل کا کمرا سرسری انداز میں دیکھا تھا۔ گھر پر ایک نظر ڈالی تھی۔ پولیس اپنی ابتدائی کارروائی مکمل کر چکی تھی۔ ہاسپٹل چیک کر لیے گئے تھے کہ وہ کسی حادثے کا شکار نہ ہو۔ اس کے فرینڈز، کالج اور سرکل سے ہر طرح کی معلومات لی جا چکی تھیں۔ کہیں کوئی ایسی چیز نہیں ملی تھی جو تشویش ناک ہوتی۔ گھر سے بھی وہی معلومات ملی تھیں جو فرینڈز سے ملی تھیں کہ وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ پھر ایک اپارٹمنٹ میں رہنے لگی تھی۔ بختیار، گل اور دوسرے لوگوں کے بیان میں کوئی تضاد نہیں تھا، کہ پولیس کسی قسم کا شک کرتی۔ گل اور بختیار کے بیان تک میں کوئی فرق نہیں تھا۔ سوائے ایک فرق کے باپ نے نارمل انداز میں ہر سوال کا جواب دیا تھا اور ماں بار بار اپنی آنکھیں صاف کرتی رہی تھی۔

مشعل سے متعلق ملنے والی رپورٹس کے مطابق وہ سر پھری اور بولڈ تھی۔ کمیونٹی سے جو خبریں ملیں، وہ کچھ زیادہ اچھی نہیں تھیں۔ وہ کمیونٹی کی عام لڑکیوں سے الگ تھی۔ اسے اپنے ماں باپ کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ وہ لڑکوں کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی، حجاب اتار دیتی تھی، سر کے بال کھول کر رکھتی تھی۔ اسے اسموکنگ کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا تھا۔ وہ شاذ ہی اسلامک سینٹر میں دکھائی دیتی تھی۔ وہ بے شرم بے حیا تھی۔

جبکہ اس کا باپ ایک شریف آدمی ہے۔ محنتی ہے، اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ آج تک اس کی گاڑی پر ٹکٹ نہیں لگا۔ وہ کاؤنٹی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ اس کا سارا ریکارڈ بے داغ تھا۔ اپنی مرضی سے کہیں چلی گئی ہے۔ جو گھر سے جا سکتی ہے، وہ کہیں اور بھی جا سکتی ہے۔

اسے آخری بار کروز پر دیکھا گیا تھا۔ آخری دن وہ اپنی فرینڈز سے الگ ہو گئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ بجھی بجھی سی تھی۔ اس کی گھر بات ہوئی تھی جس پر اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی ماں کی طبیعت خراب ہے۔ پولیس نے گل سے پوچھا تو اس نے انکار کر دیا

کہ مشعل کی اس سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس کے اپارٹمنٹ سے بھی کوئی ایسی چیز نہیں ملی تھی جو قابل گرفت ہوتی۔ اسے کروز سے نکلتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

پوری کارروائی کے دوران پولیس کو یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں چلی گئی ہے۔ وہ بالغ ہے، کہیں بھی جا سکتی ہے۔ اس نے اس سلسلے میں کسی کو راز داں نہیں بنایا کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس تک نہ پہنچ سکے۔ یہ مفروضہ انہوں نے گل کے بیان پر ہی قائم کیا تھا، جب انہوں نے دونوں کی آخری بات چیت کے بارے میں پوچھا تھا۔

پولیس نے سارے نکتے ملائے تو یہی تصویر نکل کر سامنے آئی کہ مشعل نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ خود کو غائب کر لیا ہے۔ لیکن اس کی فرینڈز یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھیں کہ مشعل انہیں بتائے بغیر غائب ہو گئی۔

رابیکا، ایلی اور نکول اس کی بیسٹ فرینڈز تھیں۔ تینوں کا تعلق امریکا سے تھا۔ کھڑکی سے بھاگنے کے بعد وہ رابیکا کے گھر تین دن رہی تھی۔ پیرس سے واپسی پر وہ اداس تھی تو انہوں نے اسے اسپیس دے دی تھی۔ وہ زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں رہتی تھی۔ رات کا کھانا نہیں کھاتی تھی۔ ڈیک پر نہیں آتی تھی، جلدی سو جاتی تھی۔

وہ تینوں سمجھ سکتی تھیں کہ جس کلچر سے اس کا تعلق ہے، اس کے لیے خاندان سے الگ ہو رہنا آسان نہیں ہے۔ وہ نئی زندگی میں ایڈجسٹ نہیں ہو رہی تھی۔

"تمہاری گھر بات ہوئی ہے؟" کروز کی واپسی سے ایک دن پہلے رابیکا نے اس کے کمرے میں آ کر پوچھا تھا۔

"ہاں......" وہ سامان سمیٹ رہی تھی۔ تھوڑی پرجوش لگ رہی تھی۔

"یہاں سے تم گھر جاؤ گی؟"

"شاید ہاں...... شاید نہیں......"

یک حرفی جواب دیا۔ پھر بیگ کی زپ کھول کر رابیکا کی طرف کچھ تصویریں بڑھائیں۔ یہ تصویریں مشعل نے ان کی لاعلمی میں لی تھیں۔

"زبردست...... میری ماں کو یقین نہیں آئے گا کہ یہ میں ہوں۔" رابیکا چہکنے لگی۔ وہ اس کا موڈ فریش کرنا چاہتی تھی۔

مشعل ہنس دی۔ "اپنی ماں کے حسن کے آگے تم پانی بھرتی ہو۔ شکر کرو، وہ تمہیں ماں کہنے کا حق دیتی ہے۔"

رابیکا نے اسے منہ چڑایا۔

"تم اور تمہاری ماں دونوں خوب صورت ہو۔ تم چاہو تو میں تمہاری تصویریں آنٹی کو دے کر آ سکتی ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں، میں خود دے دوں گی۔"

"کیسے......؟؟" رابیکا اس کا ارادہ جاننا چاہتی تھی۔ اسے بے چینی ہو رہی تھی۔

"کچھ نہ کچھ کر لوں گی......"

"تمہارے پاپا مان جائیں گے؟"

"شاید ہاں......"

"تم گھر واپس چلی جاؤ گی؟"

"امکانات ہیں۔"

"اور پھر تم جرنلسٹ بھی بن جاؤ گی......"

"بہت بڑی جرنلسٹ...... بہت مشہور ہوں گی میں......"

"ویل! میں وہ دن دیکھنا چاہوں گی...... تمہارا پلان کیا ہے؟"

"تمہیں میرے پلان کی بو کیسے آ گئی۔ بڑی لمبی ناک ہے تمہاری۔" اس نے مذاق اڑایا۔

"تم اس لڑکے سے شادی کر لو گی جو پاکستان سے آیا ہے۔" رابیکا سنجیدہ ہی رہی۔

"اُف اتنے سوال...... کیا ہو گیا ہے...... تم جا کر اپنا سامان کیوں نہیں دیکھتیں، پھر کچھ بھول جاؤ گی۔"

رابیکا نے غور سے مشعل کی طرف دیکھا۔ وہ بیک وقت پرجوش اور اداس دکھائی دے رہی تھی۔

"تمہارے دماغ میں کچھ چل رہا ہے، جو تمہاری شکل پر دکھائی دے رہا ہے۔"

جس بیگ میں مشعل چیزیں رکھ رہی تھی، رابیکا اسی پر بیٹھ گئی تاکہ وہ کام روک کر توجہ سے اس کی باتوں کا جواب دے۔

مشعل نے بے زاری سے اس کی طرف دیکھا۔ "جاؤ بھی...... مجھے کوفت ہو رہی ہے۔"

"تم گھر واپس جانے کا ارادہ کر چکی ہو...... ہے نا...... تمہیں اپنے پاپا سے ڈر نہیں لگ رہا؟"

"لگ رہا ہے...... اسی ڈر کی وجہ سے فیصلہ کیا ہے کہ کوئی قدم اٹھالوں۔ ان چند ہفتوں میں ہی میں نے جان لیا ہے کہ قید کی زندگی اتنی تکلیف دہ نہیں ہوتی جتنی خوف کی زندگی۔ ہم تلخ حقیقتوں کے ساتھ تو زندہ رہ سکتے ہیں لیکن شیریں اندیشوں کے ساتھ نہیں۔ میں نے اپنی صورتحال جیسی بہت سی لڑکیوں کی کہانیاں سنی ہیں۔ پڑھی ہیں۔ ڈھونڈ کر فلمیں دیکھی ہیں۔ لیکن ایک چیز جو ان میں نہیں بتائی گئی لیکن میں نے جان لی ہے، کہ بھاگی ہوئی آزاد زندگی کو خوف قید کر لیتا ہے۔ یہ پرانی زندگی سے بدتر زندگی ہے۔ بہتر ہے میں ایک بار ختم ہو جاؤں۔ ماما میری طاقت تھیں لیکن اب وہی مجھے کمزور کر چکی ہیں۔"

"تم کیا کرنے جا رہی ہو مشعل! مجھے تمہاری فکر ہو رہی ہے۔"

"میں اپنے خاندان اور گاؤں کی پہلی لڑکی تھی جو پڑھنے کے لیے کالج گئی تھی۔ ماما نے کہا کہ مجھے ایسی مثال بننا چاہیے کہ گاؤں کی دوسری لڑکیاں بھی پڑھ سکیں۔ مجھے چیزوں کو ٹھیک کرنا ہے۔ اگر گاؤں جا کر اپنے خاندان کو منانا پڑا تو وہ بھی کروں گی۔ وہاں میرے ایک چچا ہیں، وہ اسکول ٹیچر ہیں۔ میری ان سے زیادہ بات نہیں ہوتی تھی، لیکن اب سوچ رہی ہوں کہ ان سے رابطہ کروں۔ سنا ہے وہ باقی سب سے بہت الگ ہیں۔ وہ ضرور میری مدد کریں گے۔ ایک بار میں نے انہیں بتایا کہ میں جرنلسٹ بننا چاہتی ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ یہ رویہ پاپا کے رویے کے برعکس تھا۔ وہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔"

"تم ابھی انہیں فون کر سکتی ہو؟"

"میرے پاس ان کا نمبر نہیں ہے۔ میں نے کبھی اس چیز کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی۔ مجھے ڈر رہتا تھا کہ اگر میں نے کسی کو اپنے قریب کر لیا تو وہ مجھے پاپا کی طرح کنٹرول کرنا چاہے گا۔ حکم چلائے گا۔ چچا مجھ سے فون پر بات کرنا چاہتے تھے تو میں انکار کر دیتی تھی۔"

دنیا کا آزاد سے آزاد انسان بھی ترجیحات میں بندھا ہوا ہے، یا پھر توقعات سے۔ کوئی رشتوں کی بیڑیوں میں ہے، کوئی خواہشوں کی۔ وہ دو طرح کی ترجیحات میں تھی۔ عزیز زندگی، عزیزوں کے ساتھ۔ خواب کی آزادی اور تعبیر کی معتبری۔ لیکن دیسی لوگوں کو آزاد زندگی نہیں ملتی۔ خاندانی روایتوں، اور توقعات سے لٹی ہوئی زندگی ملتی ہے۔ دیسی اولادیں اگر یہ بیڑیاں کاٹ ڈالیں، تب بھی ان کی روحیں بے چین رہتی ہیں۔ اپنے جائز حقوق کی جنگ لڑتے ہیں تو ملعون قرار دیے جاتے ہیں۔ پھر ان کے خواب معتبر کیسے ہوئے؟

☆☆☆

گل کے کان ہر وقت فون پر لگے رہتے تھے کہ مشعل کا فون آئے گا اور وہ خوش خبری دے گی کہ وہ اس جگہ سے بہت دور جا چکی ہے۔ پھر گل کو اطمینان ہو جائے گا۔ وہ اس ڈرامے کو چلنے دے گی۔ وہ کسی کو نہیں بتائے گی کہ اس کی بیٹی اپنی پناہ گاہ ڈھونڈ چکی ہے۔ ایک دن یہ ڈرامہ خود بخود دم توڑ دے گا۔

گھر میں پولیس آنے کے تین دن بعد اُجالا گل کے گھر گئی تھی۔ گھر کا ماحول عام معمول جیسا تھا۔ بس گل کی طبیعت گری ہوئی تھی۔ وہ مشعل کی

راکنگ چیئر پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ الماس نے گھر کے اندر داخل ہوتے ہی گھر کی فضا کو غیر معمولی طور پر بوجھل پایا۔ وہ پہلے گل کے پاس آئی۔

''سب خیریت ہے...... مشعل واپس آ گئی؟''

گل نے تسبیح کے دانے کو دو انگلیوں کے درمیان روک لیا۔ اس کے چہرے پر کسی اپنے کے سینے سے لگ کر رونے کی کیفیت ظاہر ہوئی۔ پر اس نے حتی الامکان پرسکون رہنے کی کوشش کی۔ کرسی پہ پشت سیدھی کرتے ہوئے الماس کی طرف دیکھا۔

''مشعل کی فرینڈز کا کہنا ہے کہ انہوں نے مشعل کو کروز سے اترتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

گل نے ایک دم سے کہہ دیا۔ الماس نے الجھ کر گل کی طرف دیکھا کہ اس بات کا کیا مطلب ہوا۔ گل نے اگلی بات کہنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کیے۔

''ان کا مشعل سے رابطہ نہیں ہو رہا۔''

اجالا فرش کی صفائی کے لیے بالٹی میں برش کو ڈبو کر نکال رہی تھی۔ اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ وہ گردن کو خم دے کر کھڑکی کے پاس بیٹھی گل باجی کی طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔ جیسے اسے نیند سے جگانا چاہتی ہو کہ ہوش کریں، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔

''مشعل کالج نہیں جا رہی؟'' الماس نے ناسمجھی سے گل اور پھر اجالا کی طرف دیکھا۔

''تین دن پہلے پولیس آئی تھی...... وہ مشعل کو ڈھونڈ رہے ہیں......''

''پولیس آئی تھی......'' الماس اس جملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ٹکٹکی باندھے گل باجی کی طرف دیکھتی اجالا کو بھی الفاظ تو سنائی دیے تھے لیکن وہ معنی نہیں سمجھ سکی۔ وہ ان دونوں کے قریب آنے کے لیے بڑھی تو بالٹی سے الجھ گئی۔ بالٹی کا پانی فرش پر پھیل گیا۔ الماس اور گل نے اجالا کی طرف دیکھا۔ دو انگلیوں میں روک کر رکھا تسبیح کا دانہ گل کے ہاتھ سے پھسل گیا۔ وہ بے قراری سے تسبیح کی طرف دیکھنے لگی۔ اندازے سے مطلوبہ دانے کو ڈھونڈنے لگی۔

الماس اور اجالا نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ آتش دان میں جلتی لکڑیوں کی چنگاریاں لاوا بن گئیں۔ تینوں عورتوں کو شدید ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ وہ کہاں کھڑی ہیں اور کتنی زندہ ہیں، انہیں یاد کرنے میں وقت لگا۔

''گل باجی! مشعل نے آپ کو فون کیا؟'' اجالا نے بے قراری سے پوچھا۔

گل جو صبح سے کچھ پرسکون تھی، ان دونوں کے تاثرات دیکھ کر ہول کر رہ گئی۔

''تم دونوں اتنی پریشان کیوں ہو...... مشعل ٹھیک ہے۔'' مسکرانے کی کوشش کی۔

''ہاں، وہ...... تم ٹھیک کہہ رہی ہو...... اچھا بتاؤ، تمہاری اس سے کب بات ہوئی تھی۔'' الماس ہکلا کر رہ گئی۔

''پیرس جانے سے پہلے اس نے فون کیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی وہ واپس آ کر اپنے پاپا سے ملے گی۔ میں نے اسے سختی سے منع کر دیا...... مم...... م......''

''اُجالا! پانی لاؤ......''

گل کھانسنے لگی۔ اجالا بھاگ کر بوتلوں کے کریٹ کے پاس پہنچی، بوتل کھولی، گلاس بھرا۔ گل تک لاتے لاتے پانی کئی بار جھلکا۔ نیتو اور لانا اپنا کام روک کر ان تینوں کی طرف دیکھنے لگیں۔ وہ تینوں عورتیں اس وقت دیوانی لگ رہی تھیں۔ گل نے بمشکل ایک گھونٹ بھرا۔

''بتاؤ، کیا بات ہوئی تھی مشعل سے؟''

☆☆☆

''میں نے سوچ لیا ہے، میں یوسف چچا سے بات کروں گی۔ آپ مجھے ان کا نمبر دے سکتی ہیں۔''

گل سناٹے میں رہ گئی۔

''تم ان سے کیا بات کرو گی؟ تمہارا باپ اسے زیادہ پسند نہیں کرتا مشعل! تم ان خاندانی مسئلوں کو نہیں سمجھتیں۔ گاؤں کے لوگ بھی یوسف کو پسند نہیں

کرتے۔"

"اب — میری سمجھ میں آگیا ہے کہ کیوں نہیں کرتے، وہ بھی میری طرح ہیں، اسی لیے پاپا نے انہیں امریکا نہیں بلایا۔"

"وہ خود یہاں آنا نہیں چاہتا تھا۔"

"وہ گاؤں میں اسکول بنانا چاہتے تھے......وہ چاہتے ہیں، گاؤں کی بچیاں پڑھیں۔"

"چپ کرو جاؤ مشعل! اس سب سے تمہارا کیا لینا دینا ہے۔ گاؤں تک یہ باتیں نہیں پہنچیں۔ کسی کو فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ماما! وہ پاپا کو سمجھائیں گے، آخر دونوں بھائی ہیں۔"

"تم بالکل پاگل ہو چکی ہو مشعل! وہ بھائی ہے اور تم بیٹی۔ غیرت کے آگے خون گاڑھا نہیں ہوتا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گاؤں فون کر کے میرے لیے قیامت نہ لانا۔"

"ماما! مجھے کوئی حل نکال لینے دیں، آپ چاہتی ہیں، میں کبھی آپ سے مل نہ سکوں۔ آپ کے ہوتے ہوئے تنہا رہ جاؤں۔"

"تنہا ہو گی لیکن زندہ تو ہو گی۔"

شگاگو کی آسمان تک بلند بلڈنگوں میں یہ فقرہ گونج کر رہ گیا۔ سڑکوں پر دوڑتے سائرن اس کی کنپٹی میں سمٹ آئے۔

"تم ایک ہاری ہوئی عورت سے مشورہ لے رہی ہو۔ تم نے اس عورت کی کبھی بات نہیں مانی، اب ایک بات مان لو، پیرس جا رہی ہو، وہیں رہ جانا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ میں نے تم سے کبھی کچھ نہیں مانگا، مجھ پر یہ احسان کر دو مشعل! کسی جنگل میں نکل جاؤ لیکن یہاں سے دور ہو جاؤ۔"

"آپ ایک ہی بات بار بار کرتی ہیں...... مجھے یوسف چچا کا نمبر دیں۔ پلیز ماما!"

"تم بہت ضدی ہو۔ میری قسمت پھوٹی تھی جو تم جیسی سر پھری اولاد میری گود میں آئی تھی۔ تم اتنی خود سر نکلو گی، مجھے اندازہ ہوتا تو تمہارے ہاتھ پیر کاٹ دیتی، پڑی رہتیں گھر کے کسی کونے میں۔ سب سے پہلے تمہاری زبان کاٹنی چاہیے تھی۔ میری غلطی ہے جو تمہیں گاؤں نہیں بھیجا، اب بھگت رہی ہوں اس غلطی کا نتیجہ۔ بختیار ٹھیک کہتا ہے، بیٹیوں کی بے راہ راوی میں ماں کا پورا پورا ہاتھ ہوتا ہے۔ ماں بیٹی سے زیادہ قصوروار ہوتی ہے۔ میں سب جانتی تھی۔ تم کیا سوچتی ہو، کیا چاہتی ہو پھر بھی تم پر لگامیں نہیں ڈالیں، بڑی غلطی کر دی۔"

وہ ماں کے لب و لہجے پر حیران تھی۔

"پھر کچھ میری قسمت کا حال بھی بتا دیں۔ ایسا کون سا گناہ کر دیا جو آپ جیسے ماں باپ ملے۔ جلاد ہیں آپ لوگ۔" تلخی سے کہا۔

"تم نے ابھی جلاد دیکھے نہیں۔ تم یہاں پیدا ہوئی ہو، میرا تعلق گاؤں سے ہے۔ ہم نے گاؤں میں اتنی بہاریں نہیں دیکھیں جتنی عبرتیں دیکھی ہیں۔ ہماری مائیں ہم کو جن بھوتوں سے نہیں ڈرایا کرتی تھیں، وہ ہمیں کسی مرد کے ساتھ بھاگ جانے سے ڈرائی تھیں۔ وہ ہمیں سر اٹھانے سے خوف زدہ کرتی تھیں۔ وہ اس کا انجام بتایا کرتی تھیں۔ انہوں نے سرگوشیوں میں ہمیں ساری عبرت ناک کہانیاں ازبر کروا دی تھیں۔ میں نے تمہیں وہ کہانیاں نہیں سنائیں مشعل! میں تمہیں سہما ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں چاہتی تھی تم اپنے باپ سے محبت کرو۔ ان کی عزت کرو۔ میں چاہتی تھی، تمہارا بچپن میرے بچپن سے الگ گزرے...... میں نے غلطی کی...... میں تمہیں یہ نہیں سمجھا سکی کہ نظریات بدل جانے سے نصیب نہیں بدل جاتے۔ اور تم اس نصیب سے نہیں بھاگ سکتیں۔ اسے بدل نہیں سکتیں۔"

گل نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ آپ اتنی تنگ نظر ہوں گی۔"

"میں تمہاری کشادہ نظری کی سزا بھگت رہی ہوں۔ تمہارے اور میرے پاپا کے درمیان طے پا چکا

ہے کہ ہماری کوئی بیٹی نہیں تھی۔ اگر کوئی تھی تو وہ مر چکی ہے۔"

فون بوتھ کے اندر کھڑی مشعل کو شیشے کی چار دیواریں اپنے اوپر گرتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ سائرن بجاتی گاڑیاں اس کے اوپر سے گزر گئیں۔ شہر میں اتنا شور کیوں ہے؟ اتنا ہنگامہ کیوں برپا ہے؟

"ہم دونوں نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا ہے کہ ہمارے درمیان کبھی تمہارا ذکر نہیں ہوگا۔ میں اپنے شوہر کی وفادار ہوں مشعل! بہتر ہے کہ آئندہ تم اپنے فیصلے سمجھ داری سے کرو۔"

مشعل اس جذباتی ملبے سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ "وعدہ؟"

"وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے، پھر بھی تم یہاں سے چلی جاؤ۔"

مشعل نے اتنا دردناک سانس لیا تھا کہ گل کو اپنا دل بند ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

"آپ مجھے یاد نہیں کرتیں؟" جو ان کے لیے مر چکی تھی وہ ان سے "یاد" کا پوچھ رہی تھی۔

"ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

"آپ نے کہا تھا، میں آپ کی جان ہوں۔"

"میرے دو بچے اور ہیں مشعل!...... مم......"

"آپ نے کہا تھا، آپ میری صورت میں زندہ ہیں...... میں ہوں تو آپ ہیں......" وہ سسکنے لگی۔

"اسی لیے کہہ رہی ہوں، چلی جاؤ۔ کتنی ضدی ہو تم۔"

گل نے ٹھک فون بند کر دیا۔ وہ فون کو کان سے لگائے کھڑی رہی۔ آج سے پہلے اسے کبھی اتنی تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ اتنا بڑا شہر تھا، پھر بھی دل صرف ایک گھر میں تھا۔ اتنی بڑی دنیا تھی، پھر بھی پورا جہاں ایک ماں میں تھا۔ اتنے زیادہ انسان تھے، پھر بھی دل صرف ایک انسان کی محبت کی طرف لپکتا تھا۔ دنیا کے باغوں میں کھلے سارے پھول بھی کچھ انسانوں کے لیے بہار نہیں لا سکتے۔ دنیا کے سارے مرہم مل کر بھی کچھ زخموں کی دوا نہیں کر سکتے۔ ماں بیٹی کبھی ایک جان ہوا کرتی تھیں۔ اب کوئی ترکیب دوبارہ انہیں یک جان نہیں کر سکتی تھی۔ انسانوں نے اتنی پختہ لکیریں کھینچ دی تھیں کہ ان لکیروں کو پھلانگنا موت قرار دے دیا۔

فون بوتھ کی شیشے کی نیم دیوار پر اس نے اپنا سر ٹکا دیا۔ ایک بارش باہر ہو رہی تھی، ایک اندر ہونے لگی۔

کبھی کسی نے ٹھیک کہا تھا، بیٹیوں سے ڈر نہیں لگتا، ان کے نصیب سے لگتا ہے۔

☆☆☆

مشعل کا نصیب...... گل کا نصیب......

صوفے کے کنارے پر بت بنی بیٹھی اجالا بڑے غور سے ایک ایک بات سن رہی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ پیرس سے واپس نہیں آئی۔"

"ہاں! اس کی فرینڈز اس کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔ وہ اسے مسنگ پرسن کا رنگ دے رہی ہیں۔ وہ جھوٹ بول رہی ہیں کہ وہ کروز میں ان کے ساتھ تھی۔"

الماس کے چہرے پر بے یقینی تھی۔ اسے ایسا لگا کہ یہ ماں دیوانی ہو چکی ہے۔ اس کی حسیں نیم مردہ ہو چکی ہیں۔

"گل! وہ سب ٹھیک ہے لیکن یہ کوئی فلم نہیں ہے۔ ایسی بھی کیا بات ہوئی کہ پولیس اتنے زور و شور سے مشعل کو ڈھونڈ رہی ہے۔"

"تم مشعل کو نہیں جانتیں۔ ایک دن اسے اپنی فرینڈ کی برتھ ڈے پارٹی میں جانا تھا۔ وہ رات کے کسی وقت کھڑکی سے نکل کر اپنی فرینڈ کے ساتھ چلی گئی۔ مجھے صبح معلوم ہوا کہ وہ ساری رات گھر نہیں آئی۔ وہ منہ اندھیرے واپس آئی، اور اسکول جانے کے لیے تیار ہو کر باہر نکلی۔ بختیار تک کو خبر نہیں ہوئی۔ تم نہیں جانتیں اسے، میری بیٹی بہت اسمارٹ ہے۔"

اجالا کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"پھر اصولاً اسے تمہیں فون کرنا چاہیے تاکہ تمہاری فکر ختم ہو۔"

"وہ کرے گی...... ضرور کرے گی...... جب یہ سارا تماشا ختم ہو جائے گا۔"

☆☆☆

تماشا ...... ڈرامہ ...... اور زندگی کی اسٹیج پر ہماری عمروں کے کردار......

شیکسپیئر نے غلط کہا تھا کہ زندگی کی اسٹیج پر مرد و عورت کے سات کردار ہیں۔ وہ آٹھواں کردار گنوانا بھول گیا۔ وہ کردار جو صرف ایک بیٹی، بیوی اور عورت ادا کرتی ہے۔ سیزر کی شجاعت لکھنے والا، عورت کی بے بسی لکھنا بھول گیا۔ رومیو کی محبت لکھنے والا، عورت سے نفرت لکھنا بھول گیا۔ اسے زندگی کے تماشے میں، عورت کے کرداروں کا اسٹیج الگ سے لکھنا چاہیے تھا۔ ورنہ ایک نشان چھوڑ دینا چاہیے تھا۔

قربان گاہ کا......

اس نے کل رات کا بچا کھچا سالن آنٹی کے لیے الگ کر دیا تھا۔ خود چائے کے ساتھ دو بسکٹ لے لیے تھے۔ اس کا دل اتنا اداس تھا کہ وہ کئی بار چھپ کر رو چکی تھی۔ وہی اداسی تھی جو گاؤں چھوڑتے ہوئے دل پر طاری ہوئی تھی۔ گاؤں کے گھر پیچھے چھوٹتے جا رہے تھے، اس کی گاڑی آگے نکلتی جا رہی تھی۔ وہ جب جب سائرن والی گاڑی دیکھتی تو اسے خیال آتا کہ اس رات قمر کی گاڑی بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سائرن اس کے اندر بج رہا تھا۔ اس میں اجالا کو لاد کر امریکا کے سرد خانے میں بھیجا جا رہا تھا۔ تب اس کے پاس سہانے خواب تھے۔ اور در اصل یہی اس کے گناہ تھے۔

کبھی دیکھا ہے ایسا بیمار جو ہنستا کھیلتا کھاتا پیتا ہو، اور ریزہ ریزہ ٹوٹ کر بکھرتا بھی جا رہا ہو؟

وہ ایک مدت سے ایسی ہی بیمار بن چکی تھی۔

ٹی وی چل رہا تھا۔ آنٹی نے اسے سر میں تیل ڈال کر مساج کے لیے کہا۔ وہ پہلے ہی کل کے سالن پر بڑبڑا چکی تھیں کہ انہیں تازہ سالن روٹی تک نصیب نہیں ہے۔ اتنا پیسہ لگا کر اس دیہاتن کو یہاں بلایا اور یہ روٹی پکانے سے بھی گئی۔

اجالا ناپسندیدگی سے اس ڈائن کو دیکھ کر رہ گئی۔

پھر بے دلی سے تیل کی بوتل لا کر ان کے سر میں ڈال کر مساج کرنے لگی۔

دل چاہا، اس عورت کا گلا گھونٹ دے۔ بلکہ ساری دنیا کا حلق ادھیڑ ڈالے۔ وہ مشعل کے پاپا کے اسٹور جائے اور اپنے ویکیوم سے ان کے اسٹور کی ایک ایک شیشے کی دیوار توڑ دے۔ چیخے چلائے، اور ان سے پوچھے کہ مشعل کہاں ہے؟ جس کی لکھی رپورٹوں کو نیوز پیپر میں آنا تھا، اس کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس میں آچکی ہے۔ بتاؤ تمہارے دل پر کوئی قیامت نہیں گزری؟ جس لڑکی کو دنیا کا سچ سامنے لانا تھا، اس کا اپنا سچ چھپ چکا تھا۔ بتاؤ، ایسے سچے انسان کو کنویں میں دھکیل کر تمہیں کوئی افسوس نہیں ہوتا؟

"جان نہیں رہی ہاتھوں میں؟ اور بنو ماسی...... لوگوں کے گھر کے پوچے لگاتے تو بڑی جان مارتی ہو۔"

اس نے ناگواری سے آنٹی کے بالوں کے چھتے کو گھورا۔ دل چاہا کہ دونوں ہاتھوں کی پوری قوت سے اس چھتے کو جڑوں سے اکھاڑ دے۔

"یہ عورت مر کیوں نہیں جاتی...... مر جائے منحوس عورت......"

اس نے بڑی تلخی سے سوچا۔ یا وہ بلبل کے مشورے پر عمل کرے اور اسے زہر دے دے۔ رات کو دے گی تاکہ ایک رات تو وہ سکون سے سو سکے۔ پھر وہ پاکستان چلی جائے گی۔ ہر رات ماں کی گود میں سر رکھ کر سویا کرے گی۔ وہ تایا جی کی منت کرے گی کہ اسے کسی نامی گرامی حکیم کے پاس لے جائیں۔ جو اسے ایسی معجون بنا دے کہ اس کا دماغ کورے کاغذ کی طرح صاف ہو جائے۔ وہ ہر چیز بھول جائے۔ اسے دیوانہ ہونا بھی منظور تھا، بس وہ یہ

منحوس صورتیں بھول جائے۔

"وہ الماس بڑی باس لیڈی بنی پھرتی ہے، دو ٹکے کی حیثیت نہیں ہے اس کی۔ گھٹیا سی ویگن چلاتی پھرتی ہے۔ بڑی توپ چیز سمجھتی ہے خود کو۔ بیٹیوں کے ساتھ یہاں اکیلی پڑی ہے، ماسی ہی بننا ہے تو جاؤ پاکستان واپس، وہاں یہ کام زیادہ چلے گا۔"

"آپ بھی تو بیٹیوں کے ساتھ اکیلی پڑی ہیں، آپ کیوں نہیں چلی جاتیں واپس۔" اس سے برداشت نہیں ہوسکا۔

آنٹی نے جھٹکے سے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

"میرے ساتھ منہ ماری کی تو اٹھا کر باہر پھینک دوں گی...... سمجھی......"

وہ بادل نخواستہ خاموش ہو گئی۔ مساج کرتی رہی۔ آنٹی بڑبڑ کرتی رہیں۔

"غلطی میری اولاد کی ہے، اس سارہ نے تمہیں سر چڑھا رکھا ہے۔ جن کے لیے جان ماری وہی اپنے نہیں بنے۔ دو حرف بھیجے تم پر اور چلتا کرے تمہیں۔ بڑا گاؤں گاؤں کرتی پھرتی ہے، طلاق لے کر جائے گی تو دیکھوں گی کیسے گاؤں والے سر پر بٹھاتے ہیں۔ گاؤں کی پہلی لڑکی تھی جو امریکا آئی تھی، میم بنی تھی۔ پہلی لڑکی ہو گی جو طلاق لے کر جائے گی۔"

آخری فقرہ ہنس کر کہا۔ اس کے مساج کرتے ہاتھ تھم گئے۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ وہ آنٹی سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ سوچ سمجھ کر بولیں، ایسا نہ ہو آپ کی بیٹیوں کے آگے آجائے۔ عینی اور سارہ اسے اپنی بہنوں کی طرح عزیز تھیں۔

"کتنی اچھی ہیں دونوں...... اور ان کی یہ ڈائن ماں...... بدزبان عورت......"

اجالا کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔ جلدی سے وہ سارہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ آنٹی اسے گالیاں دینے لگیں۔ اگر وہ مساج نہ چھوڑتی تو آنٹی کی گردن دبوچ لیتی۔ شہریار صاحب آئے، اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا......؟"

"اپنی عقل پر ماتم کر رہی ہوں، کس منحوس کو بیاہ کر گھر لے آئی۔"

"اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے...... چلتا کریں......" اس نے ماں کے گال کی چٹکی بھری۔

سارہ کے کمرے کے واش روم میں ہاتھ دھوتے ہوئے اس نے شہریار کی آواز سنی تھی۔ شہزادی کی آنکھوں کی بچی رہ گئیں دو سوئیاں، انی کی طرح اس کے دل میں گڑ کر رہ گئیں۔ ساری خوش فہمی ڈھل گئی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا، سب ٹھیک ہو جائے گا، کا طلسم ٹوٹ گیا۔

وہ پہلے ہی اداس تھی، یہ سن کر دل پھٹ سا گیا۔ طلاق دینا آسان ہے۔ گاؤں جا کر بکری لے آنا آسان ہے، اس سے مشقت لینا زیادہ آسان تھا۔ جب دل چاہا مار دیا، جب دل چاہا کام پر لگا دیا۔ اسے شراب کے اڈے پر کھڑا کر دیا۔ یہ سب آسان ہے۔

روشن پر آسان ہے، مشعل پر آسان ہے، اجالا پر آسان ہے۔

ڈاکٹر صاحب دوسری بیوی ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ ان کا کھانا پینا، باربی کیو کسی چیز پر فرق نہیں پڑا ہوگا۔ اٹالین جوتے پالش سے چمکتے ہوں گے۔ ٹائی کی پن کے ڈائمنڈ دمکتے ہوں گے۔ روشن کی ساری زندگی اندھیرا کر دینے والے کھانے کی میز کے گرد جمع ہو کر کباب اڑاتے ہوں گے۔

کتنا آسان تھا۔

گری ہوئی صحت اور بہکی ہوئی ذہنی حالت کے ساتھ روشن اپنی زندگی کو معمول پر لانے کی مشقت میں ہلکان ہو رہی ہوگی۔ کسی چیخ چنگھاڑ پر ڈر کر دبک جاتی ہوگی۔ انسان کا ہر زخم بھر جاتا ہے، ابیوزڈ کا نہیں بھرتا۔ ابھی تک وہ دوا ہی نہیں بنی جو ایسے بیمار کو ٹھیک کر سکے۔ وہ نیم پاگل لڑکی، ایک دن ڈراؤنا خواب

دیکھنے جیسی حالت میں ہڑ بڑا کر جاگے گی۔ چیخ مارے گی، اور پھر ہمیشہ کے لیے اپنا ذہنی توازن کھو دے گی۔ جن سسکیوں کو وہ اپنے اندر دبائی رہتی ہے، ایک دن وہ سب مل کر اسے توڑ دیں گی۔ پھر اس اور اس دنیا کا فرق ختم ہو جائے گا۔ پھر وہ ہوش والوں کے کام کی نہیں رہے گی۔

کتنا آسان ہے...... ہنستی کھیلتی لڑکی کو ذہنی مریضہ بنا دینا۔

پاکستان سے لائی عورت کو چھوڑنا آسان ہے۔ جس نے قبول کیا، نکاح نامے پر دستخط کیے، اس کے حصے کے خانے پر دو لکیریں کھینچ دینا مشکل نہیں ہے۔ اس سے بچہ چھین لینا، نان نفقے کے لیے جوتیاں گھسوانا، جہیز کا سامان ضبط کر لینا، اور کردار پر انگلی اٹھا کر کیچڑ اچھال دینا، عام بات ہے۔

امریکا لائی بیوی کو رات گئے ٹھنڈ میں نکال باہر کرنے میں کیا حرج ہے۔ اسے چلتا کرنے میں کیا جاتا ہے۔ کوئی پری نپ ایگریمنٹ سائن نہیں ہوا۔ وہ کسی عدالت سے کوئی حق نہیں لے سکتی۔ ان دیسی عورتوں کو اپنانا آسان ہے، چھوڑنا آسان ہے۔

وہ سارہ کے کمرے کا دروازہ بند کر کے اندر بیٹھ گئی۔ دونوں ماں بیٹا فلم دیکھنے لگے تھے۔

بالکل ایسے ہی مشعل کے گھر میں ہر چیز معمول کے مطابق ہو رہی تھی۔ وقت پر کھانا بن رہا تھا، وقت پر کھایا جا رہا تھا۔ آتش دان میں لکڑیاں تک برابر کٹی ہوئی پڑی تھیں۔ اس گھر میں ایک سوئی تک اپنی جگہ سے نہیں ہلی تھی۔ زندہ انسان اپنی دنیا مکمل رکھتے ہیں۔ لوگ مر جاتے ہیں، اور پیچھے والے اپنی زندگی پر حرف نہیں آنے دیتے۔ جس دن انہیں گل سے پولیس کا معلوم ہوا تھا، اسی دن ایک گھنٹے بعد بختیار صاحب گھر آئے تھے۔ گل باجی نے ضروری چیزیں تیار کر کے رکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بڑی گاڑی نکالی۔ اس میں پانی کی بوتلوں کا کریٹ، ضروری برتن، چولہا اور چٹائی رکھوائی۔ وہ شہر سے باہر جنگل میں بون فائر کے لیے جا رہے تھے۔

مشعل کہاں تھی...... کیسی تھی...... اس دنیا میں نکل کر کن کن پریشانیوں سے گزر رہی تھی......
کسے پروا تھی؟

حرف تسلی...... تو ایک تکلف ہے
جس کا درد اسی کا درد، باقی سب تماشا ہے۔

☆☆☆

زندگی کی پروا زندگی کو عزیز رکھنے والا جانتا ہے۔

وہی زندگی کے لیے مقصد کا تعین کرتا ہے۔

اپنی ہر طرح کی کارروائی کے بعد پولیس نے مشعل پر اپنی رپورٹ لکھ دی تھی۔ کہیں کوئی ایک ثبوت ایسا نہیں ملا تھا کہ کسی پر شک کیا جا سکتا۔ پولیس کی کاروائی کی آندھی تھم گئی۔ لیکن رابیکا یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ وہ اپنی مرضی سے غائب ہوئی ہے۔ ان تین لڑکیوں کے گروپ نے، ''مسنگ پرسن'' پوسٹر جگہ جگہ چپکانے شروع کر دیے تھے۔ ساتھ انعام کی پیش کش بھی تھی۔ اس نے مشعل کی ماں سے ملنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے سختی سے کہا کہ وہ دوبارہ گھر نہ آئے۔ مشعل کے پاپا اس چیز کو پسند نہیں کریں گے۔ وہ ان کی زندگیوں پر رحم کرے۔ انہوں نے اسے گھر کے اندر تک نہیں آنے دیا تھا۔ رابیکا اس ماں کو دیکھ کر رہ گئی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ بیٹی لاپتا ہے اور یہ عورت کہہ رہی ہے کہ ان کی زندگیوں پر رحم کرے۔

''مشعل کہتی تھی، آپ اس سے بہت محبت کرتی ہیں۔'' رابیکا کو شدید تکلیف پہنچی تھی۔

دروازہ بند کرتے گل کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن پھر دروازہ بند کر دیا۔ رابیکا کو شدید مایوسی ہوئی تھی۔ اس نے باقی دو فرینڈز سے بات کی، لیکن ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ پر مشعل کا سراغ پانے کی پوری کوشش کر رہی تھیں، لیکن ابھی تک ناکام رہی تھیں۔

ناچار رابیکا نے اپنی ماں سے رابطہ کیا۔ چند ہی

دن گزرے تھے کہ پرائم ٹائم نیوز میں ایک چھوٹی سی رپورٹ پیش کی گئی۔ جس کی ابتدائی سطر تھی۔

"جرنلسٹ بننے والی لڑکی، اچانک غائب کیسے ہوگئی۔ آخر مشعل کہاں گئی؟"

اُجالا، آنٹی، اور سارہ ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ مشعل کی تصویر ٹی وی اسکرین پر دکھائی گئی۔ آنٹی نے گردن گھما کر اجالا کی طرف دیکھا۔

"یہ اس اسٹور والے کی بیٹی ہے......"

اجالا نے سر ہلا دیا۔

"بڑی گھنی ہو، بتایا نہیں۔"

"ماما چپ کریں...... اجالا! ذرا والیوم تیز کرو......" سارہ ٹی وی کے قریب آگئی۔

اسکرین پر رابیکا دکھائی دے رہی تھی، اس کے ہاتھ میں مشعل کا موٹا سا جنرل تھا۔ وہ مشعل کے ہاتھ سے لکھے ہوئے پیراگراف کی کچھ لائنیں پڑھ رہی تھی۔ پھر وہ یہ بتانے لگی کہ اسے کن حالات میں گھر سے نکلنا پڑا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں یہ مان ہی نہیں سکتی کہ وہ کہیں غائب ہو سکتی ہے۔ پھر اس نے مشعل کی لکھی تحریر کی ایک لائن پڑھی۔

"خوف نے میری رگوں میں خون جما دیا ہے، لیکن میں آخری سانس تک زندگی کے لیے کوشش کروں گی۔"

اسکرین پر مشعل کی مختلف تصویریں دکھائی جا رہی تھیں۔ یہ وہی تصویریں تھیں جو اجالا بھی دیکھ چکی تھی۔ اس کے چہرے پر تشدد کے نشان تھے۔ وہ روئی روئی تھی۔ کچھ تصویریں اسکول کے اسپورٹس ڈے کی۔ کچھ اسکول میں ڈانس پریکٹس کی۔ اجالا دم سادھے اسکرین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"مشعل کہاں ہے اجالا؟"

رپورٹ ختم ہوئی تو وہ اجالا کی طرف گھوم گئیں۔ آنٹی بھی سوالیہ نظروں سے اجالا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"اجالا! تمہیں کچھ معلوم ہے؟"

سارہ نے شانے پر ہاتھ رکھ کر اجالا کو جھنجھوڑا۔ وہ یہ تو جانتی تھی کہ مشعل گھر سے جا چکی ہے لیکن یہ نہیں کہ وہ لاپتا ہے۔

"گل باجی کہتی ہیں کہ وہ چھپ گئی ہے...... انہوں نے ہی مشعل کو ایسا کرنے کے لیے کہا تھا۔"

"کب سے؟"

"وہ نیو ایئر کے لیے پیرس گئی تھی، گل باجی کو فون بھی کیا تھا۔"

"آخری بار دونوں کی کب بات ہوئی تھی؟"

"شاید کروز سے فون کیا تھا، لیکن تب ٹھیک سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ گل باجی کہہ رہی تھیں مشعل کی آواز صاف نہیں آرہی تھی۔ پھر مشعل کے پاپا گھر آگئے تو وہ فون کے پاس نہیں گئیں۔"

"ہو سکتا ہے، وہ واقعی غائب ہو چکی ہو۔"

"لیکن اس کی فرینڈز نے کہا کہ وہ ان کے ساتھ کروز پر تھی۔"

"شاید فرینڈز اس کی پلاننگ کے مطابق چل رہی ہوں۔ جھوٹ بول رہی ہوں۔"

آنٹی نے قہقہہ سا لگایا۔ اجالا نے بڑے افسوس سے ان کی طرف دیکھا۔

"لیکن نہیں! انہیں جھوٹ بولنا ہوتا تو وہ پولیس میں رپورٹ نہ کرتیں۔ وہ مشعل کی ماما سے جھوٹ بول دیتیں۔ رابیکا کی ماں نے چینل پر رپورٹ پیش کی ہے۔ اس کی ماں بیٹی کی پلاننگ میں شامل نہیں ہو سکتی۔ بیٹی بھی اپنی ماں کا کیریئر داؤ پر نہیں لگا سکتی۔ رابیکا واقعی میں مشعل کو ڈھونڈنا چاہتی ہے۔ وہ اس کے لیے پریشان ہے۔"

"الماس باجی کہہ رہی تھیں، ہو سکتا ہے مشعل نے جانے سے پہلے دوسرا ٹکٹ بھی لے لیا ہو۔ اور وہ کروز سے اتر کر پھر کسی دوسرے کروز میں بیٹھ گئی ہو۔ اسی لیے وہ اپنی فرینڈز کے ساتھ باہر نہیں آئی۔"

"ہاں، اس کے چانسز ہیں۔"

آنٹی چینل بدل رہی تھیں۔ پھر ایک چینل پر میوزک پروگرام پر رک گئیں۔

"دیکھو ہوسکتا ہے یہ سارا کھیل اس نے اپنی فرینڈز کے ساتھ مل کر کھیلا ہو۔ جب کوئی حادثہ ہوتا ہے تو ہمارے اندر ایک طرح کا گلٹ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ گلٹ بڑی سے بڑی نفرت ختم کروا دیتا ہے کہ کاش وقت پیچھے چلا جائے اور ہمارا عزیز واپس آجائے۔ میرا خیال ہے مشعل نے یہی کھیل کھیلا ہے۔ اس کی گمشدگی اس کے باپ کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا کرے گی۔ کیونکہ اولاد سے لاکھ اختلاف سہی، وہ ان کی بیٹی ہے۔ پہلے وہ جانتے تھے کہ مشعل کہاں ہے، وہ مطمئن تھے، لیکن اب انہیں فرق پڑے گا۔ بیٹی کے ساتھ پتا نہیں کیا ہو چکا ہے، یہ فکر ان کا دل موم کر دے گی۔ اب مشعل سامنے آئے گی تو اس پر گھر کے دروازے کھلے ملیں گے۔"

سارہ نے یہ کہا تو اُجالا کے دل کو ڈھیروں اطمینان مل گیا۔ اس کے چہرے کے رنگ لوٹ آئے۔

"میں یہ بات کل باجی کو جا کر بتاؤں گی۔"

"وہ مر چکی ہے......" آنٹی نے ٹی وی اسکرین سے سر گھما کر دونوں کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

"اسٹاپ اٹ ماما!"

سارہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بھڑک کر کہا۔

اجالا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ آنٹی استہزائیہ ہنس دیں۔

"وہ مر چکی ہے......"

ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔ اُجالا کی جانب پوری طرح گھوم کر کہا۔

☆☆☆

وہ مر چکی ہے......
وہ زندہ ہے......
وہ کہاں ہے......؟

☆☆☆

سب انسان جولاہے ہیں
اپنی سانسوں کے تانے بانے سے
زندگی کا کپڑا بنتے ہیں
کسی کا کپڑا تھوڑا ہے
کسی کا زیادہ
نادان اس کپڑے کا کفن بناتے ہیں
لیکن میں
اس سے آزادی کے سرخ سویرے کا پرچم بناؤں گا۔
گھر کی منڈیر پر لہراؤں گا......
سجاؤں گا......
(رسول حمزہ توف)

☆☆☆

وہ مشعل کا کمرا صاف کر رہی تھی، کہ اسے مشعل کی کھڑکی کے باہر ہل چل محسوس ہوئی۔ پہلے اسے لگا کہ ہمسایوں نے یارڈ کے خشک پتے سمیٹنے کے لیے کسی کو بلوایا ہے۔ لیکن وہ ایک لڑکی تھی۔ گردن کے گرد موٹا سا مفلر لپیٹا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مائیک تھا۔ اس کے سامنے ایک لڑکا کیمرہ لیے آ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی مشعل کی کھڑکی سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ اجالا چلتی ہوئی کھڑکی کے قریب گئی۔ اور سر کو کھڑکی سے جوڑ کر باہر دیکھنا چاہا۔ کچھ دور چینل کی گاڑی کھڑی تھی۔ اسے جھرجھری سی آ گئی۔ اس نے الماس باجی کو آواز دے کر بلایا۔ اس کی آواز میں ایسی حیرانگی تھی کہ الماس اور نیتو فوراً اس کی طرف لپکے۔ لڑکی کھڑکی کی طرف اشارے کر کے کچھ بول رہی تھی۔ پھر کیمرہ مین چلتا ہوا کھڑکی کے قریب آیا۔ الماس نے پھرتی سے بلائنڈز کھینچ دیے۔

"یہ کیا واہیات سلسلہ شروع ہو گیا...... میں کل کو بتاتی ہوں۔"

کچھ ہی دیر میں وہ سب ایک جگہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ گھر کے باہر دو اور گاڑیاں آ کر کھڑی ہو چکی تھیں۔ وہ گھر اور مشعل کے کمرے کی

رپورٹنگ کر رہے تھے۔ گاڑی میں رابیکا بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بڑی جرأت کے ساتھ مشعل کے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر کیمرے میں دیکھ کر بول رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں مشعل کا موٹا

ساجنرل تھا، ساتھ ساتھ وہ مختلف تصویریں دکھاتی جا رہی تھی۔ وہ تمام واقعات جس میں اسے اس کھڑکی سے نکلنا پڑا تھا، پڑھ پڑھ کر سنا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کھڑکی نے اس کی دوست کو کب کب بچایا ہے۔ وہ یہاں سے کب کب اور کس کس حالت میں نکل کر بھاگی ہے۔

انہوں نے ان لوگوں کے ٹلنے کا بہت انتظار کیا لیکن جب وہ وہاں سے نہیں ہلے تو الماس نے انہیں ہدایات دیں کہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ جانا ہے، کوئی کچھ پوچھے تو جواب نہ دینا۔ وہ تیزی سے دروازہ کھول کر، گاڑی میں بیٹھیں لیکن اتنی سی دیر میں بھی ایک کیمرہ مین بھاگتا ہوا ان کی طرف آ گیا۔ ان کی ویڈیو بنانے لگا۔ رپورٹر ان کے پیچھے پڑ گئی۔

''آپ مشعل کے بارے میں کچھ بتانا چاہیں گی۔ مشعل کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ پلیز مشعل کو ڈھونڈنے میں ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ آپ کو کچھ معلوم ہے تو بتائیں۔ چھپائیں نہیں۔''

الماس جلدی سے گاڑی بھگا کر لے گئی۔ اجالا نے گردن موڑ کر دیکھا تو گل سفید چہرہ لیے کھڑکی کے پردے میں کھڑی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس ماں پر یہ سب کچھ گراں گزر رہا ہے۔ اس ماں کی کچھ خلاصی ہونی چاہیے۔ اس گھر کو، اس کے مکینوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔

اس رات کی نیوز رپورٹنگ میں اجالا اور الماس کی ایک جھلک بھی دکھائی دی تھی۔ سارہ نے حیرت سے اجالا کی طرف دیکھا۔

''ان کے گھر کے باہر یہ مجمع لگ گیا ہے؟''

''ہاں! گل باجی بہت پریشان ہیں...... وہ ہر وقت ہولتی رہتی ہیں۔''

''بس یہی خرابی ہے یہاں کی، اب یہ لوگ اس کیس کی جان نہیں چھوڑیں گے۔ میں ایک رپورٹ پڑھ رہی تھی، لکھا تھا کہ مشعل کی نیوز پورے ملک میں پڑھی اور سنی جا رہی ہے۔ چینل پر مشعل سے متعلق فون کالز کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ ریڈیو پر کالز آتی ہیں۔ لوگ اس کیس کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں۔ دیکھنا اب اسے ہر طرف ڈسکس کیا جائے گا۔''

''پھر کیا ہو گا؟''

''اچھا ہے! مشعل جہاں کہیں بھی ہے وہ رابطہ کرے گی، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا...... اگر نہ ہوا؟'' اجالا نے سوچا۔

''ایک بات پوچھوں اجالا؟ سچ سچ بتانا۔''

اجالا نے سر ہلا دیا۔

''مشعل کے پاپا اسے مارتے تھے۔''

وہ لب کاٹ کر رہ گئی۔ ''میں نے تصویریں دیکھی ہیں۔''

اسی دن رات کو اور اگلے دن صبح ریڈیو پر ایک اور رپورٹ نشر ہوئی۔ مشعل کا کھڑکی سے نکل کر بھاگنے والا واقعہ بتایا گیا۔ اسے کیوں بھاگنا پڑا، اس کی وجوہات زیر بحث لائی گئیں۔ پھر آئندہ آنے والے چند دنوں میں تقریباً ہر دوسرے چینل پر مشعل سے متعلق نئی سے نئی رپورٹ نشر ہونے لگی۔ مشعل کے ہاتھ سے لکھے ہوئے پیراگراف نیوز پیپرز کی زینت بننے لگے۔ یہ تحریریں اتنی حساس تھیں کہ عورتوں کے حقوق کے لیے کام کرنے والے ادارے ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ایک چینل پر عورتوں کے چینل نے ان تحریروں کو پرائم ٹائم میں ڈسکس کیا۔

رابیکا ہر اس پروگرام کا حصہ بن رہی تھی جہاں اسے بلایا جاتا تھا۔ وہ کئی نشریاتی اداروں کو مشعل کی جنرل بک کی کاپیاں کروا کر دے چکی تھی۔

مشعل کی پہلے دن حجاب پہنے اور واش روم میں رونے والی تصویر کئی نیوز پیپرز نے نمایاں طور پر شائع کی تھیں۔

مشعل کے لیے ہمدردی، اور مشعل کے نام پر فساد، یہ دونوں عوامل حرکت میں آ چکے تھے۔ دنیا

میں اتنا سچ نہیں بکتا، جتنا فساد بکتا ہے۔

نیک نامی کو زمانے لگ جاتے ہیں اور بدنامی طوفان مچا دیتی ہے۔

پہلے خزاں رسیدہ پتے ہوا سے اڑے، اور بڑی دیر تک اڑتے رہے۔ پھر ہوا تیز ہو گئی، اور آندھی میں بدل گئی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ ”مشعل کہاں ہے؟“ مختلف چینل پر زیرِ بحث لایا جانے لگا۔ ریڈیو پر ایک تصوراتی کہانی پیش کی گئی جسے ”آخری فیصلہ“ کا ٹائٹل دیا گیا۔ جس میں اس رات مشعل کے فیصلہ کرنے کی کیفیت کو پیش کیا گیا۔

کہانی اتنی خوب صورت تھی کہ اسے بار بار نشر کرنے کی فرمائش کی گئی۔ ایک آرٹسٹ نے، نیوز پیپر آرٹ میں، مشعل کے کمرے کی کھڑکی کا اسکیچ بنایا اور اسے کیپشن دیا۔

”دی ریڈ ونڈو“

اس نے کھڑکی کی دہلیز پر خون کے دھبے بھی دکھائے تھے۔

☆☆☆

”دی ریڈ ونڈو“ کا اسکیچ اخبار میں آنے کی دیر تھی کہ جو کمی رہ گئی تھی، وہ بھی پوری ہو گئی۔ پاکستانی کمیونٹی میں اس اسکیچ کا بہت برا منایا گیا کہ وہ گمشدگی کے واقعے کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔ تارکینِ وطن کے خلاف اپنی بھڑاس نکال رہے ہیں۔ دیسی اخبارات نے کھل کر ناراضی کا اظہار کیا کہ یہ لوگ اپنے گریبان میں نہیں جھانکتے اور ہماری معمولی باتوں پر مرچ مسالہ لگاتے ہیں۔ ”دی ریڈ ونڈو“ نے جلتی پر تیل کا کام کیا، اور وومین رائٹس ایکٹیوسٹس پہلے سے زیادہ سرگرم ہو گئیں۔

"People have right to not to be found."

لوگوں کا حق ہے کہ وہ روپوش ہو سکیں۔ انہیں تلاش نہ کیا جائے۔ خاص کر ایسے لوگ جو ایبوزڈ ماحول سے ہوں۔ وہ کسی خاص انسان سے دور رہنا چاہتے ہیں تو وہ چھپ سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں پولیس یہ شیورٹی حاصل کر لیتی ہے کہ مطلوبہ انسان محفوظ ہے۔ وہ کہاں ہے یہ بتانا ضروری نہیں ہوتا۔

وہ بالغ ہے، پڑھی لکھی ہے، اس کے پاس پیسے ہیں، وہ کمزور نہیں ہے۔ وہ اپنی مرضی سے دنیا کے کسی بھی حصے میں رہ سکتی ہے۔ پر وہ جہاں ہے وہاں محفوظ بھی ہے، اس پر پولیس کو کسی قسم کا کوئی نشان نہیں ملا تھا۔ کیا وہ اغوا ہو چکی ہے؟ اس سلسلے میں تفتیش ہوئی۔ وہ قتل ہو چکی ہے، اس کی چھان بین بھی کی گئی۔

ہر سال امریکا میں ہزاروں لوگ لاپتا ہو جاتے ہیں۔ جن کا دوبارہ کبھی کوئی نشان نہیں ملتا۔ وہ مر گئے، وہ زندہ ہیں، وہ کہیں چھپ گئے، انہیں اغوا کر لیا گیا، انہیں تہہ خانوں میں بند کر دیا گیا۔ انہیں ڈرگز دے کر الماری میں چھپا دیا گیا۔ اب انہیں روز ایک انجکشن لگایا جائے گا، انہیں نیم مردہ رکھا جائے گا اور زندہ بھی۔ انہیں زنجیروں سے باندھ دیا گیا۔

وہ گھر کے عین نیچے تہہ خانے میں قید ہیں اور اوپر معمول کی زندگی رواں دواں ہے۔ ساتھ والے گھر کو خبر نہیں کہ سفید گھر کے تہہ خانے میں ایک جیتا جاگتا انسان پڑا تڑپ رہا ہے۔ وہ انسان وہاں کئی سال گزار دیتا ہے، مر جاتا ہے۔ اور کسی کو خبر نہیں ہوتی۔

ایک نہیں......دو نہیں...... ہزاروں مرد، عورتیں، بچے اور مشعل جیسی لڑکیاں......اچانک، ایک دن، ایک شام، ایک رات ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ زندہ یا مردہ، کسی بھی حالت میں کسی کو دکھائی نہیں دیتیں۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔
ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/150 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بینک اکاؤنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 0317-2266944 میں رقم بھیج کرسکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ -/1800 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام "عمران ڈائجسٹ، اکاؤنٹ نمبر 0010000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے "PK44ABPA0010000015680030"، کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو -/500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک -/500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ -/22000 روپے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/25000 روپے،

کسی بھی معلومات اور آڈر کے لیے اس واٹس اپ نمبر 0317-2266944 پر رابطہ کریں

ایجنٹ حضرات اس واٹس اپ نمبر 03312266944 پر رابطہ کریں

نعیمہ ناز

تنگیاں

سڑک پر گاڑیوں کا اژدھام، ہارن کی پوں پوں انسانی وغیر انسانی آوازوں کا شور شرابا۔ ٹوٹی ہوئی سڑک کا گڑھا اور اس گڑھے سے بچ بچ کر نکلنے والی ٹریفک۔ سڑک کنارے مختلف ساز و سامان سے لدی دکانیں، دیکھنے اور گزرنے والوں کو اندر آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ ٹھیلے والوں کی ایک قطار تھی جو لذت کام و دہن کا بندوبست کیے ہوئے تھی، انگیٹھی پہ رکھے سیخ کبابوں اور بوٹیوں سے اٹھتا دھواں، انواع و اقسام کے پکوانوں سے اٹھتی مزے دار خوشبوئیں، فضا میں پھیلتے پھیلتے دور تک سفر کر رہی تھیں۔

دانیال نے بائیک کو کک لگائی، ایک دو، تین، چار پانچ، پتا نہیں کون سی ویں بار کوشش کر رہا تھا مگر بائیک نخریلی، روٹھی محبوبہ بنی، ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''بھائی جان، اسے مکینک کو دکھا دیں، خرچا مانگ رہی ہے۔''

سامنے کرسی پہ بیٹھے برگر کھاتے، ایک خدائی فوج دار نے مخلصانہ مشورہ دیا۔ اور یہ مشورہ نہ بھی دیا جاتا، تب بھی دانیال کو علم تھا کہ بائیک کو مکینک کی ضرورت ہے۔ مگر ساری بات آ کر رک جاتی خرچے پر جس کی سکت فی الحال دانیال میں نہیں تھی۔ اگلے ماہ کی سیلری ملنے تک گاڑی کو کسی نہ کسی طرح دھکا لگانا ہی تھا۔

درجنوں بار کک لگانے کے بعد بھی بائیک اسٹارٹ نہیں ہوئی، ناچار اس نے برگر کی تھیلی ہینڈل سے لٹکائی، بائیک اور خود کو گھسیٹتے ہوئے گھر پہنچا۔ جہاں برگر کا انتظار کرتی آپا جان کے صبر کے سارے پیمانے لبریز ہو چکے تھے۔

''توبہ ہے دانیال! دو قدم پہ برگر پوائنٹ ہے بندہ یوں گیا، یوں آیا۔ تم جا کر ہی غائب ہو گئے، بھوک کے مارے میرا تو دم نکلنے والا تھا۔'' آپا نے بغیر رکے بولتے ہوئے بے تابی سے برگر نکالا اور ایک بڑا لقمہ لیا۔

دانیال متذبذب سا وہیں کھڑا تھا۔

آپا نے ایک نگاہ اس پہ ڈالی، اچانک انہیں کچھ یاد آیا انہوں نے جلدی جلدی منہ چلا کر لقمہ ختم کیا۔

''تمہارا کھانا نکال رکھا ہے، کچن سے لے لو، آلو گوبھی ہے کھا لو گے نا، یا کچھ اور بنا دوں؟''

''آلو گوبھی؟'' دانیال کی تو نام سنتے ہی بھوک مر گئی مگر آپا کے سامنے وہ کچھ بولتا ہی کب تھا۔ اس وقت بھی سر جھکا کر فقط ایک ''جی'' کر کے رہ گیا۔

کچن میں گیا، ہاٹ پاٹ پلیٹ اور باؤل، لا کر میز پہ رکھا پانی کی بوتل اور گلاس اٹھا رہا تھا جب زریاب نازل ہو گیا۔

''مما! بھوک لگ رہی ہے۔ فٹافٹ کھانا دے دیں۔'' وہ میز پر آیا اور اس پہ رکھے باؤل میں جھانکا اور تڑپ ہی گیا۔

''آلو گوبھی پکائے ہیں؟ میں کیا کھاؤں گا؟''

''تم تو کہہ رہے تھے اپنے دوستوں کے ساتھ باہر جانے اور کھانے کا پروگرام ہے؟'' برگر کھاتی امی کو اچھو لگ گیا۔ لاڈلے اور نخریلے بیٹے کی بھوک کا علاج اس وقت تو ان کے پاس نہیں تھا۔

''کینسل ہو گیا پروگرام، مگر آپ نے کچھ پکایا کیوں نہیں؟'' وہ جھنجھلایا اور چاچو کی پلیٹ سے

مکمل ناول



آلو اٹھا کر منہ میں رکھا اور کھانے لگا۔
"کیا پکائی؟ گیس ہی نہیں آرہی تھی، تمہارا پروگرام باہر کا تھا۔ دوستوں کے ساتھ، تمہارے ابو کو کوئی پرانا دوست مل گیا۔ اس کے ساتھ کھانا کھا کر آئیں گے۔ میں اور دانیال بچے تھے۔ میں نے برگر منگوالیا دانیال نے کہا کہ آلو گوبھی کھالے گا۔ اسے دے دیا۔"
"ماموں نے تو نہیں کہا ہوگا آلو گوبھی کھانے کو۔" بیٹے نے امی کا بیانیہ مسترد کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور ماموں کی پلیٹ سے آلو کا دوسرا ٹکڑا اٹھایا۔
"تمہاری طرح نہیں ہے میرا بھائی، جو میں بناتی ہوں، کھالیتا ہے، نخرے نہیں دکھاتا۔"
"مجبوری میں کھالیتے ہیں، شوق سے تو نہیں کھاتے، اور مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" زریاب نے بولتے بولتے پھر نعرہ مستانہ بلند کیا۔
"گیس تو ابھی تک نہیں آئی باہر سے کچھ لے آؤ۔"
"نوٹ نکالیں، فٹافٹ، چلیں ماموں اٹھ جائیں۔"
"اب اسے کہاں لے جارہے ہو؟ کھانا تو کھانے دو۔"
"کھا نہیں رہے، زہر مار کررہے ہیں۔"
"بری بات بیٹا، رزق ہے، ایسے نہ کہو۔" ماموں نے اپنے مخصوص دھیمے انداز میں میں بھانجے کو ٹوکا۔
"رزق میں دو چار چیزیں تھوڑی ہیں جو آپ روز کھاتے ہیں، گھر سے باہر دیکھیں دنیا کی نعمتیں موجود ہیں۔"
زریاب کا مباحثہ شروع ہو چکا تھا جس سے امی جان اب گھبرانے لگی تھیں، بیٹے کا منہ بند کرنے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ اس کا مطالبہ پورا کیا جائے، انہوں نے بیڈروم سے پانچ سو کا نوٹ برآمد کیا اور زریاب کے حوالے کیا۔
"یہ لو اور جو کھانا ہے کھالو۔"

"اور ماموں؟ وہ بھی تو میرے ساتھ جارہے ہیں وہ کیا کھائیں گے؟"
"تو پھر ہے زریاب! بہت ہی تنگ کرتے ہو تم۔" وہ جھنجلا گئیں تیکھے نقوش والے سانولے چہرے پہ ہلکی سی ناگواری چھا گئی۔
دانیال نے ہی بھانجے کو ٹوکا۔
"میں کھانا کھاچکا ہوں۔"
"پھر بھی جانا پڑے گا۔ میری بائیک میں پیٹرول نہیں ہے۔ آپ اپنی موٹر سائیکل پہ لے کر چلیں۔"
"میری بائیک خراب ہوگئی ہے۔ آج تو بالکل ہی جواب دے دیا تمام راستے گھسیٹتا ہوا لایا ہوں۔"
"اٹھ جائیں پھر، آپ کی گاڑی مکینک کو دے آتے ہیں۔ پھر کچھ کھانے پینے کا پروگرام کرتے ہیں۔" زریاب نے فٹافٹ پروگرام بنایا اور ماں کو مخاطب کیا۔
"ایسا ہی ایک نوٹ اور دے دیں تو تھوڑا بہت گزارا ہو ہی جائے گا۔"
"زریاب!"......امی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، مگر زریاب ان کی طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔
"چلیں ماموں، کھڑے ہو جائیں، میں بائیک نکال رہا ہوں آپ کی۔ امی، لائیں ایک نوٹ اور دے دیں جلدی کریں پلیز۔"
"درخت لگے ہیں کیا، جاؤں اور توڑ کر لادوں؟"
ان کا لہجہ تلخ ہورہا تھا۔ برگر کا سارا مزا اس نالائق اولاد نے کرکرا کردیا تھا۔
دانیال نے گلاس میں پانی ڈالا اور پینے سے پہلے زریاب کو پھر ٹوکا۔
"زریاب! آپا کو تنگ مت کرو۔" دانیال نے پانی پیا، اللہ کا شکر ادا کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
"میں تو آپ کے ساتھ ہی جاؤں گا۔"
زریاب بچپن والا بھانجا بن گیا۔ ضدی اور لاڈلا جس کی ضدیں پوری کرنے اور لاڈ اٹھانے کو

دانیال ماموں ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ زریاب انہیں اپنے ساتھ لے کر ہی ٹلا۔

پانچ سو کا ایک اور نوٹ بیٹے کے حوالے کرتے ہوئے وہ بڑبڑاتی رہیں مگر زریاب ایسے موقعوں پہ چکنا گھڑا بن جاتا۔ دونوں چلے گئے مگر امی کو ایک تشویش اور فکر نے گھیر لیا تھا زریاب کے چھن اچھے نہیں دکھائی دے رہے تھے۔

☆☆☆

نیو کٹنگ بالوں میں برش پھیرتے ہوئے وہ خود ہی اپنے آپ پر فدا ہو رہی تھی۔

"کیسی لگ رہی ہوں میں؟" بلا مبالغہ کوئی بیسویں بار یہ سوال پوچھا تھا، زرینہ نے اور دانیہ نے ہر بار وہی جواب دیا تھا جو وہ سننا چاہ رہی تھی مگر جو سچ بھی تھا۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو۔ مگر اب کپڑے نکال دو۔ میں پریس کر دوں، لائیٹ چلی گئی تو مصیبت ہو جائے گی۔"

"ابھی نکالتی ہوں جوڑا۔" زرینہ وارڈ روب کی طرف بڑھی۔ کمرے میں فریال بھابھی اندر آئیں وہ سیدھی مارکیٹ سے آ رہی تھیں۔

"دانیہ نے آٹا گوندھ کے رکھ دیا صبح کے لیے؟ اور تمہارے بھائی کے لیے سالن اور" بولتے بولتے وہ بیڈ پہ ڈھے سی گئیں۔

"توبہ ہے۔ دو گھنٹوں میں اتنی تھکن ہو گئی جیسے پورا دن بازار میں پھر کر آ رہی ہوں۔" دانیہ سے سوال جواب ادھورے چھوڑ کر وہ اپنا دکھڑا رونے لگیں پھر اچانک دانیہ سے دوبارہ مخاطب ہوئیں۔ "کام تو ہو گیا نا سارا؟"

"جی بھابھی! سارے کام ہو گئے ہیں...... صبح بھیا کے لے جانے کے لیے سالن بنا دیا۔ آٹا بھی گوندھ لیا اور کچن صاف کر دیا ہے، کپڑے پریس ہو گئے ہیں۔ زرینہ اور آپ کا باقی ہے۔" دانیہ کے تفصیلی جواب نے ان کی تھکن کچھ کم کر دی تھی۔

اتنی دیر میں زرینہ، ان کا لایا ہوا جوڑا شاپر سے نکال کر معائنہ کر چکی تھی۔

"بہت پیارا لگ رہا ہے۔ ایک جوڑا پھپھو کے لیے بھی لے آتیں دس بار کا پہنا ہوا وہی اکلوتا سوٹ آج پھر پہن رہی ہیں۔" زرینہ کے اعتراض اور فرمائش پر فریال کی بھنویں تن گئیں۔

"جوڑے کیا سستے ہیں کہ جاؤ اور لے آؤ۔ پارٹی ویئر سوٹ کئی کئی ہزار کے ہیں یہ جوڑا خریدنے کے لیے بھی میں نے کئی مہینے بچت کی ہے، تب جا کر لائی ہوں۔"

"ہر شادی پر آپ نیا سوٹ لاتی ہیں اور یہی کہتی ہیں، دانیہ پھپھو کے پاس ایک بھی ڈھنگ کا پارٹی ویئر نہیں ہے۔" زرینہ آج کی نسل تھی۔ جو ٹھیک لگتا کھٹاک سے بول دیتی، اور اس کا اس طرح بولنا فریال کو بہت برا لگتا تھا۔

"اچھا بھئی یہ لو اپنی مظلوم پھپھو کو دے دو یہ جوڑا، میں کچھ اور پہن لوں گی، میرے پاس تو بہت کپڑے ہیں۔"

فریال نے غصے میں سوٹ اٹھا کر زرینہ کی طرف پھینکا۔ دانیہ گھبرا گئی، وہ دونوں ماں بیٹی کے بے لاگ اور بنا لحاظ بولنے پر اسی طرح گھبرا جاتی تھی۔ بے شک زرینہ اس کی حمایت میں بولتی تھی۔ مگر فریال بھابھی کا غصہ اس کی حمایت پہ حاوی آ جاتا تھا۔

"لاؤ زرینہ، اپنا سوٹ دو، میں پریس کر دوں۔"

دانیہ نے فٹافٹ یہاں سے گم ہونے کی خواہش میں، جلدی سے بھتیجی کے ہاتھ سے ہینگر لیا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ فریال بھابھی کا جوڑا پہلے ہی اٹھا چکی تھی استری کے لیے۔

کمرے سے باہر نکل کر دانیہ نے سکون کا سانس لیا۔ فریال اور زرینہ کی اس قسم کی بحث سے وہ بہت خائف ہوتی تھی۔ جس کا موضوع اس کی اپنی ذات ہوتی تھی اور اب ایسی بحث اکثر ہونے لگی تھی جب سے زرینہ یونی ورسٹی جانے لگی تھی۔ اور گھر میں

اس کے رشتے اور شادی کی باتیں ہوتیں تو وہ دانیہ کو مقابلے پر کھڑا کر دیتی۔

"پہلے پھپھو کے لیے تو دیکھیں۔"

"ارے کوئی مناسب رشتہ ملے تو کریں، اب تو دوہاجو رنڈوے اور بچوں والے کے رشتے آتے ہیں ایسے ہی کسی سے کر دیا تو سب سے پہلے تم ہی اپنی ماں کو طعنوں پہ رکھ لوگی۔"

فریال بلبلا جاتیں۔ آج کل کی منہ پھٹ اولاد کا علاج ہے کسی کے پاس؟

☆☆☆

شادی سے واپسی پر ان کا موڈ پہلے سے بھی زیادہ خراب تھا۔ سنگھار میز کے آئینے کے سامنے جیولری اتار کر، میک اپ صاف کرتے ہوئے وہ میاں جی کے سامنے پھٹ پڑیں۔

"یہ آپ کے خاندان والے کس قسم کی گھٹیا ذہنیت کے لوگ ہیں؟ سب کے گھروں میں دانیہ کے جوڑ کے لڑکے تھے۔ جب کرنے کا وقت تھا۔ تب تو کسی نے نہیں پوچھا، اب مجھے طعنے دیے جا رہے ہیں۔ آپ کی وہ رفعت خالہ مجھ سے ایسے سوال جواب کر رہی تھیں جیسے دانیہ کی شادی نہ ہونے میں سارا قصور میرا ہے۔"

بولتے بولتے فریال بیگم کی آواز رندھ گئی۔ ٹشو پیپر سے گیلی آنکھیں صاف کرتے ہوئے انہوں نے شوہر کی طرف دیکھا جو ان کے ہر فیصلے، ہر بات پر آنکھیں بند کر کے آمنا وصدقنا کہنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

"آپ خود گواہ ہیں، کتنی بار کوشش کی ہے دانیہ کے لیے کہ کوئی اچھا رشتہ مل جائے مگر سب ٹیڑھے میڑھے رشتے آئے، اب اگر ایسے ہی کسی کے ساتھ کر دیتے تو تب بھی میں بری بنتی کہ اپنے سر سے بلا ٹال دی۔" فریال بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"آپ کی صالحہ پھپھو نے تو منہ پر ہی ذلیل کر دیا مجھے، کہہ رہی تھیں کہ مفت کی نوکرانی ملی ہوئی ہے۔ تب ہی اس کی شادی میں دلچسپی نہیں لیتی۔"

بولتے بولتے دو آنسو ٹپک ہی گئے اور شوہر صاحب تڑپ گئے۔

"وہیں بتانا تھا مجھے سب کا دماغ درست کر دیتا۔ ہم نے کیا جان بوجھ کر اپنی بہن کو بٹھا رکھا ہے؟"

شاہد صاحب ان شوہروں میں سے تھے جو بیوی کی آنکھوں سے دیکھتے تھے اسی کے کانوں سے سنتے تھے اور اسی کی زبان بولتے تھے۔

اس وقت بھی بیوی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ، تسلی اور دلاسا دینے لگ گئے۔ انہیں آج تک بھی علم ہی نہیں ہوا کہ آنسو مکاری کے بھی ہوتے ہیں۔ بار بار خود کو بے گناہ بتلانا اور اپنی صفائی پیش کرنا بھی اعلیٰ درجے کی چالاکی اور عیاری ہوتی ہے۔

وہ اپنی بیگم کی طرف ہر وقت متوجہ رہتے تھے کہ پیشانی پہ شکن اور آنکھ میں آنسو نہ آئے انہوں نے کبھی غور سے اپنی سادہ خاموش بہن کو نہیں دیکھا تھا کہ گھر کے کاموں میں مصروف اس کے چہرے پہ کتنی تھکن ہے اور کتنی اداسی؟

☆☆☆

موسم رنگ بدل رہا تھا۔ دیوار سے لپٹی بیل کے سبز پتے زرد ہونے لگے تھے۔ دانیال نے زرد پتے کو چھوا جس میں ابھی سبز رنگ باقی تھا۔ یہ پتا کچھ کچھ اس کی زندگی کی طرح لگ رہا تھا۔

اس نے ہاتھ ہٹا لیا، اندر داخل ہوتے ہوئے کوکر کی شوں شوں کے ساتھ ساتھ ارم آپی کی پاٹ دار تیز آواز نے بھی استقبال کیا، جو فون پر باتیں کر رہی تھیں۔

"کئی بار بتا چکی ہوں تمہیں کوئی ڈھنگ کی لڑکی دکھاؤ اب میرا بھائی اتنا گیا گزرا بھی نہیں، اپنی عمر سے تو کم ہی لگتا ہے۔

نوکری اور سیلری بھی ٹھیک ٹھاک ہے......

"ہیں؟......" انہوں نے بولتے بولتے موبائل کو ایک کان سے دوسرے کان پہ منتقل کیا۔

"ہاں، وہ لڑکی تو اچھی تھی مگر خاندان نہیں دیکھا

تم نے؟ بھئی ہمارے ہاں تو ہڈی، خون سب دیکھا جاتا ہے، یہ تھوڑی کہ منہ اٹھا کر کہیں بھی رشتہ جوڑ لو۔

اچھا بات سنو، میرے موبائل کی بیٹری ڈاؤن ہو رہی ہے میں بعد میں بات کرتی ہوں، ٹھیک ہے؟ پھر کوئی دیکھ کے رکھنا، اچھی سی لڑکی، میرے بھائی کے لیے۔"

آخری فقرہ انہوں نے دانیال کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔ موبائل آف کر کے چارج میں لگاتے ہوئے دانیال کو مخاطب کیا۔

"رومانہ کی کال تھی، لڑکی بتا رہی تھی تمہارے لیے، رات میں دوبارہ کال کر کے تفصیلات بتائے گی۔"

"جی!" دانیال بمشکل مسکرایا، پچھلے پندرہ برسوں سے یہی تماشہ دیکھ اور سن رہا تھا۔ پہلے یہ ذکر سن کر دل سے مسکراتا تھا۔ اور کون جانے آنے والے وقت میں یہ جھوٹی مسکراہٹ بھی غائب ہو جائے؟

"ارے دانیال! بات سنو۔"

"جی آپا!" وہ ٹھہر گیا۔

"گیس کا بل بھر دو گے ذرا؟ دراصل نبیل کی طبیعت خراب تھی نا پچھلے ہفتے، اچھی خاصی رقم ٹیسٹوں میں اٹھ گئی، پھر میڈیسن بھی اتنی مہنگی...... کیا بتاؤں۔ میں تو بس ایک جنجال میں پھنسی ہوئی ہوں۔ جیسے تیسے گھر چلائی ہوں۔ اوپر سے لوگوں کی باتیں تمہاری فکر لگی رہتی ہے۔ اپنے گھر بار کے ہو جاؤ تو میرے سر سے ذمہ داری ہٹے۔ تینوں ٹائم کھانے کا دھیان رکھتی ہوں۔ ہر طرح سے خیال رکھتی ہوں۔ پھر بھی میں بری ہوں۔ تم اپنے ایمان سے بتاؤ ذرا، آج تک تمہاری سیلری اپنے ہاتھ میں لی میں نے؟ جو کماتے ہو، اپنی مرضی سے خرچ کرتے ہو۔ میں نے کبھی تمہاری کمائی پہ نظر رکھی؟"

"کیا ہوا آپا؟ کسی نے کچھ کہہ دیا کیا؟" اتنی لمبی تقریر پر دانیال گھبرا سا گیا۔

"اب تو سنتی ہی رہتی ہوں ہر ایک سے، بھائی کی شادی نہیں کر رہی۔ بھائی کی شادی نہیں کر رہی، بتاؤ ذرا، کیا میرے ہاتھ میں ہے یہ؟ اللہ کا حکم ہو گا تب ہی کام ہوتے ہیں نا۔"

"چھوڑیں لوگوں کی باتوں کو، آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں لوگوں کا تو کام ہی یہی ہے باتیں بنانا۔ آپ بل دے دیں مجھے۔ میں بھر دوں گا۔ لاسٹ ڈیٹ کیا ہے؟"

"پرسوں کی ہے، ایک تو یہ کم بخت گیس والے بھی بجلی والوں کے نقش قدم پر چلنے لگے ہیں۔ گیس آتی نہیں چولہوں میں اور بل ایسے بھاری بھرکم جیسے یہاں کوئی انڈسٹری لگی ہوئی ہے بتاؤ ذرا۔ آٹھ ہزار کا بل بھیج دیا۔ ارے ہم یہاں دیگیں پکا رہے ہیں کیا؟"

"آٹھ ہزار؟ دانیال چونک گیا" آٹھ ہزار کا بل ہے؟"

"ہاں نا تب ہی تو پہلے تو ہنڈرڈز میں ہوتا تھا۔ اب تھاؤزنڈز میں آنے لگا ہے۔ بتاؤ ذرا ہم جیسے سفید پوش کہاں جائیں؟"

ارم آپا کی تقریر ختم ہوئی تو گیس کا بل انہوں نے دانیال کو تھما دیا۔

"تھینک یو میرے بھائی، تم ہمیشہ میرے برے وقت میں کام آتے ہو۔" وہ آب دیدہ ہوتے رہ گئیں۔

اور واقعہ یہ تھا کہ وہ کوئی بھی کام دانیال کے سپرد کرتیں تو اتنی ممنون ہوتیں، اتنی احسان مند ہوتیں۔ اتنا شکریہ ادا کرتیں اس کا اور اتنا شکر ادا کرتیں اللہ کا جس نے ہیرے جیسا بھائی دیا ہے کہ دانیال کے دل میں کوئی منفی خیال تو دور کی بات الٹا وہ بڑی بہن کے اتنے احسان مند ہونے پر شرمندہ ہو جاتا۔

آج کے دور میں ایسے کون کرتا ہے؟ لوگ اپنا کام نکلواتے ہیں اور آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ مگر ارم آپا کا تو رواں رواں دانیال کا احسان مند ہوتا تھا۔

بل کو لے کر وہ پریشان تھا، کہاں سے بھرے؟ کیسے بھرے؟ بالکل آخری دن چل رہے تھے۔ تنخواہ ملنے میں ہفتہ باقی تھا اور بل بھرنا ضروری تھا۔ ناچار ایک دوست سے ادھار لے کر بل بھرا اور

آپا کے آگے سرخرو ہو گیا۔
کوئی پہلی بار کا یا نیا معاملہ نہیں تھا۔ پچھلے اٹھارہ برسوں سے یہ تماشا چل رہا تھا۔ ارم آپا کا دعویٰ بالکل سچ تھا کہ وہ دانیال کی تنخواہ کو ہاتھ بھی نہیں لگاتی تھیں۔ بس وہ فقط اتنا کرتی تھیں کہ وقفے وقفے سے کسی مصیبت اور مشکل میں بھائی کو یاد کرتی تھیں۔
"دانیال! ذرا یہ بل بھر دینا۔"
"دانیال! گروسری لے آؤ گے؟ میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔"
"دانیال! میرے پیارے بھائی، آج شادی میں جانا ہے۔ لفافہ تم بنا دو ذرا۔"
"دانیال! تمہارے بھانجے کی فیس بھرنی ہے اکیڈمی کی، ذرا دیکھ لو۔"
"نئے موسم کی نئی کلیکشن آئی ہے کپڑوں کی، مگر بھئی ہم جیسے کہاں خرید سکتے ہیں یہاں تو چادر ہی بس اتنی ہے سر ڈھانپو تو پیر کھل جاتے ہیں۔ پیر ڈھکو تو سر کھل جاتا ہے۔ نئے کپڑوں کا تو سوچ کر ہی رہ جاتے ہیں بس۔"
ارم آپا اپنے بھائی کے سامنے انتہائی دکھی ہو جاتیں اور پھر ان کا کام ہو جاتا۔
زندگی کے دن یونہی گزر رہے تھے اور خوب گزر رہے تھے کہ ایک روز۔

☆☆☆

کشن ترتیب سے رکھ کر، کارنر ٹیبل کا گلدان درست کیا۔ سینٹر ٹیبل پہ پڑے اخبار کے صفحات سمیٹ کر رکھے اور ایک گہری سانس لے کر وہ صوفے پہ براجمان ہو گئیں۔
"ارے بھئی دانیہ! ایک کپ چائے مل جائے گی؟"
"جی بھابھی! ابھی لائی۔" کچن سامنے ہی تھا۔ دانیہ نے ذرا دیر میں گرم گرم چائے کا مگ میز پر رکھا۔
"شام کی تیاری تو سب مکمل ہے نا؟"
انہیں بڑی فکر ہو رہی تھی۔ جو مہمان زرینہ کو دیکھنے آ رہے تھے۔ بڑے ہائی فائی قسم کے تھے۔ اگر یہاں بات بن جاتی تو بیٹی کے نصیب سنور جاتے، خاندان میں جب سے زرینہ کی ہم عمر دو لڑکیوں کے اچھی اچھی جگہوں پہ رشتے طے ہوئے تھے۔ فریال کو بھی اپنی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کی فکر ستانے لگی۔
"یہی وقت ہے اپنے گھر بار کی ہو جائے، ذرا دیر ہو جائے تو بس پھر وقت ہاتھوں سے نکلتا ہی چلا جاتا ہے۔"
انہوں نے دانیہ کو دیکھتے ہوئے سوچا، جو انہیں مہمانوں کی خاطر مدارات کے لیے کی جانے والی تیاریوں سے آگاہ کر رہی تھی۔ مگر ان کا دھیان کہیں اور تھا۔ بھانت بھانت کے خیالات دماغ میں آ رہے تھے۔
"زرینہ کا رشتہ یہاں طے ہو جائے تو تمہیں خوشی ہو گی نا؟"
اپنے خیالات کے سرسراتے سانپ انہوں نے دانیہ کی سماعتوں میں انڈیل دیے۔
دانیہ نے حیرانی سے بھابھی کو دیکھا پھر سادگی سے مسکرا دی۔
"زرینہ مجھے بہت پیاری ہے۔ آپ جانتی ہیں۔ اس کی خوشی میری خوشی ہے۔"
بہت رسان سے جواب دے کر وہ کچن میں گئی تھی جہاں ڈھیروں ڈھیر کام اس کے منتظر تھے۔
فریال بھابی کی پیشانی پہ تشویش کی لکیریں نمایاں ہو گئیں۔ پتا نہیں سچ بول رہی ہے یا جھوٹ، بظاہر تو سیدھی سادی بنی رہتی ہے مگر بھئی دلوں کا حال کسے معلوم۔ کیا پتا، دل میں کچھ اور ہو زبان پہ کچھ اور؟ اپنی خصلت اور فطرت کے آئینے میں وہ دانیہ کو دیکھ رہی تھیں۔
زرینہ، ماں سے الجھ رہی تھی۔
"پہلے پھپھو کی شادی ہو گی پھر میری۔"
"یہ کہاں لکھا ہے؟" فریال جز بز ہو رہی تھیں۔
"میرے اصولوں کی کتاب میں۔" وہ مزے سے چاکلیٹ کھا رہی تھی۔
"تمہاری اسی کالی زبان کی وجہ سے یہ رشتہ

ہاتھ سے نکل گیا۔

فریال کو خاصا قلق تھا کہ ایک بہترین جگہ رشتہ ہوتے ہوتے رہ گیا مگر زرینہ کو ذرہ برابر افسوس نہ تھا۔ ان دنوں اس کا سارا دھیان خیال اور توجہ دانیہ پھپھو کی طرف تھا۔ اب وہ بچی نہیں رہی تھی۔ ماں کی خود غرضی اور باپ کی بے حسی۔ اسے نظر بھی آ رہی تھی۔ سمجھ میں بھی آ رہی تھی مگر اس معاملے پر وہ ایک حد تک ہی لب کشائی کر سکتی تھی۔

کبھی مذاق میں کبھی سنجیدگی سے ماں کو جتانے کی کوشش کرتی، ان کے رویے کا احساس دلاتی، وہ کبھی بیٹی کی باتوں کو نظر انداز کر دیتیں، کبھی جذباتی ہو جاتیں مگر زرینہ نے اب فیصلہ کر لیا تھا محض باتوں سے کام نہیں بننا تھا۔ کوئی عملی قدم اٹھانا ضروری تھا۔ اس کے پاس ایک منصوبہ تھا۔ جس پر فی الفور اسے کام کرنا تھا۔

☆☆☆

دانیال نے بل بھر دیا تھا۔ لا کر آپا کو دے دیا۔

زریاب نے ایک گہری سانس لی اور تاسف سے ماموں کو دیکھا امی تو اندر چلی گئی تھیں۔ بھانجے نے ماموں کی کلاس لینی شروع کر دی۔

''ماموں! یہ کیا حماقت کرتے رہتے ہیں آپ؟''

''کون سی حماقت؟'' دانیال صوفے پہ بیٹھ گیا۔ ایک کپ گرم گرم چائے مل جاتی تو مگر خیر...... اپنی خواہشات اور آرزوؤں کو دل کے نہاں خانوں میں چھپانا خوب آتا تھا۔

''ماموں بناتی ہیں امی آپ کو اور آپ بن جاتے ہیں۔'' زریاب نے اپنا موبائل آن کیا۔

''ماموں تو میں ہوں۔ بنانے کا کیا مطلب؟''

''ماموں کا مطلب، بے وقوف پاگل اور......''

زریاب کی بات ادھوری رہ گئی۔ امی جان نے اس کا بے لاگ تبصرہ سن لیا تھا جو ان کے بارے میں تھا۔

''شرم تو نہیں آتی ماں کے خلاف ایسی باتیں کرتے، میرے بھائی کو بھڑکاتے ہوئے؟ کہیں سے لگتا ہے تم میری سگی اولاد ہو؟''

''میری آنکھیں بالکل آپ کی طرح ہیں خوب صورت اور نشیلی۔'' زریاب چکنا گھڑا، ماں کی صلواتیں، بوندیں بن کر پھسلیں اور غائب ہو گئیں۔

''دیکھ رہے ہو، آج کل کی نسل کو، بے دیدہ، بد لحاظ، ذرا جو آنکھ میں شرم ہو، قینچی کی طرح زبان چلتی ہے۔ آگے بھلے ماں ہو باپ ہو یا کوئی اور۔ بک بک کرنے سے مطلب ہے۔''

ارم کو بہت طیش آ رہا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بچپن کی طرح بیٹے کے کان مروڑ کر ایک دو چھتر لگا دیں غصے کے ساتھ ساتھ کھسیاہٹ بھی تھی جیسے بیٹے نے ان کی چوری پکڑ لی ہو اور اس چوری کو لوگوں کے سامنے لے آیا ہو۔

''چائے بناؤں دانیال؟'' آپا کے لہجے میں وہ چاشنی تھی جو کم کم ہی ہوتی تھی۔

''جی آپا، طلب تو ہو رہی ہے۔'' دانیال نے سادگی سے اعتراف کیا۔

زریاب نے ماں کو کچن میں جاتے دیکھا۔ اور ماموں کو مخاطب کیا۔

''آپ کی طلب بس چائے اور کھانے تک ہی محدود رہتی ہے؟ اس کے علاوہ اور ان سے آگے بھی کچھ سوچتے ہیں؟''

''کیا سوچوں؟''

''زندگی میں کچھ اور بھی تو ہونا چاہیے، کسی کا ساتھ، ہاتھوں میں ہاتھ، مہکی ہوائیں چاندنی رات؟'' زریاب نے آواز دھیمی رکھی تھی، تاکہ امی تک نہ پہنچے۔

''قسمت کے کھیل ہیں۔'' دانیال کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔

''سچ بتائیں آپ کا دل نہیں چاہتا اس بلیک اینڈ وائٹ زندگی میں نئے رنگ شامل ہوں۔ خوب صورت اور انوکھے؟''

زریاب نے ان کی طرف جھک کر سوال کیا

دانیال کے چہرے پہ ایک رنگ آیا اور گزر گیا۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پہ پھیلی پھر سمٹ گئی۔

"اب عمر نہیں رہی ایسی باتیں سوچنے کی۔"

"عمر کا کیا ہے یہ تو بس ایک نمبر ہے۔ آپ ذرا اپنا خیال رکھنا شروع کردیں تو میرے بڑے بھائی لگیں، ٹال، ہینڈسم اینڈ اوسم۔"

"یہ تم میری تعریف کررہے ہو یا اپنی" دانیال مسکرائے، سامنے سے آپا چائے لارہی تھیں۔

"کرلیں ماں کی برائیاں؟" چائے کا مگ دانیال کے سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے بیٹے کو گھور کے دیکھا۔

"کیوں گناہ گار کررہی ہیں مجھ معصوم کو؟" زریاب کی نوٹنکی۔

دانیال بے ساختہ مسکرادیا مگر اب یوں تھا کہ مسکراہٹ تادیر ہونٹوں پہ قائم نہیں رہتی تھی۔ یوں اچانک سمٹ جاتی جیسے چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔ زندگی میں دو ہی رنگ تھے سیاہ اور سفید، اس نے خوابوں اور خیالوں کو محدود کرتے کرتے ختم ہی کرڈالا تھا۔ کوئی رنگین خواب، دھنک رنگ سپنا، دل کا رخ کرتا نہ آنکھوں کا۔

دانیال نے چائے کا مگ اٹھایا اور لبوں سے لگایا۔ گرم گرم چائے زبان، حلق اور سینے کو جلاتی ہوئی اندر اتری۔

ارم آپا کا غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا، وہ بدستور بیٹے کو باتیں سنارہی تھیں۔ بیٹا بھی دوبدو جواب دے رہا تھا۔

"زریاب......" دانیال نے اسے مخاطب کیا جو بڑی شدومد سے ماں کے ساتھ بحث میں مصروف تھا۔

"جی ماموں!" وہ دانیال کی طرف متوجہ ہوا۔

"امی سے بحث مت کرو۔ ادب کرو، ماں ہیں تمہاری۔" دانیال بہت سنجیدہ تھا زریاب خاموش ہوگیا۔ پھر بولا۔

"میں کہاں ماموں، یہ تو امی ہی......"

"دیکھو، ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔" دانیال نے اس کی بات کاٹی۔

"جو محبت اور بے غرضی، والدین سے تمہیں ملے گی، وہ کسی رشتے سے نہیں ملے گی۔" دانیال کے انداز میں ایسا کچھ تھا جو زریاب اور ارم دونوں کو چونکا گیا۔

دانیال نے اطمینان سے چائے کا گھونٹ بھرا اور پھر بہن کو مخاطب کیا۔

"آپا، اگلے مہینے امی کی برسی ہے نا، قرآن خوانی کروا لیجیے گا۔ میں بندوبست کردوں گا۔ میں نے بھی سپارے پڑھنے شروع کردیے ہیں۔ اگلے ماہ تک قرآن پورا ہوجائے گا۔"

"ہاں، کیوں نہیں، وہ تو ہم ہر سال ہی کرتے ہیں۔" ارم آپا جانے کیوں جھینپ گئیں، زریاب خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔

☆☆☆

خزاں کی واپسی ہورہی تھی، ٹنڈ منڈ شاخوں پہ ننھی منی کونپلیں کھلنے کی آہٹ ہوئی، بلند و بالا شجر سبز پوشاک پہننے کے منتظر تھے۔ جنہیں بہار اپنے دامن میں سمیٹے لارہی تھی۔

پھر ایک دن پھول کھل اٹھے۔ اچانک اور یکایک، شوخ رنگوں کے پھولوں نے فضا مہکادی۔

نئی بہار کے چند تازہ خوش رنگ اور شوخ رنگ پھول گل دان میں سجاتے ہوئے دانیہ نے ان کی خوشبو اپنے اندر اتاری۔ سچ مچ بہار آگئی تھی۔ اک دم سے بنا کسی چاپ کے خوشبوؤں اور پھولوں کی برسات اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھی۔

میچ میکر کے توسط سے ایک رشتہ آیا تھا جہاں بات بننے کا قوی امکان تھا۔

اور پھر یہ امکان حقیقت میں بدل گیا۔ اس نے دانیال کی تصویر دیکھی تھی۔ کھوئی کھوئی آنکھوں والا، گریس فل پرسنالٹی کے ساتھ، وہ بہت پرکشش تھا۔ زرینہ نے چھیڑ چھیڑ کر اس کا ناک میں دم کردیا تھا۔

ادھر دانیال کا بھی یہی حال ہورہا تھا، بھانجے

کے ہاتھوں جو دن میں کئی بار اس سے سوال کرتا تھا کہ اُسے دانیہ کیسی لگی؟ اور دانیال فقط ایک مسکراہٹ پہ اکتفا کر رہا تھا۔ ایک تصویر سے کسی کی فطرت معلوم ہوتی ہے نہ عادت، خصلت اور مزاج کا علم ہوتا ہے مگر ایک تصویر میں چہرے سے معصومیت اور سراپے سے سادگی نمایاں تھیں۔

"اور اگر یہی سادگی اور معصومیت فطرت میں بھی ہے تو بھلا اور کیا چاہیے؟" دانیال نے سوچا۔

معاملات ٹھیک ٹھیک آگے بڑھ رہے تھے۔ دونوں گھرانوں نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا تھا۔ گھر والوں کی موجودگی میں دانیہ اور دانیال کا منہ میٹھا ہو گیا تھا۔ اب بس تاریخ طے کر کے ڈائریکٹ شادی کا پروگرام تھا۔

اچانک لالچ اور خود غرضی کی بدصورت ڈائن دانت نکوستے ہوئے آگے بڑھی اور اپنے نوکیلے پنجوں سے ساری مسکراہٹیں نوچ ڈالیں، اپنے خون آشام دانت گاڑ کر ہر خوشی کو قتل کر دیا۔

☆☆☆

ہاتھ پھیلا کر انہوں نے اپنی انگلیوں کا جائزہ لیا۔ تازہ تازہ مینی کیور، پیڈی کیور کروایا تھا، ہاتھ پہلے سے بہت بہتر لگ رہے تھے لوشن لگاتے ہوئے ان کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی اور چہرے پہ اطمینان تب ہی زرینہ تیزی سے اندر آئی۔

"امی......!" اس نے بہت بے قراری سے ماں کو مخاطب کیا۔

"ہوں؟" فریال نے بے توجہی سے بیٹی کی طرف توجہ کی۔

"ان لوگوں نے انکار کیوں کر دیا؟"

"بیٹا، وہ جو دانیال کی بہن ہے نا، وہ ایک نمبر کی چلتر عورت ہے، بھائی کو بے وقوف بنا کر اس کی کمائی کھا رہی ہے، مکان پہ الگ قبضہ جمائے بیٹھی ہے۔ اپنا گھر کرایہ پر دیا ہوا ہے اب اگر بھائی کی شادی کرے گی تو یہ ساری عیاشی تو ختم ہو جائے گی نا۔ اسے اپنے بھائی کی شادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، رشتہ ڈھونڈ کر اور لگا کر بے وقوف بناتی ہے۔ بھائی کو بھی اور دنیا والوں کو بھی۔"

زرینہ کے سوال کے جواب میں فریال نے پوری تقریر جھاڑ دی۔

"کہا کیا ہے؟" زرینہ نے اکتا کر دوبارہ سوال کیا۔

"کہنا کیا ہے۔ پہلے تو فضول اعتراض نکال کر بیٹھ گئیں کہ آپ لوگوں نے ہمارے بھائی کی اتنی انکوائری کیوں کروائی ہے؟ وہ کوئی کرمنل ہے؟ وغیرہ وغیرہ پھر میری بات پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ارے بھئی میں نے تو صرف یہ پوچھا تھا کہ شادی کے بعد بھی آپ یہیں رہیں گی یا اپنے گھر شفٹ ہو جائیں گی؟"

"آپ کو کیا ضرورت تھی پوچھنے کی؟ یہ سب باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی تھیں۔"

"میں نے تو یونہی پوچھا تھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ محترمہ کی دم پہ پیر پڑ جائے گا وہ تو ایسی آپے سے باہر ہوئی کہ پوچھو مت۔" فریال نے منہ بنایا۔

"انکل اچھے لگے تھے مجھے۔ پھپھو کے ساتھ کتنی اچھی لگتی جوڑی مگر۔" زرینہ کے لہجے میں بہت مایوسی تھی۔

"چھوڑو دفع کرو۔ دنیا کا آخری مرد تھوڑا ہی ہے۔ دیکھ لیں گے کوئی اور رشتہ، دانیہ کے لیے۔" فریال نے بولتے بولتے ایک بار پھر اپنی انگلیاں پھیلا کر جائزہ لیا۔

زرینہ خاموشی سے اٹھ گئی۔ باہر آئی تو دانیہ کچن میں کچھ کر رہی تھی۔

"افوہ، ایک تو آپ کو ہر وقت کوئی نہ کوئی کام لاحق رہتا ہے۔ کبھی فارغ بھی بیٹھ جایا کریں۔" زرینہ جھنجلائی۔

"فارغ بیٹھ کر کیا کروں گی؟ بوریت ہی ہوگی۔ ویسے بھی مجھے کام کرنا اچھا لگتا ہے۔" دانیہ اپنے مخصوص دھیمے انداز میں بول رہی تھی۔ ساتھ ساتھ پکوڑوں کے لیے بیسن گھول رہی تھی۔ چولہے پر کڑھی صبح سے پک رہی تھی۔

"میری سہیلی نے بڑے مزے مزے کی میمز بھیجی ہیں۔ چلیں آئیں، دکھاتی ہوں آپ کو۔"

"تم چلو، میں ابھی آتی ہوں۔"

"ایک منٹ میں؟"

"پانچ منٹ میں۔"

"ٹھیک ہے فٹافٹ آئیں۔" زرمینہ بولتی ہوئی کچن سے نکل گئی، دانیہ کے لبوں پہ ایک اداس سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

اگر دنیا میں زرمینہ جیسے لوگ نہ ہوں تو دانیہ جیسے لوگوں کی زندگی میں اور زیادہ اندھیرا ہوتا۔

☆☆☆

لاؤنج میں ایئر فریشنر کی دلفریب مہک پھیلی ہوئی تھی اور ایک اچھی خوشبو ماحول تو مہکا سکتی ہے مگر زندگی کو نہیں۔

زریاب نے سوچتی ہوئی نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔

"میرے تو ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر انکار کا ریزن کیا تھا؟ اچھا بھلا شادی کی ڈیٹ فکس ہونے جا رہی تھی اور یکایک سارا معاملہ ہی ختم ہو گیا۔" زریاب ابھی تک بے یقین تھا۔

"ارے وہ بڑی مکار عورت تھی دانیہ کی بھاوج شادی وادی نہیں کرنی تھی اسے نند کی، ایویں پاگل بنا رہی تھی سب کو۔" ارم آپا نے منہ بنایا۔

"بھلا بتاؤ، شادی سے پہلے ہی "میں" آنکھوں میں کھٹکنے لگی؟ ایک بار نہیں کئی بار پوچھ چکی تھی۔ آپ شادی کے بعد بھی یہیں رہیں گی؟ اپنے گھر کب شفٹ ہوں گی؟ اف بھائی تمہیں کیا تکلیف ہے میرے یہاں رہنے سے؟ میرے باپ کا گھر ہے۔ کسی کو کیا تکلیف ہے؟ میں تو اپنے بھائی کی دیکھ بھال کے لیے ٹکی ہوئی ہوں یہاں، یہ بے چارہ اکیلا کیسے رہتا؟"

ارم آپا نے بولتے ہوئے دانیال کی سمت دیکھا۔ جو بظاہر تو موبائل آن کیے بیٹھا تھا۔

"عجیب لوگ ہیں، بات اتنی آگے بڑھا کر پھر منع کر دیا۔" زریاب بڑبڑایا۔

"اچھا ہی ہوا نا شادی سے پہلے تیور کھل کر سامنے آ گئے، بس اکیلا لڑکا چاہیے یتیم سے چھوٹا جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو۔"

"ماموں کے لیے مجھے اچھی لگی تھیں وہ محترمہ۔ سیدھی سادی معصوم سی، بہت اچھی لگتی دونوں کی جوڑی۔" زریاب نے جیسے خود کلامی کی۔

"بعض لوگ صرف شکل سے معصوم لگتے ہیں، اندر سے گنوں کے پورے ہوتے ہیں۔" ارم نے منہ بنایا۔

دانیال نے دل ہی دل میں اور زریاب نے با آواز بلند ان سے اختلاف کیا۔

"نہیں امی، "وہ" ویسے بھی سیدھی سادی ہی لگ رہی تھیں۔"

"کیا کہہ سکتے ہیں۔" ارم آپا نے کندھے اچکا دیے۔ انہوں نے اپنی دانست میں اپنے بھائی کے سامنے اپنی صفائی پیش کر دی تھی۔ ان کا دل مطمئن ہو گیا تھا۔ بس ایک زریاب ہی تھا جسے چین نہیں پڑ رہا تھا۔ اس کی حیرت کم ہو رہی تھی نہ ہی افسوس۔

دانیال کا چہرہ پرسکون جھیل تھا، تہہ میں کیا تھا کچھ نہیں معلوم وہ خاموشی سے اپنے موبائل میں مگن تھا۔

"ماموں ...... کیا ہے بھئی، آپ کو افسوس نہیں ہو رہا؟" زریاب نے دانیال کو مخاطب کیا۔

"کیسا افسوس؟" دانیال کی نگاہیں موبائل اسکرین پر ہی تھیں "جو کبھی پایا ہی نہیں اس کے کھونے کا کیا غم؟"

زریاب نے ماموں کا فلسفہ سنا اور اس کا تیز دماغ اپنی ہی فلاسفی جھاڑنے لگا۔

"کسی کو پانا، کیا کوئی بہت مشکل امر ہے؟ کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ جستجو اور جدوجہد ہو تو خزانے بھی مل جاتے ہیں۔

موبائل، فیس بک اور انسٹاگرام کے دور میں

کسی کا سراغ لگانا کوئی راکٹ سائنس نہیں ہے۔

زریاب کو وہ لڑکی یاد تھی اور اس کا نام بھی اس نے سرچ کیا، زرینہ عالم کی آئی۔ڈی مل گئی، اس کی تصویر بھی موجود تھی، ویسے تو اسے گھر بھی معلوم تھا جہاں وہ لوگ رشتے کے لیے گئے تھے۔ ایک ہی علاقہ تھا دونوں کا مگر وہاں تو جانا ممکن نہیں تھا تو پھر اور کیا تھا جو ہوسکتا تھا؟ زریاب کا دماغ ممکنات پر غور کررہا تھا۔ تیزی سے اپنا دماغ دوڑاتے دوڑاتے بالآخر وہ ایک جگہ ٹھہر گیا۔

''بس...... یہ ٹھیک رہے گا۔ بالکل ٹھیک رہے گا۔'' اس نے خود سے کہا اور مسکرادیا۔

☆☆☆

یونی ورسٹی ایک تھی مگر ڈیپارٹمنٹ الگ تھا۔ جہاں جانا مشکل نہ تھا ہاں اس سے اگلا مرحلہ تھا جو کٹھن تھا۔ اس لڑکی سے بات کرنا وہ، جس کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں اور بال کچھ عجیب سے کٹے ہوئے تھے۔ اونچے نیچے سے مگر خیر ہوگا کوئی لڑکیوں کا فیشن۔

زریاب نے اپنا سر جھٹکا۔ بڑی ہمت کرکے وہ یہاں آیا تھا۔ ویسے وہ ڈرتا تو کسی سے نہیں تھا مگر بس عزت خراب ہونے سے ڈر لگتا تھا۔ پھر بھی اپنی تمام تر جرات اکٹھی کرکے چہرے پہ اعتماد سجا کر وہ راستے میں کھڑا ہوگیا۔

''ایکسکیوز می مس۔''

''جی؟'' وہ ٹھہر گئی زریاب کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ شناسائی کے ساتھ ساتھ غصے کے رنگ بھی ابھرے۔

''آپ؟''

''جی، میں زریاب دانیال ماموں کا بھانجا۔ آپ سے بات کرنی تھی۔'' زریاب کے انداز میں اتنی تہذیب، شائستگی اور شرافت تھی کہ خود اسے بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنا باصلاحیت ہے۔

''اب کیا بات کرنی ہے؟ بات تو ساری ختم کردی آپ لوگوں نے۔'' زرینہ کا لہجہ بہت اکھڑ اور سخت تھا۔ مگر زریاب کو اس کے لفظوں نے پتھر مارا تھا۔

''ہم نے؟ ہم نے بات ختم کی تھی؟'' وہ تڑپ ہی گیا۔ مگر اس کے ساتھ جواب دینا نہیں بھولا ''بات آپ کی طرف سے ختم ہوئی تھی۔''

''ہماری؟'' زرینہ نے بے یقینی سے کہتے ہوئے ہاتھ کے انگوٹھے سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ ''یعنی......ہم نے انکار کیا تھا؟'' اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے غصہ چھلک رہا تھا۔

''جی ہاں!''

''جی نہیں۔'' زرینہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں، ''انکار آپ کی طرف سے ہوا تھا اور بہانہ یہ بنایا تھا کہ ہم نے آپ کے ماموں کی اتنی انکوائری کیوں کروائی۔ جس سے آپ لوگوں کی بے عزتی ہوئی۔''

''غلط بیانی مت کریں مس، آپ لوگوں نے یہ کہہ کر انکار کیا تھا کہ میری امی اس گھر میں کیوں رہتی ہیں؟ اپنے گھر کب شفٹ ہوں گی؟''

''بات ایسے نہیں تھی۔ آپ باتوں کو توڑ مروڑ کر بیان کررہے ہیں۔'' اس بار تڑپنے کی باری زرینہ کی تھی۔

''میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔'' زریاب سنجیدہ تھا۔

''میں نے بھی سچ ہی کہا ہے۔'' زرینہ اس سے زیادہ سنجیدہ تھی۔

''اگر آپ بھی سچی ہیں میں بھی سچا ہوں تو پھر جھوٹا کون ہے؟'' زریاب نے سوال اٹھایا۔

''ایک منٹ، میں ابھی معلوم کرتی ہوں۔''

زرینہ کو اس وقت اچانک یہ خیال آیا اور اس نے فوراً ہی اس پر عمل بھی کر ڈالا۔

موبائل آن کرکے لسٹ میں رومانہ آنٹی کا نمبر نکال کر چیک کیا اور اسپیکر آن کردیا۔ بیل جارہی تھی۔ تیسری بیل پر کال ریسیو ہوگئی۔ دوسری طرف رومانہ آنٹی تھیں۔ میچ میکر، جو دانیہ کے لیے اور اب زرینہ

کے لیے بھی رشتے بتاتی تھیں۔
"آنٹی، ایک بات پوچھنی تھی، آپ پلیز بتائیں گی؟" زرینہ کے لہجے میں اتنی تہذیب ،شائستگی اور شرافت تھی کہ زریاب دنگ رہ گیا۔
"یہ بھی میری طرح باصلاحیت ہے۔" اس نے خوشی سے سوچا اور پھر رومانہ آنٹی کی طرف متوجہ ہو گیا جن کی آواز اسپیکر سے نکل کر دونوں کی سماعتوں تک پہنچ رہی تھی۔
"بیٹا! میں کیا بتاؤں، یہ تو تمہاری امی بتا سکتی ہیں یا دانیال کی آپا۔"
"کیا مطلب؟"
"دیکھو زرینہ مائنڈ مت کرنا۔ میں نے تمہاری امی کو دانیہ کے لیے کئی رشتے دکھائے اور ادھر دانیال کی آپا کو بھی بہت لڑکیاں دکھائیں......لیکن مجھے نہیں لگتا کہ یہ دونوں خواتین شادی میں انٹرسٹڈ ہیں۔ اس بار بھی معاملے کو شادی تک لے گئیں مگر معمولی سی باتوں کو بہانہ بنا کر دونوں نے انکار کر دیا۔"
"دونوں نے؟" زرینہ نے آنکھیں پھاڑیں۔
"ہاں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی برائیاں کر کے منع کر دیا تھا۔ اب بھئی میں نے تو توبہ کر لی ہے آئندہ کوئی رشتہ نہیں بتاؤں گی۔ نہ فریال کو، نہ ارم کو۔" رومانہ آنٹی کا لہجہ قطعی تھا۔
"اچھا آنٹی، آپ پلیز امی سے اس کال کا ذکر نہ کیجیے گا۔"
"ٹھیک ہے، نہیں کروں گی، مگر ایک پروپوزل ہے تمہارے لیے، وہ تو بتا دوں۔ نا تمہاری مما کو؟"
"اچھا آنٹی خدا حافظ!" زرینہ نے جلدی سے فون آف کیا۔ اور اپنی پلکیں اٹھائیں۔
"آپ نے ٹھیک کہا تھا۔" زرینہ نے اعتراف کیا۔
"اور آپ نے بھی سچ کہا تھا۔" زریاب نے اقرار کیا۔
"اب؟"
"اب یہ کہ......"

☆☆☆

دانیال اپنی شرٹ استری کر رہا تھا جب زریاب اس کے پاس پہنچا۔
"ماموں۔"
"کہیے، ماموں کی جان!"
"کب تک خود ہی اپنے کپڑے استری کرتے رہیں گے؟"
"پھر کیا کروں؟ کوئی ملازم رکھ لوں؟" کالر کو ایک بار اور چمکاتے ہوئے وہ مسکرایا۔
"ملازم کیوں کوئی بہار سا فرد لائیں زندگی میں"۔
زریاب نے اپنی موبائل اسکرین ان کی نگاہوں کے آگے کی۔
"کیا ہے؟" دانیال نے اچٹتی سی نگاہ اسکرین پر ڈالی اور پھر اپنی نگاہ اور استری دونوں ہی ہٹانا بھول گیا۔
"یہ تو......وہی لڑکی ہے" وہ ہکلا سا گیا۔
"جی ہاں، وہی لڑکی ہے اور بہت اچھی لڑکی ہے، میں چاہتا ہوں آپ کی ان سے شادی ہو جائے۔" زریاب نے بولتے بولتے رک کر استری اٹھائی۔ چند لمحے اور تاخیر ہوتی تو شرٹ جل جاتی۔
دانیال نے خاموشی سے بٹن بند کر کے پلگ نکالا۔
"آپا نے تو منع کر دیا ہے۔" اس نے شرٹ اٹھائی۔
"شادی آپ کو کرنی ہے آپا کو نہیں۔"
"کیسی باتیں کر رہے ہو؟"
"عقل والی، جو آپ کو کبھی نہیں سوجھیں۔"
"زریاب؟ وہ شرٹ لے کر چل دیا۔
"ماموں، جو وقت ضائع ہونا تھا، ہو چکا، اب اپنی زندگی کو مزید ضائع مت کریں۔ اپنے فیصلے خود کریں۔" زریاب اس کے پیچھے پیچھے تھا۔
"دیکھو زریاب!" سمجھانے کے انداز میں

گویا۔
"تمہاری عمر میں جوش، جذبے اور خیالات اسی طرح کے ہوتے ہیں مگر پریکٹیکل لائف میں یہ سب نہیں چلتا، رشتوں کی قدر کر کے انہیں نبھانا ہوتا ہے۔ یوں اپنی مرضی چلا کر اپنے لوگوں کو ناراض نہیں کرتے۔"
اپنی بات مکمل کر کے وہ آگے بڑھا۔
"اور جو رشتے خود غرض ہو جائیں، جو آپ کی قدر نہ کریں جو آپ کو استعمال کر کے آگے بڑھ جائیں۔ وہ......"
"زریاب......خاموش ہو جاؤ۔" وہ ایک لمحے کو رکا اور پھر اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ زریاب سوچ میں پڑ گیا۔

☆☆☆

بہار کے پھول کھل چکے تھے۔ اب کوئی دل اداس ہو یا چہرہ۔ بہار کو اس سے کیا؟
خوشبو مہک رہی تھی۔ رنگ دہک رہے تھے۔ شوخ ہوا اٹھلا کے چلی، دانیہ کی زلفیں پریشان ہو گئیں وہ تھوڑی دیر پہلے نہا کر آئی تھی۔ بال تقریباً سوکھ گئے تھے۔ بس تھوڑی سی نمی باقی تھی۔
دانیہ نے بالوں کو انگلیوں سے سلجھایا، جو پہلے جیسے بہت گھنے لمبے نہیں تھے پھر بھی اچھے تھے۔
"پھپھو، پارلر چلیں؟" زرینہ آ کر دھم سے اس کے برابر میں بیٹھی۔
"کیوں؟"
"آپ کے بالوں کی سیٹنگ کروا دوں؟ اچھا سا ہیئر کٹ؟"
"نہیں بھئی، مجھے اپنے بال ایسے ہی ٹھیک لگتے ہیں۔" دانیہ نے جلدی سے اپنے بال یوں لپیٹے جیسے زرینہ ہاتھ میں قینچی لیے بیٹھی ہو۔
زرینہ نے اپنی سوچتی ہوئی نگاہیں دانیہ پر مرکوز کیں۔
"انکار نہ آپ نے کیا تھا نہ دانیال انکل نے بلکہ......"

"کیا کہہ رہی ہو؟" زرینہ کی غیر متوقع بات پر دانیہ بھونچکی رہ گئی۔ جوڑا لپیٹتے بناتے ہاتھ تھم گئے۔
"اگر وہ دوبارہ اپروچ کریں تو آپ ساتھ دیں گی؟"
"کیا باتیں کر رہی ہو زری، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" دانیہ نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ وہ واقعی کنفیوز ہو گئی تھی۔
"آپ اپنے لیے اسٹینڈ لے سکتی ہیں؟"
"کیسا اسٹینڈ؟"
"گھر والے راضی نہ ہوں تب بھی اپنی مرضی چلانا، جو آپ کا حق ہے۔" زرینہ کی بات پر دانیہ کی آنکھیں پھٹ گئیں۔
"پاگل تو نہیں ہو گئی ہو، فضول باتیں کیوں کر رہی ہو؟" دانیہ سیدھی تھی مگر بے وقوف نہیں۔ اس کی سمجھ میں بات آ گئی تھی اور اس کا ردعمل بہت سخت تھا۔
"اپنی زندگی ضائع مت کریں آپ۔"
زرینہ کی بات ادھوری رہ گئی۔ امی اسے آواز لگا رہی تھیں۔ "جی امی آ رہی ہوں۔" وہ بادل نخواستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹ سے کافی دور، دونوں نے بیٹھنے اور بات کرنے کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ جہاں ان کے کسی کلاس فیلو کا گزر نہ ہو۔
"ماموں نہیں مانے۔" زریاب نے آغاز کیا۔
"پھپھو نے بھی ڈانٹ دیا۔" زرینہ نے منہ لٹکایا۔
کچھ دیر خاموشی کا پردہ درمیان میں حائل رہا۔
"اب کیا ہوگا؟ کیا کرنا چاہیے ہمیں؟" زرینہ نے سوال کیا۔
"میں نے بہت سوچا اور مجھے ایک ہی بات سمجھ آئی۔"
"کیا؟"
"محبت۔"

"محبت؟" زرینہ کی سوالیہ نگاہیں اس پر جمی تھیں۔

"محبت ہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو خواب دیکھنے پر، اپنی زندگی جینے پر مجبور کرتا ہے۔ دونوں کے درمیان ایسی الفت، ایسا کنکشن ہونا چاہیے کہ ایک دوسرے کے بغیر سب کچھ ادھورا لگے خوشیاں بھی اور زندگی بھی۔" زریاب پورا ہوم ورک کر کے آیا تھا۔

زرینہ کو اس کی باتیں سمجھ میں آرہی تھیں مگر سوال یہ تھا کہ یہ کام ہوگا کیسے؟

"محبت کروائی نہیں جاتی خود ہی ہوتی ہے۔" زرینہ نے جتایا۔

"پلاننگ سے دنیا کا ہر کام ہوسکتا ہے۔ یہاں تک کہ محبت بھی۔" زریاب کی مسکراہٹ بڑی پراسرار اور پراعتماد تھی۔ پلان نمبر ایک اس کے پاس ریڈی تھا۔

☆☆☆

زرینہ کا دل چاہ رہا تھا باہر کچھ کھانے کو اور یہ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ زنگر یا پزا، تکہ یا شوارما اس کا فیصلہ باہر جا کر میز پہ بیٹھ کر ہونا تھا۔ اس وقت تو وہ دانیہ کے سر پہ کھڑی شور مچا رہی تھی۔ جلدی کے لیے نہیں بلکہ ڈھنگ سے تیار ہونے کے لیے۔

"لپ اسٹک تو ذرا ڈارک کریں۔"

"ٹھیک تو ہے کیا ہوگیا ہے تمہیں؟" دانیہ نے اپنی چادر لی۔

"کپڑے یہی؟"

"ابھی چینج کیے ہیں۔" دانیہ نے چادر اوڑھی اور زرینہ کو دیکھا۔

"چلیں؟"

"چلیں۔" زرینہ نے کندھے اچکائے۔

اس کا پسندیدہ فوڈ اسپاٹ بہت زیادہ دور نہیں تھا۔ مزے دار خوشبوؤں نے فضا کو مہکایا ہوا تھا۔

سڑک کنارے چلتے ہوئے زرینہ ٹھہر گئی۔ للچائی ہوئی نگاہوں سے دکان کے شوکیس پہ نگاہ کی۔

"ایک منٹ میں چاکلیٹس لے کر آتی ہوں۔"

"افوہ۔" دانیہ وہیں ٹھہر گئی۔

زرینہ یوں گئی اور یوں آگئی۔

"یہ لیں۔" زرینہ نے ایک چاکلیٹ بار، دانیہ کی طرف بڑھائی اور اپنے ہاتھ میں چاکلیٹ کا ریپر کھول کر اسے کھایا اور چلتے چلتے ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں۔

"ہمم......" اس نے ذائقے کا لطف اٹھایا اور آنکھیں کھول دیں۔

اپنے پسندیدہ فوڈ اسپاٹ پہنچ کر دونوں نے کرسی سنبھالی اور بیٹھ گئیں۔

زرینہ اپنا بیگ کھول کر دیکھ رہی تھی۔ اچانک ہی ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکلی۔

"میرا موبائل میرا موبائل کہاں گیا۔ ہائے پھپھو میرا موبائل۔" زرینہ کی شکل ایسی ہوگئی تھی اب روئی کہ تب روئی۔

"دیکھو بیگ میں ہی ہوگا۔ کہاں جائے گا موبائل۔" دانیہ بھی پریشان ہوگئی۔

"نہیں ہے، دیکھیں۔" زرینہ نے بیگ ہی الٹ دیا۔ جس میں دنیا جہان کا سامان تھا سوائے موبائل کے۔

"ایک منٹ ذرا اپنا موبائل دیں۔" زرینہ نے کہا۔

"یہ لو۔"

زرینہ نے دانیہ کے موبائل سے اپنے نمبر پہ کال کی۔ بیل جا رہی تھی۔

"یہ پکڑیں اور کال کرتی رہیں میں شاپ دیکھ کر آتی ہوں۔ جہاں سے چاکلیٹ خریدی تھی۔ مجھے لگ رہا ہے۔ وہیں بھول آئی ہوں۔ اللہ کرے کسی نے اٹھایا نہ ہو۔" زرینہ تیز تیز بولتی ہوئی اٹھی اور یہ جا وہ جا۔

☆☆☆

دانیال راضی نہیں تھا مگر زریاب زبردستی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

"کبھی باہر کی ہوا بھی لگا لیا کریں خود کو۔"

"روز ہی لگاتا ہوں صبح نکلتا ہوں شام میں آتا ہوں۔"

"وہ تو جاب کے لیے نکلتے ہیں۔ کبھی اپنے لیے بھی باہر نکلا کریں۔ یہ لیں یہ شرٹ پہنیے گا۔"

زریاب نے اپنی پسند کی شرٹ دی چیک پرنٹ کی بلو اور براؤن شرٹ، دانیال یہ جچ رہی تھی جو پہننے سے پہلے ہچکچا رہا تھا۔ مگر زریاب اپنی من مانی کرنے میں اور بات منوانے میں ماہر تھا۔ اور اس وقت دونوں باہر سڑک پر تھے۔ ایک شاپ کے آگے زریاب نے بائیک روک دی۔ ذرا دیر میں واپس بھی آ گیا۔

"یہ لیں منہ میٹھا کریں۔" وہ چاکلیٹس خرید کر لایا تھا۔

دانیال نے سوندھی سوندھی مہک والے زیادہ مٹھاس اور ذرا تلخی لیے ذائقے کا لطف اٹھایا۔

اچانک ہی زریاب کی نگاہ نیچے پڑی۔

"ماموں......!" زریاب کی نگاہیں مستقل نیچے ہی تھیں۔

دانیال نے ان نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ وہاں پڑے موبائل کی اسکرین چمک رہی تھی۔ کال آ رہی تھی مگر آواز بند تھی۔

زریاب نے موبائل اٹھایا اسے صاف کیا۔

ایک بار پھر کال آنے لگی نام بھی آ رہا تھا۔

"پھپھو کالنگ۔ اٹینڈ کرو یار، کیا پتا کوئی ڈھونڈ رہا ہو اپنا موبائل یا پھر......"

"کسی لڑکی کا ہوتا تو ضرور اٹینڈ کرتا اب یہ پھپھو، خالہ، آنٹی قسم کی خواتین سے آپ ہی بات کریں۔" زریاب نے کال ریسیو کر کے دانیال کے کان سے موبائل لگایا۔

"ہیلو السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام......آپ کون؟" دانیہ گڑبڑا گئی۔ کہنا کچھ تھا مگر کچھ اور کہہ گئی۔

"محترمہ، یہ موبائل گرا ہوا ملا ہے آپ کا ہے یا آپ کے کسی جاننے والے کا؟" دانیال نے سوال کیا۔

"جی جی یہ میری بھتیجی کا موبائل ہے ابھی ابھی کھویا تھا وہ اسے ڈھونڈ رہی ہے باہر، آپ کہاں ہیں۔"

"ہم اس وقت روڈ پر ہیں۔ سوئٹ اینڈ سوئٹ کے سامنے۔" دانیال نے اتنا ہی کہا تھا کہ زریاب نے اس سے موبائل لے لیا۔ اور اپنے کان سے لگایا۔

"میم، آپ اپنی لوکیشن بتا دیں۔ اگر قریب میں ہے اور آپ مناسب سمجھیں تو موبائل آپ کو پہنچا دیں گے۔" زریاب نے بہت ٹھہرے ٹھہرے شائستہ انداز میں بات کی۔ پھر دوسری طرف کا جواب سنا۔

"ٹھیک او کے جی، ہم ابھی آتے ہیں۔" زریاب نے موبائل جیب میں ڈالا اور بائیک اسٹارٹ کی۔ "چلیں ماموں۔"

"کہاں؟"

"اپنی منزل کی طرف۔"

مطلوبہ مقام بہت قریب ہی تھا۔ بہت آرام سے وہاں پہنچ گئے۔ مگر آگے کے مراحل اتنے آسان نہیں تھے۔ پہلے تو سب ایک دوسرے کو دیکھ کر چونکے تھے۔

دانیہ اور دانیال کی حیرت اصلی تھی جبکہ زرینہ اور زریاب کی حیرانی مصنوعی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ خفگی بھی۔

"موبائل کے لیے بہت شکریہ۔ آج کل آپ جیسے ایمان دار لوگ بہت کم ہیں۔ مگر آپ نے ہماری پھپھو کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"

زرینہ کے شکریے کے ساتھ شکایت بھی جڑی ہوئی تھی۔

"ہم نے؟" زریاب نے بے یقینی سے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا۔

"ہم نے کیا کیا ہے؟ انکار تو آپ کی......"

"زریاب خاموش ہو جاؤ۔" دانیال نے بھانجے کے بازو پہ ہاتھ رکھا۔

"ہم سب اتنا خوش تھے اس رشتے پہ، مگر آپ

کی آپا نے۔" زرینہ نے چیخ کر بولنا شروع کیا۔ دانیہ بوکھلا گئی۔

"زری چپ ہو جاؤ، یہ سب باتیں کرنے کا اب کیا موقع ہے؟"

"ابھی تو یہ لوگ ہاتھ لگے ہیں، ابھی نہیں کہوں گی تو پھر کب کہوں گی؟" زرینہ بولنے سے باز نہ آئی۔ زریاب ڈٹ کر بیٹھ گیا۔

"دیکھیں جی، بات آج کلیئر ہو گی۔ آپ بھی بیٹھ جائیں ماموں!" اس نے دانیال کا ہاتھ پکڑا جو سٹ پٹائے ہوئے تھا اور اس سے زیادہ بری حالت دانیہ کی تھی۔

"زرینہ پلیز جانے دو ان باتوں کو، جو معاملہ ختم ہو گیا ہے اسے ......" دانیہ بھتیجی کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ جو لگاتار بولے چلے جا رہی تھی۔ زریاب بھی برابر جواب دے رہا تھا۔

دانیہ اور دانیال کی نگاہیں پنڈولم کی طرح ان دونوں پر گھوم رہی تھیں۔ جو بحث میں مشغول تھے اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی غیر ارادی طور پر دانیال کی نگاہ دانیہ پر مرکوز ہو گئی وہ تصویر جیسی ہی تھی جو سادگی تصویر میں تھی وہی سراپے سے ظاہر تھی۔

زرینہ اور زریاب خاموش ہو گئے تھے۔ غلطی دونوں طرف سے تھی۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ خود غرضی دونوں طرف سے تھی۔

"اب اٹھو۔" دانیال نے بھانجے کو اٹھانے کی کوشش کی۔ جو بحث کے بعد اب معذرت کر رہا تھا۔ اور جواباً زرینہ بھی حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد خاموش ہو گئی تھی۔ پھر اس نے بے حد خوش اخلاقی سے دانیال کو مخاطب کیا۔

"موبائل کی واپسی کے لیے بہت شکریہ، ورنہ لوگ تو معمولی معمولی چیزوں کے لیے بھی اپنا ایمان خراب کر لیتے ہیں۔"

"ارے نہیں، شکریے کی کیا ضرورت ہے۔" دانیال محجوب سا ہو گیا۔ دانیہ نے نادانستہ اسے دیکھا اور اگلے ہی لمحے نظر ہٹا بھی لی۔ وہ اپنی تصویر سے زیادہ گریس فل تھا۔

دانیال اور زریاب چلے گئے۔ زرینہ دانیال کی تعریفوں کے پل باندھتی رہی۔ دانیہ خاموش رہی۔ خود غرض رشتوں اور لوگوں پہ افسوس ہو رہا تھا۔ مگر اس کے بس میں تھا ہی کیا، یہ عجیب و غریب معاملہ تھا ایک گورکھ دھندا تھا۔

رشتے اور انسان کہیں اتنے سبک جیسے تتلی، اتنے خوب صورت جیسے تتلی کے رنگ، خود سے وابستہ لوگوں کے دامن خوشیوں سے بھر دیں اور کہیں اتنے بھاری جیسے بے آب و گیاہ پہاڑ، ان کے بوجھ تلے انسان پس کر رہ جائے، دب کر مر جائے، مگر آہ نکل سکے نہ اف کر سکے۔

☆☆☆

نوٹس یاد کر کر کے زرینہ کی شکل پہ بارہ بجنے لگے تھے۔

دانیہ پیالہ بھر کے پاپ کارن لے آئی تھی۔ کھانا بن رہا تھا۔ زرینہ بھوک کی کچی تھی اور پڑھائی کے دوران تو اس کا پیٹ اور دماغ دونوں ہی خالی ہو کر دہائیاں دیتے تھے۔

"تھینک یو پھپھو، جگ جگ جئیں، اللہ آپ کو بہت ہی اچھا سا دولہا عطا فرمائے، بالکل دانیال انکل جیسا۔" زرینہ پاپ کارن کا پیالہ دیکھ کر ایسی نہال ہوئی کہ جو منہ میں آیا بولتی ہی چلی گئی۔

"منہ بند کرو اور یہ کھاؤ۔" دانیہ پزل ہو گئی۔

"منہ بند ہو گا تو کھاؤں گی کیسے؟" زرینہ نے سوال اٹھایا۔ پاپ کارن منہ میں ڈالے اور پھر دوسرا سوال دانیہ کے سامنے رکھا۔

"آپ کو دانیال صاحب کیسے لگے؟"

"مم...... مجھے کیا پتا۔" دانیہ گڑبڑا گئی۔

"پتا نہیں تو پتا کریں۔" زرینہ کی لاپرواہی عروج پر تھی۔

"کہاں سے؟"

"اپنے دل سے۔"

"دل کہاں سے آ گیا بیچ میں؟" دانیہ نے

سنبھل کر بھتیجی کو گھورا۔
''کاش کہ آ جائے۔ اس دل کی خاطر تو کوئی صحراؤں میں نکل گیا کوئی جنگلوں میں، کسی نے دودھ کی نہر نکالی تو کسی نے کچے گھڑے پہ دریا پار کیے، جب یہ دل بیچ میں آ جاتا ہے تو کشتیاں کنارے لگ جاتی ہیں۔'' زرمینہ پاپ کارن کھاتے کھاتے ایسی شروع ہوئی کہ فل اسٹاپ کو ما- سب بھول گئی۔
''تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ ایسی بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہی ہو؟''
''بس یونہی۔'' زرمینہ نے کندھے اچکائے اور کھلکھلائی۔ اتنے میں امی آ گئیں۔
''دانیہ! کھانے میں کتنی دیر ہے؟'' بھوک کے مارے برا حال ہو رہا ہے۔'' انہوں نے پیالے سے پاپ کارن اٹھا کر منہ میں ڈالے۔
''جی بس دس منٹ بعد لگا دوں گی۔'' دانیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
''اور ہاں ذرا ماسی کو اپنے ساتھ لگا کر ڈرائنگ روم کی حالت تو درست کروا دینا، پردے اور چینج کر دینا، کچھ مہمان آئیں گے۔'' انہوں نے ہدایات دیں۔
''کوئی خاص مہمان آ رہے ہیں پھپھو کو دیکھنے؟'' زرمینہ چونک اٹھی اور ماں سے سوال کیا۔
''تمہیں دیکھنے آ رہے ہیں۔ ڈھنگ سے تیار ہو جانا۔'' اس کے سوال کا جواب دے کر فریال چل دیں اور زرمینہ سوچ میں ڈوب گئی۔

☆☆☆

برآمدے کے ستون سے لپٹی بیل بڑی خالی خالی ادھوری سی تھی، دانیال گروسری کی چیزیں لے کر آیا تھا جو آپا نے منگوائی تھیں۔ سامان ان کے حوالے کر کے اپنے کمرے میں جا رہا تھا کہ زریاب کے ہتھے چڑھ گیا۔
''چلیں ماموں! رات میں باہر چلتے ہیں۔'' زریاب بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹا تھا۔ دانیال کرسی پہ بیٹھے موبائل آن کرکر
''نہیں بھئی، مجھے تو معاف ہی رکھو، تم جاؤ اپنے دوستوں کے ساتھ انجوائے کرو۔''
''میں آپ کے ساتھ بھی انجوائے کر سکتا ہوں آپ نے خود پہ بڑھاپا کیوں طاری کر رکھا ہے جو ابھی آیا ہی نہیں؟''
''اچھا بھئی، دیکھیں گے کسی روز۔'' دانیال نے ٹالا۔ مگر بھول گیا کہ بھانجے کو ٹالنا ڈون کی گرفتاری کی طرح مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔
''پھپھو کیسی لگیں آپ کو؟'' زریاب کا سوال اچانک ہی تھا۔
''کون پھپھو؟'' دانیال گڑبڑا گیا۔
''اب ان باتوں سے کیا حاصل؟''
''بالکل ٹھیک، باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ عمل ضروری ہے۔ آپ تیار ہو جائیں ایکشن کے لیے۔'' زریاب نے بردباری سے سر ہلایا۔
''اب یہ کیا پہیلی ہے؟'' دانیال نے بھانجے کو دیکھا جو خاصا پراسرار لگ رہا تھا۔
''پہلے میں بوجھ لوں، پھر آپ کو بتاؤں گا۔'' زریاب نے تکیہ کھینچ کر سینے پہ رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ بند آنکھوں کے پیچھے کوئی سپنا ہے یا منصوبہ؟

☆☆☆

یونی ورسٹی کے طول و عرض میں جگہ جگہ طلبہ و طالبات کے جمگھٹے لگے ہوئے تھے۔ ان ہی میں یہ دونوں بھی تھے جو نسبتاً الگ تھلگ جگہ میں پانچ دس منٹ کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔
''بہت مشکل ہے۔'' زریاب نے نفی میں سر ہلایا۔
''کیا؟'' زرمینہ کی سوالیہ نگاہیں اٹھیں۔
''جو ہم سوچ رہے ہیں۔ ماموں اور پھپھو کا ملن۔''
''پھپھو ڈرتی بہت ہیں۔'' زرمینہ نے اعتراف کیا۔

”اور ماموں بڑوں کے لحاظ اور مروت میں گھلے جا رہے ہیں۔“ زریاب نے حقیقت بیان کی۔

”سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟“ زرینہ کے چہرے پہ پریشانی تھی۔

”ہم کتنی ہی کوشش کرلیں مگر زبردستی انہیں اپنے لیے اسٹینڈ لینے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ سوائے اس کے، کہ......“

زریاب کی ادھوری بات پر زرینہ کا چہرہ سوال بن گیا۔

”سوائے اس کے، کہ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو جائے۔“

”محبت؟“ زرینہ بیک وقت چونکی اور گڑبڑائی۔ یہی بات اس نے پہلے بھی کی تھی۔

”وہ کیسے ہوگی؟“ زرینہ اس وقت شاگرد بنی ہوئی تھی اور زریاب استاد۔

”کچھ باتیں ہوں، کچھ ملاقاتیں تو یقیناً دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگیں گے۔“ گرو نے اپنی چیلی کو سمجھایا۔

”محبت اتنی آسانی اور جلدی تو نہیں ہوتی۔“ زرینہ تذبذب میں تھی۔ معترض ہوئی۔

”ہم دونوں مل کر محنت کریں گے تو ضرور ہو جائے گی۔“ زریاب بہت پرامید تھا۔ اس نے زرینہ کو مخاطب کیا۔

”دیکھو، نیکسٹ سنڈے، ایک کام کرو......“

زریاب کی بات ختم ہوئی تو زرینہ ایک گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر ابھری تو وہی سوال۔

”کوئی گڑبڑ نہ ہو؟“

”کچھ نہیں ہوگا۔ بالفرض گڑبڑ ہوئی بھی تو میں سنبھال لوں گا۔“

”آپ؟“ زرینہ کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

”ٹرسٹ می۔“ زریاب سراپا اعتماد تھا اور اعتبار بھی۔ باہر سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ گھر کے اندر زرینہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

”مجھے لگ رہا ہے کہ میں ویٹ گین کر رہی ہوں۔ ہے نا؟“ اس نے پیچھے مڑ کر دانیہ سے تصدیق چاہی۔

”نہیں تو، مجھے تو نہیں لگ رہا۔“ دانیہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”آپ تو روز دیکھتی ہیں نا مجھے، آپ کو پتا نہیں چلے گا۔ جو لوگ زیادہ دنوں بعد دیکھتے ہیں انہیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ بندہ موٹا ہو رہا ہے یا دبلا۔“

زرینہ گھوم کر آئی اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”مجھے روزانہ واک کرنی چاہیے۔“ اس نے اپنا علاج بھی تجویز کرلیا۔

”اچھا۔“ دانیہ نے کندھے اچکائے۔

”پارک چلیں گے شام میں، آپ بھی میرے ساتھ چلیں گی۔“

”میں؟ نہیں بھئی، شام میں کام ہوتے ہیں گھر میں اور یہ کون سا ٹائم ہے واک کرنے کا، صبح میں کرو یا رات میں کھانے کے بعد۔“

”صبح یونی جانا ہوتا ہے۔ رات میں نیند آنے لگتی ہے کھانے کے بعد اور ویسے بھی پیدل چلنا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ صبح ہے، شام ہے یا رات بس آج آپ چل رہی ہیں میرے ساتھ۔“

زرینہ نے فیصلہ سنا دیا اور فیصلے پر عمل درآمد کر بھی لیا، کروا بھی لیا۔

☆☆☆

شام کی ہوا خوش گوار تھی۔ درختوں، پودوں، پھولوں کو چھوتی ہوئی اور بھی زیادہ لطافت اور فرحت لیے ہوئے تھی۔ مختلف پرندوں کی الگ الگ بولیوں نے سماں باندھا ہوا تھا۔ پارک بہت وسیع و عریض تھا۔ بچوں کے لیے جھولے بھی لگے ہوئے تھے۔ شام سے رات گئے تک بچوں سے

لے کر بوڑھوں تک ہر عمر کے افراد آتے تھے۔ ابھی شام کا آغاز تھا۔ آہستہ آہستہ لوگ آنا شروع ہوئے تھے۔

"بھئی میری تو واک ویسے ہی ہو گئی یہاں تک آنے میں۔" دانیہ نے لکڑی کی بینچ پر بیٹھتے ہوئے اعلان کیا۔ یہ ایک پرسکون گوشہ تھا۔ جہاں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ مگر نہیں۔ دور سے دو افراد آتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

"یہ...... یہ تو۔" دانیہ ہکلا سی گئی۔ اس نے پہچان لیا تھا۔ تب ہی چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

ادھر دانیال چلتے چلتے ٹھٹھک گیا تھا۔

"بھانجے...... یہ کیا؟"

"چلتے رہیں ماموں! ایک ضروری بات کرنی ہے۔" زریاب میں بلا کا اطمینان اور ٹھہراؤ تھا۔

"مگر یار......!" ان کی بات اور قدم دونوں اٹک گئے۔

"آپ آگے تو بڑھیں، کب سے اپنی زندگی کو ایک ہی جگہ اٹکایا ہوا ہے۔" زریاب نے ان کا بازو پکڑ کر زبردستی آگے بڑھایا۔

"یہ لڑکا تمہارا پیچھا کر رہا ہے؟" دانیہ نے اپنے حواس قابو کر کے بھتیجی سے سوال کیا۔

"نہیں، وہ والا لڑکا۔" زرینہ نے مسکراتے ہوئے آنکھ سے دانیال کی طرف اشارہ کیا۔

"میرے نہیں آپ کے لیے آیا نہیں لایا گیا ہے۔"

زرینہ کے قسط وار سسپنس سے بھرپور جملے، دانیہ کو چونکا رہے تھے۔ سیدھی تھی مگر بے وقوف اور عقل سے پیدل تو نہیں تھی۔ ابھی وہ مزید سوچتی یا کہتی مگر اتنے میں زریاب، ماموں دانیال کو تقریباً گھسیٹتا ہوا وہاں لے آیا تھا۔

"چلو یہاں سے۔" دانیہ نے زرینہ کا بازو دبوچا۔

"ایک منٹ رکیں، بات تو سن لیں۔"

زرینہ نے پھپھو کا ہاتھ تھپتھپایا اور ماموں دانیال سے حال احوال پوچھنے لگی۔ اگرچہ کنفیوز تو وہ بھی تھی مگر خود کو بہادر اور پر اعتماد ظاہر کرنے میں کامیاب تھی۔

"میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔" زریاب نے کھنکھار کر اپنی تقریر شروع کی۔

"پیارے ماموں اور مس زرینہ کی محترم پھپھو صاحبہ آپ دونوں ہم دونوں کے خلوص اور محبت پہ شک نہ کریں۔ ہم صدق دل سے چاہتے ہیں کہ آپ دونوں زندگی سے اپنے لیے خوشیاں کشید کریں۔ رشتوں کا مان رکھیں مگر اپنے لیے بھی کچھ سوچیں۔ خود کو اہمیت دیں۔ یوں ضائع نہ کریں اپنے آپ کو اپنے وقت کو۔ اپنی زندگی کو اور اپنے دل کو۔" زریاب نے سانس لی۔

"یہاں بیٹھ کر، دس منٹ ایک دوسرے سے بات کریں۔ ہم یہیں سامنے ہی ہوں گے۔ اتنے قریب کہ آپ کو دیکھ سکیں اور اتنے دور کہ آپ کو سن نہ سکیں۔"

دانیال اور دانیہ دونوں دم بخود، گویا سانس روکے زریاب کو سن رہے تھے۔ جو اپنی بات مکمل کر کے سامنے درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گیا تھا۔ زرینہ اس کی مخالف سمت ذرا دور ایک منڈیر پر بیٹھی تھی۔

دانیہ کا دل اپنی پوری رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے بینچ پر بیٹھے بیٹھے وہ ایک سنگی مجسمے میں تبدیل ہو گئی ہے۔ بے حس و حرکت مگر جس میں ایک دھڑکن زندہ تھی۔

دانیال نے ایک گہری سانس لے کر اپنے حواس قابو کیے۔ اپنے دونوں ہاتھ پشت پہ باندھ لیے۔ ایسا عجیب موقع زندگی میں کبھی نہیں آیا تھا۔ وہ کوئی دبو یا گھامڑ قسم کا انسان نہیں تھا کہ صنف مخالف سے بات نہ کر سکے ــــ مگر اس طرح کے حالات میں اور اس حالت میں بات کرنا بہت ہی مشکل لگ رہا تھا۔

کیا کہا جائے؟ کیسے کہا جائے، کیونکر کہا جائے۔ دو چار منٹ اسی سوچ بچار اور ادھیڑ بن میں گزر گئے۔ بالآخر دانیال نے بولنا شروع کیا۔

''میں...... آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ اس آکورڈ سچویشن کے لیے، دراصل یہ میرا بھانجا اور آپ کی بھتیجی، آج کی نوجوان نسل، معاملات دیکھنے اور سوچنے کا ان کا انداز، ہم سے بہت مختلف ہے۔''

بولتے ہوئے دانیال مدھم سا مسکرایا۔ اس کی نگاہیں نیچے گھاس پر تھیں۔ اس نے نہیں دیکھا کہ بینچ پر بیٹھے ساکت وجود کی پلکیں اٹھیں اور اس کی مدھم مسکراہٹ سے ٹکرائیں۔

''ان کی عمر میں بہت کچھ بہت آسان لگتا ہے۔ چاند کو ہتھیلیوں میں سمیٹ لینا اور...... اور۔'' دانیال اٹک گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آگے کیا کہے۔ دانیہ نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

''ہاں، ان کی عمر میں یہ سب آسان لگتا ہے۔ چاند کو ہتھیلیوں میں قید کر لینا، خوشبو کو آنچل میں باندھ لینا، ہوا کے سنگ سفر کر کے آسمان چھو لینا۔ مگر......'' دانیہ کی پلکیں پھر اٹھیں۔

''یہ لوگ معصوم ہیں اور بے غرض بھی۔''

''ہاں بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔'' دانیال کی نگاہیں پہلی بار ان پلکوں سے الجھیں، ان سادہ و معصوم آنکھوں میں اجنبیت اور خوف کم ہو چلے تھے۔ دانیال کو حوصلہ ہوا اور شوق بھی مزید بات کرنے کا۔

''آپ یہاں اکثر آتی ہیں؟''

''نہیں، بس کبھی کبھار۔''

''میں بھی...... کبھی کبھار آ جاتا ہوں یہاں، جب لوگوں کے درمیان تنہا رہنے کا جی چاہتا ہے تو......'' دانیال کی آواز دھیمی ہوئی۔

''آپ میری وجہ سے کھڑے ہوئے ہیں۔ اچھا نہیں لگ رہا۔'' دانیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سادہ سا لہجہ، سادہ سے الفاظ، مگر کبھی سادگی میں بھی کیسی جادوگری ہوتی ہے۔

دانیال گھبرا کر پلٹ گیا۔

کہیں وہ مسحور نہ ہو جائے اسیر نہ ہو جائے۔ دانیال کو یکا یک ہی خوف محسوس ہوا۔ وہ زریاب کے قریب پہنچ گیا ادھر زرمینہ دانیہ کے پاس چلی گئی۔ وہ مسکرا رہی تھی اور دانیہ سنجیدہ تھی۔

''زری! آئندہ یہ حرکت مت کرنا۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اب دوسری کوئی حرکت کریں گے۔'' زرمینہ اس کی سنجیدگی کو ذرا بھی خاطر میں نہیں لائی۔

''سیریس ہو جاؤ۔ تم بچی نہیں ہو، گھر میں بھائی بھابھی کو بھنک بھی پڑ گئی اس معاملے کی تو کیا ہوگا؟ میری کیا عزت رہ جائے گی ان دونوں کی نظروں میں۔'' بھتیجی کے ہمراہ چلتے ہوئے دانیہ بولتی جا رہی تھی۔

''آپ کو کیسے لگے؟ دانیال ماموں!'' زریاب کی طرح وہ بھی دانیال کو ماموں کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔

زرمینہ کا سوال سن کر دانیہ کے چہرے پہ ایک رنگ آیا اور گزر گیا۔ زندگی کے پہلے امتحان کیا کم تھے۔ جو ایک اور امتحان میں ڈال دیا۔ وہ خاموش رہی۔ خاموشی میں عافیت ہے۔ دل کی ہر بات زبان پہ آ جائے تو......'' سوچتے سوچتے دانیہ ڈر سی گئی۔

''بتائیں نا پھپھو!'' زرمینہ نے اصرار کیا۔

''اچھے انسان، اچھے ہی لگتے ہیں۔'' دانیہ نے اپنے انداز کو بے حد عام اور نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

''شکر ہے۔ آپ کو اچھے لگے وہ۔'' زرمینہ نے اطمینان کی گہری سانس لی مگر دانیہ کی بے قراری شروع ہو چکی تھی۔

☆☆☆

دانیال آج پھر اپنی کھٹارا کو گھسیٹتے ہوئے لایا تھا۔ مکینک کو سونپ کر گھر واپس آیا تو آپا بے چینی

سے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔
"شکر ہے دانیال! تم آ گئے کہاں تھے۔ اتنی دیر لگا دی۔ کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔" دانیال کو دیکھتے ہی آپا نان اسٹاپ شروع ہو گئیں۔
"گاڑی آج پھر خراب ہو گئی تھی۔ مکینک کو دے کر آ رہا ہوں۔"
دانیال بہت تھکا ہوا تھا۔ اس کی شکل بتا رہی تھی۔ مگر آپا اپنے بھائی کو غور سے دیکھنے کی عادی ہی نہیں تھیں۔ اس وقت بھی انہیں اپنے کام کی فکر ہو رہی تھی۔ جس کے لیے وہ بے چینی سے دانیال کا انتظار کر رہی تھیں۔ درزی سے اپنا جوڑا منگوانا تھا۔ رات میں پہن کر جانا تھا۔ میاں جی کے گہرے دوست نے اپنے بچے کی سالگرہ میں بلایا تھا۔ دانیال کو اپنا مسئلہ بتاتے ہوئے ان کا انداز ہنچی تھا۔ نہ بھی ہوتا تو وہ کون سا انکار کرنے والا تھا۔
سوٹ لینے جا رہا تھا کہ زریاب آ گیا۔ اپنے ساتھ بائیک پہ بٹھا کر لے گیا۔ جاتے ہوئے اور آتے ہوئے تمام راستے ماموں کو لیکچر دیتا رہا گھر آ کر بھی اس کی تقریر ختم نہیں ہوئی تھی۔ جس کا موضوع یہی تھا کہ اب وہ اپنی پرواہ کرنا شروع کر دے۔ اپنے بارے میں، اپنی خوشیوں کے بارے میں سوچے۔
دانیال کمرے میں گیا، نہایا، لباس تبدیل کیا تب تک بھی زریاب کا لیکچر جاری تھا وہ بیڈ پر چڑھ کر بیٹھا ہوا تھا۔
"بس کر دے یار! تو تھکتا نہیں ہے؟"
دانیال بالوں میں کنگھا کر رہا تھا۔
"آپ کی شادی تک سکون سے نہیں بیٹھوں گا۔" زریاب نے اپنے ہدف کا تعین کیا۔
دانیال خاموشی سے بال سنوارتا رہا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔
"بے شک آپ کچھ نہ کہیں، مگر آپ کی آنکھوں میں لکھا ہے۔ بلکہ شکل پہ بھی بڑا بڑا لکھا ہوا ہے۔" زریاب پھر شروع ہو گیا۔
"کیا؟"
"وہ محترمہ اچھی لگی ہیں آپ کو۔"
"تو؟ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"
"بہت فرق پڑتا ہے۔ پسند کا نتیجہ محبت ہے اور محبت کا نتیجہ شادی۔ اپنے معاملات کو نتیجہ تک پہنچائیے۔"
"قسمت کو منظور ہوا تو پہنچا دے گی انجام تک۔" دانیال نے پہلو بچا کر قسمت پہ معاملے کو ڈال دیا۔
"پہلے آپ تو منظوری دیں۔ دل و جان سے قسمت بھی منظور کر لے گی۔"
"بھوک لگ رہی ہے یار، آپا سے پوچھوں، کھانا تیار ہے یا نہیں۔"
دانیال بولتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ زریاب بڑے اطمینان سے وہیں لیٹا تھا۔
"بھوک تو مجھے بھی لگی ہے مگر ماموں کا ولیمہ کھا کر ہی یہ بھوک مٹے گی۔"

☆☆☆

دیوار کے سہارے اوپر چڑھتی بیل میں دانیہ نے دھاگہ باندھا اور اوپر کیل میں لپیٹ دیا۔ وہاں سے سیدھا لے جا کر دوسرے رخ پہ لگی کیل میں دھاگہ باندھا۔
"اسٹول پہ چڑھی کیا کر رہی ہیں؟" زرینہ نے اتنی اچانک اور زور سے آواز بلند کی کہ وہ ڈگمگا گئی۔ اسٹول سے گرتے گرتے بچی۔
"توبہ ہے زری آہستہ نہیں بول سکتیں۔ ڈرا دیا مجھے۔ ابھی گر جاتی۔" اپنے دھڑ دھڑاتے دل کو قابو کرتے ہوئے دانیہ اسٹول سے نیچے اتر آئی۔
"جلدی سے ریڈی ہو جائیں۔ کل کہا بھی تھا میں نے، آج بازار جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے، فٹافٹ نکلنا ہے۔" زرینہ کو بہت جلدی تھی، دانیہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔
"ذرا سانس تو لے لو، اور مجھے بھی لینے دو۔"

''باہر چل کے لے لیں گے سانس۔ ابھی تو نکلیں۔''

دونوں باہر نکلیں۔ رکشہ فوراً ہی مل گیا۔

''کیا خریدنا ہے جو اتنی ایمرجنسی میں مجھے لے آئیں۔ کھانا بنانا ہے، دیر نہ لگانا۔'' دانیہ کو گھر کے کاموں کی ہمیشہ ہی فکر رہتی تھی۔ اس کی ذمہ داری جو تھی۔

''پہلی بات تو یہ کہ ایمرجنسی میں نہیں لائی آپ کو، کل میں نے بتا دیا تھا کہ آج بازار جائیں گے۔ میری سب سے اچھی سہیلی کی برتھ ڈے ہے۔ اس کے لیے گفٹ لینا ہے اور دوسری بات یہ کہ گھر کے کاموں کو اپنے سر پہ سوار مت کیا کریں۔ امی ہیں گھر پر، وہ دیکھ لیں گی۔''

زرینہ کا مدلل اور مفصل جواب بھی دانیہ کو مطمئن نہیں کر سکا تھا۔ مگر ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی۔ زرینہ کے آگے بولنا یا اسے قائل کرنا، دونوں ہی ناممکنات میں سے تھے۔

زرینہ اسے ایک مال میں لے آئی تھی۔ اور اب سوٹ دیکھ رہی تھی۔

''سوٹ دو گی تحفے میں؟'' دانیہ کو حیرت ہوئی۔

''نہیں دے سکتی کیا؟'' زرینہ نے الٹا سوال کیا۔

''ہاں...... مگر۔'' آگے کچھ کہنے سے پہلے ہی زرینہ نے بات کاٹ دی۔

''یہ دیکھیں، کیسا لگ رہا ہے۔ چلیں گفٹ آپ کی پسند سے لے لیتی ہوں۔ جلدی سے بتائیں، کون سا اچھا لگ رہا ہے یہ؟ یا یہ یا پھر یہ والا؟''

''یہ لے لو۔'' دانیہ نے فٹافٹ فیصلہ کر دیا۔ یہ لڑکی تو پاگل تھی۔ گھنٹوں مارکیٹ میں پھر سکتی تھی۔ مگر دانیہ کو تو گھر کے کام کی فکر ہو رہی تھی۔

''چلیں؟'' خریداری مکمل ہوئی تو دانیہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ایسے ہی چل دیں بغیر کچھ کھائے پیے؟ آئیے آپ کو گول گپے کھلاؤں یا کچھ اور؟'' زرینہ فوڈ کورٹ کی جانب بڑھ گئی۔

دونوں کرسیاں سنبھال کر بیٹھی ہی تھیں کہ زریاب کی شکل نظر آئی اور ساتھ میں وہی۔

دانیہ ساکت رہ گئی۔ اصولاً تو زرینہ پر غصہ آنا چاہیے تھا مگر نہیں آیا۔

''سالگرہ مبارک ہو۔'' زریاب نے آہستہ سے اسے وش کیا اور ہاتھ میں پکڑا ڈبہ میز پہ رکھ کر اسے کھولنے لگا۔ وہ ایک چھوٹا سا کیک تھا۔

''ہیپی برتھ ڈے میری بہت ہی پیاری پیاری پھپھو! اور سب سے پیاری سہیلی اور دنیا کی سب سے اچھی ہستی کے لیے، میری طرف سے بہت سارا پیار، اور یہ گفٹ۔''

زرینہ نے لہک لہک کر اسے وش کیا اور وہی جوڑا دیا جو ابھی کچھ دیر پہلے خریدا تھا۔

دانیہ کی خوشی حیرت میں لپٹی ہوئی تھی۔ اسے یاد نہیں تھا۔ آج کیا تاریخ ہے۔ اپنی خوشیوں کے دن یاد رکھنا بھول ہی گئی تھی۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ اور یہ نمی آنسوؤں میں بدل رہی تھی۔ وہی آنسو جو کبھی خوشی کے مارے آنکھوں میں آ جاتے ہیں۔

''تھینکس!'' اس نے خود پر اور اپنی آنکھوں کی نمی پہ قابو پایا۔

''محبتوں کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔'' زریاب نے اپنا گیان دیا۔

''بس تحفے کی طرح وصول کرتے ہیں۔ نعمت کی طرح قدر کرتے ہیں اور رحمت کی طرح شکر کرتے ہیں۔''

زرینہ نے اس سے کیک کٹوایا۔ کھایا اور کھلایا۔ اور پھر کچھ دیر کے لیے وہ اور زریاب وہاں سے غائب ہو گئے۔

دانیہ اور دانیال ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ یہ عجیب لمحہ تھا اور عجیب معاملہ تھا۔ جو

دونوں کو اچھا بھی لگ رہا تھا مگر اندر ہی اندر عجیب شرمندگی بھی ہو رہی تھی جیسے اپنے بڑوں کی توقعات پر پورا نہ اترنے پر ہوتی ہے۔

"زریاب بہت ضدی ہے۔ اپنی بات منوا کر ہی چھوڑتا ہے اور اس نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ......" دانیال نے اپنی صفائی پیش کی۔

"زرینہ بھی ایسی ہی ہے۔" دانیہ دھیرے سے مسکرائی۔

دو افراد ان دونوں کی خوشی کے لیے جتن کر رہے تھے۔ ایسے انسانوں پہ غصہ نہیں آنا چاہیے۔ اور ان دو معصوم جانوں کو تو ان لوگوں پر بھی غصہ نہیں آتا تھا جو ان کی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ بھاری پتھر بن کر اٹک گئے تھے۔

"زرینہ ابھی تک بچوں والی حرکتیں کرتی ہے۔ گھر میں اور زندگی میں بھی اسی سے رونق ہے۔" دانیہ کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ دانیال نے اس چمک کو اپنے دل میں محفوظ کیا اور مسکرایا۔

"بچہ ہونا بہتر ہے۔ بچے معصوم ہوتے ہیں۔ چالاکی اور خود غرضی نہیں دکھاتے، ان کے دل صاف ہوتے ہیں۔"

"مگر ہماری قسمتوں کے فیصلے بچے نہیں کرتے، بڑے کرتے ہیں۔"

دانیہ نے بے ساختہ کہا اور پھر یک دم خاموش ہو گئی۔ چور سی بن گئی۔ کیا ضروری تھا یہ کہنا؟ دانیہ کے چہرے پہ خجالت پھیل گئی۔

دانیال حیران تھا۔ وہ بھی تو یہی کہنے والا تھا کیسا عجیب اتفاق تھا۔ دونوں کے ذہنوں میں یا دلوں میں ایک ہی بات آئی۔

اجنبیت کی دھند کافی حد تک چھٹ چکی تھی۔ مگر ایک خاموشی اور گریز تھا جو درمیان تھا۔

"اس راہ کا اختتام کہاں ہے؟" دانیال بے چین ہوا، دانیہ مضطرب ہوئی۔

یہ ملاقات، ملاقات نہ تھی۔ ایک آغاز تھا جو انجام تک پہنچنے کا شوق رکھتا تھا۔

ایک بات تھی جو ان کہی باتوں کے درمیان کہیں موجود تھی۔ تمام تر وضاحت اور یقین کے ساتھ۔

دونوں گھر واپس آ گئے تھے مگر اپنی ذات، اپنے وجود کا ایک حصہ کہیں کھو بیٹھے تھے یا چھوڑ آئے تھے۔ شاید ایک دوسرے کے پاس۔

☆☆☆

دیوار کے سہارے اوپر چڑھنے والی بیل میں دھیرے دھیرے پھول آ رہے تھے۔ خوش رنگ، خوش ادا، خوشبودار اور خوش گوار۔

کچن میں ہنڈیا بھونتی دانیہ نے کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالی اس ہری بھری بیل پر، ابھی پھول آنا شروع ہوئے تھے مگر شروعات بھی کتنی معنی خیز اور دل خوش کن ہوتی ہے۔

دانیہ نے نچلا لب دانتوں میں دبایا۔ مسالے میں پانی ڈالتے ہوئے کچھ یاد آیا تھا اسے۔

دو نگاہیں جو اپنا شوق چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اور اگر یہ شوق ظاہر ہو جائے تو؟

دانیہ کے دل میں تمنا جاگی، دل انوکھے انداز میں دھڑکا۔ خواب دیکھنے میں پھر یہ بڑی مصیبت ہے کہ تعبیر کا انتظار بھی دامن پکڑ لیتا ہے۔

ہنڈیا کا پانی خشک ہو کر مسالہ لگ رہا تھا۔ دانیہ کو احساس بھی نہیں ہوا۔ وہ کسی اور دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔ مگر مسالہ لگنے کی بو سے فریال بھابھی وہاں پہنچ گئی تھیں۔

"کیا کر رہی ہو تم، پانی ڈالو ہنڈیا میں۔ سارا مسالہ لگ گیا۔"

فریال بھابھی کی آواز پہ دانیہ ہڑبڑا گئی۔ جلدی سے ہنڈیا میں پانی ڈالا۔

"خیریت تو ہے؟ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟" بھابھی عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"جج...... جی۔" وہ جلدی سے وہاں سے ہٹ گئی۔

☆☆☆

ارم آپا موبائل پر مصروف تھیں۔ زریاب نے ان پہ نگاہ ڈالی اور پھر نعرۂ مستانہ لگایا۔

"ماں! کھانے میں کیا ہے؟"

وہ ہڑبڑا گئیں۔ موبائل ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔

"توبہ ہے زریاب، کیا آندھی طوفان کی طرح نازل ہو جاتے ہو۔" اپنی سہیلی کو خدا حافظ کہہ کر وہ سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"آندھی طوفان تو ابھی آئے گا۔ بجلیاں بھی کڑکیں گی۔" زریاب نے پیشن گوئی کی۔

"کیا بدفالیں منہ سے نکال رہے ہو۔ کوئی اچھی بات کرو۔" ارم نے ناگواری سے بیٹے کو گھورا۔

"اچھی اچھی باتیں یہ ہیں کہ...... یا تو ماموں کا ولیمہ کریں یا ولیمے کی تیاری۔"

"ہاں، کیوں نہیں، اللہ وہ وقت دکھائے، ضرور ولیمہ کریں گے۔" انہوں نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

"اللہ وہ وقت دکھانے والا ہے۔ آپ تیاری کرلیں۔" زریاب بہت پراسرار ہو رہا تھا۔

"پتا نہیں یہ لڑکا کیا اول فول بکتا رہتا ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"چکن بنائی ہے۔ ماموں سے بولو، روٹیاں لے آئیں تندور سے۔"

"لائیں، پیسے دیں میں لے آتا ہوں روٹیاں۔" زریاب نے آفر کی۔

"دانیال لے آئے گا۔ تم جا کر کہہ دو اس سے۔"

"کہاں سے لائیں گے؟ انہوں نے خود مجھ سے پیسے ادھار لیے ہیں۔"

"تم سے؟" وہ چونکیں۔

"جی، مجھ گنہگار سے، لائیے پانچ سو کا نوٹ۔" اس نے ہاتھ پھیلایا۔ اور پھر ماں سے رقم لے کر ہی ٹلا۔

روٹیاں لینے گیا اور ساتھ میں دانیال کو اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔ آج کل وہ دانیال کا ہمزاد بنا ہوا تھا۔

"پتا نہیں کن چکروں میں رہتا ہے۔" ارم آپا نے سر جھٹکا۔

باہر نکل کر زریاب آزاد تھا۔ تندور سے پہلے فالودے کے اسٹال پہ رک گیا۔

"یار! روٹیاں لینی ہیں۔" دانیال نے یاد دلایا۔

"یہ کھا کر چلتے ہیں۔" زریاب دو گلاس کا آرڈر دے بھی چکا تھا۔

دانیال کو آتے جاتے لوگوں میں ایک مانوس سی جھلک دکھلائی دی۔

"یہ وہی ہے یا اس جیسی لگ رہی ہے؟" وہ شش وپنج میں تھا مگر کچھ قریب آ کر شکل واضح ہوئی تو دانیال کی غلط فہمی دور ہوگئی۔

عجیب بات ہوگئی تھی۔ راہ چلتے لوگوں پر بھی اب اس کا گمان ہو رہا تھا۔ دانیال نے سر جھٹکا اور اپنی توجہ فالودے پر مرکوز کرنا چاہی۔ مگر سر جھٹکنے سے دل میں اٹکی بات نہیں نکل جاتی۔ لاکھ اپنی تمام تر توجہ کسی اور طرف کر لو مگر دھیان کی ساری کھڑکیاں اسی ایک طرف کھل رہی تھیں۔

اچانک بچوں کی ہنسی اور آوازیں اطراف میں پھیل گئیں۔ ان کے برابر والی ٹیبل پر ایک فیملی آ کر بیٹھی تھی۔ میاں بیوی اور دو چھوٹے بچے، انتہائی چلبلے، والدین انہیں کرسیوں پر بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

دانیال دلچسپی سے بچوں کو دیکھنے لگا۔ جو بہت کیوٹ تھے۔

اس کے دل میں ایک اور نیا جذبہ جاگا۔

انسان اپنے فطری تقاضوں اور جذبات کو کتنا ہی تھپک تھپک کر سلا دے مگر ہمیشہ تو ان سے جنگ نہیں کر سکتا۔ بچوں کو دیکھتے ہوئے حسرت کا ایک

سایہ چہرے پہ آیا اور گزر گیا دانیال کے سارے دوستوں کی شادیوں کو کئی کئی برس گزر گئے تھے۔ بعض کے بچے تو سیکنڈری اسکول میں پڑھ رہے تھے۔

قریبی رشتوں کی خود غرضی اور لاپروائی، کتنی قیمتی زندگی ذات اور وقت میں دیمک لگا کر انہیں برباد کر دیتی ہے۔

سوچتے تو وہ پہلے بھی تھے مگر اب غور کرنے لگے تھے۔

رشتوں کا بھرم، لوگوں کا مان رکھتے رکھتے اب تھکن کا احساس ہونے لگا تھا۔ دل دکھنے لگا تھا کیونکہ وہ خواب دیکھ رہا تھا اور حقیقت خوابوں سے متصادم ہو تو چبھن ہوتی ہے۔ تکلیف ہوتی ہے۔

اس معاشرے میں چھوٹے بہن بھائیوں کا، بڑے بہن بھائیوں کا دست نگر رہنا اکثر ایک المیہ بن جاتا ہے۔ ہر جگہ محبت، اعلاظرفی اور خیال نہیں ہوتے، کہیں خود غرضی اور بے حسی بھی ہوتی ہے۔

اپنے خیالوں میں مگن وہ فالودہ کھانا تو بھول ہی گیا تھا۔ تب ہی ذریاب نے اسے ٹہوکا دیا۔

"سارا فالودہ پانی بن گیا ہے ماموں، کھانے کے لائق تو رہا نہیں، جلدی سے پی لیں۔"

ماموں کو مشورہ دے کر بھانجے نے بڑی فرصت اور غور سے انہیں دیکھا۔ "ویسے کہاں گم تھے؟"

"کہیں نہیں۔" ماموں نے فالودہ ختم کر کے گلاس میز پہ رکھا۔

"اپنا موبائل چیک کر لیجیے گا، ایک نمبر فارورڈ کیا ہے آپ کو۔"

"کس کا نمبر......؟" وہ چونکے۔

"لکی نمبر، جس کی ضرورت ہے آپ کو۔"

زریاب اٹھ کر فالودے کی ادائیگی کر رہا تھا۔ دانیال کے چہرے پہ اور دل میں کیا تھا۔ وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

☆☆☆

زرمینہ کے بے حد اصرار پہ دانیہ نے اس کا دیا ہوا جوڑا پہنا، کانوں میں اسٹائلش سی بالیاں، ہلکا پھلکا میک اپ بالوں میں زرمینہ نے بلو ڈرائی کیا تھا۔ اب اسے لے کر آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔

"دیکھا، کتنی خوب صورت ہیں آپ؟"

کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ خوب صورتی جسے سراہنے والا کوئی نہیں تھا، اپنی آنکھوں میں، دل میں جذب کرنے والا کوئی نہیں تھا اور پھر یہ حسن اور جوانی چڑھتا ہوا سورج نہیں تھی۔ دوپہر ہو چکی تھی۔

دانیہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ آج کل احساس زیاں شدت سے محسوس ہونے لگا تھا۔

زرمینہ اس کی اور اپنی سیلفی لے رہی تھی۔ پھر دانیہ کی تصویریں لینے لگی۔

"پوسٹ نہیں کرنا۔" دانیہ نے تاکید کی۔

"نہیں نہیں کر رہی پوسٹ، صرف اپنی سہیلیوں کو دکھاؤں گی۔" زرمینہ اب اپنی سیلفیز لے رہی تھی۔

دانیہ کو ہمیشہ ہی حیرت ہوتی تھی۔

"تم تھکتی نہیں ہو؟ درجنوں سیلفیز لے لے کر؟"

"نہ......کیمرہ بھلے ہی تھک جاتا ہو، بور ہو جاتا ہو مگر ہم نہ تھکتے ہیں نہ بور ہوتے ہیں۔"

زرمینہ نے اتنے مزے سے جواب دیا کہ دانیہ کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ ہنستے ہنستے وہ اپنے بال لپیٹنے لگی۔

"کیا کر رہی ہیں؟ میری محنت تو برباد نہ کریں۔" زرمینہ چیخی۔

"بس ہو گیا نا تمہارا شوق پورا، اب مجھے کچن میں جانا ہے۔ آٹا گوندھنا ہے، روٹی پکانی ہے۔ اور......"

"آج روٹی پکانے کی چھٹی کریں، میں پاپا کو میسج کر دوں گی۔ آتے ہوئے تندور کی روٹیاں اور چپاتیاں لے آئیں گے۔"

"رہنے دو، میں پکالوں گی، یہ تو روز کا کام ہے۔"

"روز کا کام ہے نا، تو کبھی خود کو اس کام سے چھٹی بھی دے دیا کریں، کبھی کبھار، کوئی دن، کوئی وقت اپنی مرضی سے بھی گزار لیا کریں۔ گھر کے کام تو کبھی ختم ہوتے ہی نہیں ہیں۔" زرینہ نے لیکچر جھاڑ دیا۔ دانیہ چپکی ہو رہی۔ زرینہ کی بات بھی شاید ٹھیک ہی تھی کچھ باتوں کا احساس اب ہونے لگا تھا۔ دل و دماغ بدل رہے تھے اور جب دل و دماغ بدلنے لگیں تو زندگی بھی بدلنے لگتی ہے اور شاید تبدیلی واقعی آ گئی تھی۔ پہلی بار دانیال کی کال آئی تو اسے برا نہیں لگا۔ اگرچہ وہ ہچکچائی تھی بات کرنے میں۔

دوسری بار کال آئی تو اسے اچھا لگا۔ دونوں بار مختصری باتیں تھیں۔ رسمی سا حال احوال دریافت کرنا۔ مگر اتنی گھٹن میں یہ بھی ایک روزن تھا، تازہ ہوا کے جھونکے کا۔

دانیہ بدل رہی تھی اور اس کا دل بھی

☆☆☆

جھجک اور اجنبیت کے سائے گھٹتے جا رہے تھے۔ پہلی بار دونوں نے بات کی تو دانیہ کا دل کتنی دیر تک تیز دھڑکتا رہا۔ حالانکہ ایسی کوئی باتیں تو کی بھی نہیں تھیں جو دل دھڑکا دیں۔ بس دانیال نے اپنے بارے میں بتایا۔ اپنی جاب، روٹین، کچھ پسند، ناپسند، دانیہ سنتی رہی، مگر خود بہت کم بولی۔

اگلی بار دانیال نے اسی بات کا شکوہ کیا۔

"آپ بھی تو اپنے بارے میں کچھ بتایئے۔"

"میں......؟ کیا بتاؤں؟" دانیہ سوچ میں پڑ گئی۔

"کچھ بھی؟" دانیال نے چند لمحے توقف کیا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔

"آپ کو کیا اچھا لگتا ہے؟" دانیال نے پھر سوال کیا۔

"مجھے......زرینہ بہت اچھی لگتی ہے۔ بہت پیاری، وہ میرا دل، میری جان ہے۔" دانیہ نے ایک جذب کے عالم میں کہا تھا۔ اس کے لہجے سے، ایک ایک لفظ سے زرینہ کے لیے محبت چھلک رہی تھی۔

"اگر یہ دونوں نہ ہوتے تو میں زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے محروم رہتا۔" دانیال نے دل میں اعتراف کیا۔

"میں بھی۔" دانیہ نے بھی دل ہی دل میں کہا۔

"تو زرینہ ہے آپ کی جان اور دل؟" دوسری جانب دانیال مسکرایا تھا۔

"جی ......!" دانیہ جانے کیوں پزل سی ہو گئی۔ بے ساختہ بولے گئے الفاظ کا مفہوم اب واضح ہو رہا تھا۔

"اگر کوئی اور زرینہ کی جگہ لینا چاہے تو؟" دانیال کو خود بھی اپنی جرات پہ حیرت ہوئی تھی۔

"پتا نہیں۔" وہ بڑی مشکل سے بولی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے خدا حافظ کہہ کر کال کاٹ دی۔

دانیہ کے اندر ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

یہ وہ چہرہ نہیں تھا جو وہ روزانہ دیکھتی تھی۔ آج اس کا چہرہ کچھ اور ہی تھا۔ ایسے انوکھے رنگ، ایسی نچلی دھنک، اسے اپنا چہرہ اپنا آپ نیا لگ رہا تھا۔ یکا یک اسے کچھ خیال آیا۔

وہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کا دل چاہا، کھلے آسمان کے نیچے کھڑی ہو جائے۔ وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھی۔

چھت پہ منڈیر کے کنارے کھڑے ہو کر اس کی نگاہیں وسیع افق پر جمی ہوئی تھیں۔ کئی بار کا دیکھا ہوا منظر نیا نیا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ یہ آسمان، اس کی نیلاہٹ اس کی وسعت، ایک لمحے کو اس نے آنکھیں بند کیں اور مسکرا دی۔ زندگی اتنی محبوس اور گھٹن زدہ نہیں تھی۔ اسے

اور اک ہوا۔ آسمان کی وسعتوں میں اس کے لیے پیغام تھا۔ کشادگی کا، خوب صورتی کا، آسانی کا۔

دانیہ نے دونوں ہاتھ پھیلائے، شام کی خوش گوار ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ اسے ایسی آزادی کا احساس ہوا جو آج سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

اتوار کی اونگھتی سہ پہر تھی۔ ناشتہ کرکے دانیال اور زریاب جو نکلے تو رات گئے واپس آئے۔ مختلف شاپنگ بیگز سے لدے پھندے۔ ارم آپا نے کڑے تیوروں سے بیٹے کو گھورا۔

''کہاں نکلے ہوئے تھے تم؟ چھٹی والے دن دس کام ہوتے ہیں۔ خود بھی باہر نکل گئے۔ دانیال کو بھی ساتھ لے گئے۔''

''کیا کام تھا۔ ابو سے کروالیتیں؟'' زریاب لاپرواانداز میں بولتا ہوا صوفے پہ ڈھیر ہوگیا تھا۔

''پہلے کبھی کیے ہیں تمہارے ابو نے ایسے کام جواب کریں گے؟''

''ویسے گئے کہاں تھے تم لوگ؟ اور یہ کیا لائے ہو؟'' ارم آپا کی متجسس نگاہیں شاپنگ بیگز پر تھیں۔

''بازار گئے تھے۔ ماموں کو شاپنگ کرنی تھی میں بھی ساتھ میں چلا گیا۔''

زریاب کشن پہ سر رکھے، آنکھیں بند کیے بول رہا تھا۔ دانیال بھی صوفے پہ بیٹھا تھا۔ ٹانگیں پھیلائی ہوئی تھیں چہرے سے تھکن ظاہر تھی۔

''دانیال اور شاپنگ؟'' ارم آپا کو یقین نہیں آرہا تھا۔ برس ہا برس سے اس کا ایک ہی معمول تھا۔ آٹھ دس شرٹوں اور چار پانچ پینٹوں میں وہ پورا سال نکال دیتا تھا۔ اس بار ایسی کیا ضرورت پیش آگئی؟ انہوں نے خود ہی آگے بڑھ کر تھیلے دیکھنا شروع کردیے۔

''پینٹ، شرٹس، شلوار قمیص، جوتے، پرفیوم، ٹائیاں، واسکٹ، ایں......'' وہ چکرا گئیں۔

''خیریت تو ہے اتنی شاپنگ! کیا ساری سیلری خرچ کرکے آگئے؟''

''تقریباً۔'' زریاب کی طرف سے جواب آیا۔

''ہیں دانیال؟'' انہوں نے دانیال کی طرف رخ کرکے تصدیق چاہی۔

''جی آپا!'' دانیال نے جواب دیا۔ وہ کچھ بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ آپا نے غور سے جائزہ لیا۔

''نیا ہیئر کٹ؟ تروتازہ چہرہ، اب تو مردوں کے سیلون بھی عورتوں سے کم نہیں۔'' وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

''میں تو انتظار کررہی تھی تمہارا، بل کی تاریخ سر پر آرہی ہے۔'' انہوں نے پرامید نگاہوں سے دانیال کو دیکھا۔

''اس بار تو اچھی خاصی رقم ٹھکانے لگ گئی آپا میرے پاس تو روزانہ پٹرول کے پیسے بھی نہیں بچے۔'' دانیال کا یہ انداز پہلی بار تھا۔ آپا ہکا بکا رہ گئیں۔

''مما جانی! چائے تو پلا دیں اچھی سی۔'' زریاب نے آنکھیں کھولیں۔

دانیال میز پہ بکھرا سامان سمیٹ کر تھیلوں میں واپس رکھنے لگا۔

ارم آپا کو عجیب سا احساس ہو رہا تھا جسے وہ کوئی نام دینے سے قاصر تھیں۔ انہوں نے باری باری پہلے بیٹے کا پھر بھائی کا چہرہ دیکھا۔ کچھ تھا جو بدلا بدلا سا تھا۔ مگر سمجھ سے باہر تھا۔

''پتا نہیں یہ لڑکا اندر ہی اندر کیا چکر چلا رہا ہے؟'' انہوں نے بیٹے کو گھورا، جس کی حرکتیں اور باتیں آج کل بہت ہی زیادہ مشکوک ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

جاتی ہوئی سردیاں تھیں۔ موسم بڑا متوازن اور خوش گوار تھا۔ نہ بہت زیادہ ٹھنڈ، نہ بے پناہ گرمی، دانیہ جلدی جلدی برتن دھو رہی تھی۔ چند برتن ہی باقی رہ گئے تھے۔ جب اس کا موبائل بجنے لگا۔

موبائل اٹھا کر وہ سیدھی کمرے میں گئی۔ اس کال کا اور اس مہربان آواز کا انتظار رہنے لگا تھا۔

"معذرت چاہتا ہوں، اس ہفتے انتظار کروایا آپ کو، دراصل روزانہ اوور ٹائم لگ رہا تھا۔ رات بہت دیر ہو جاتی تھی واپسی میں۔" دانیال اپنی نرم اور ٹھہری آواز میں اسے بتا رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔"

"بہت مس کیا آپ کو، دل چاہتا تھا۔ رات میں کال کروں مگر اس وقت کال کرنا مناسب نہیں لگتا تھا۔"

"جی......"

"آپ نے...... مجھے مس کیا؟"

دانیہ خاموش ہو گئی۔ ایسے سوال کا جواب دینا بڑا مشکل لگتا تھا۔

"وہی جواب دے دیں جو ابھی دیا تھا۔" دانیال شریر ہوا۔

"دیکھیں پلیز، آپ ایسی باتیں کریں گے تو مجھ سے بات نہیں ہو گی۔" دانیہ نے بمشکل جواب دیا۔

"چلیں ٹھیک ہے، میں کوئی اور بات کرتا ہوں۔" دانیال جھٹ سے مان گیا اور دانیہ کو اس کی یہ ادا بہت پیاری لگی۔

"آپ بہت جلد مان جاتے ہیں؟" دانیہ مسکائی۔

"آپ کو اچھا لگا؟"

"جی۔"

"میں سمجھ سکتا ہوں، دراصل خواتین کو تابع دار شوہر اچھے لگتے ہیں۔"

"جی نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" دانیہ گڑبڑائی۔

"تو پھر؟ کیا میں تابع دار نہ بنوں؟"

"ایک مرد کو آنکھیں بند کر کے اپنی بیوی کا فرماں بردار نہیں ہونا چاہیے۔" دانیہ کو یکا یک اپنے بھائی کا خیال آیا، وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"ہوں۔" دانیال سمجھ گیا۔ وہ بھی تو ایسے ہی رشتوں کو جھیل رہا تھا۔

"اگلے ہفتے ایک سرپرائز ہے آپ کے لیے۔" اس نے موضوع بدل دیا۔

"سرپرائز ہے تو بتایا کیوں؟"

"گڈ کوکنگ۔ لاجواب کرنا جانتی ہیں۔"

"میں ......" دانیہ کچھ کہنے والی ہی تھی کہ فریال بھابھی کی آواز آ گئی۔ وہ دانیہ کو پکارتی ہوئی وہیں آ رہی تھیں۔

"خدا حافظ!" دانیہ نے جلدی سے لائن کاٹ دی۔

اندر آتی فریال بھابھی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پہلے وہ کبھی فون موبائل استعمال نہیں کرتی تھی۔ جتنا اب کر رہی تھی۔ مگر اس پر اعتراض کرنے کے بجائے انہوں نے ڈائریکٹ مدعا بیان کیا جس کے لیے وہ یہاں آئی تھیں۔

"اپنے بھائی کے لیے چائے بنا دو۔ ان کے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"جی اچھا۔" دانیہ نے ان کی جانچتی ہوئی نگاہوں کے حصار سے نکل کر فوراً کچن کا رخ کیا۔

☆☆☆

زیادہ نہیں چند ہفتے ہی گزرے تھے۔ دانیال کی بالکل کایا پلٹ تو نہیں ہوئی تھی مگر کچھ زرپاب کی باتوں کا اثر تھا کہ اپنے احساس زیاں پہ غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ تقاضے دل کے تھے۔ دانیہ سے فقط دو ملاقاتیں تھیں اور چند باتیں کہ دل سنجیدہ ہو چلا تھا۔

زندگی اب تک جیسی گزری، آگے ویسی نہیں گزرنی چاہیے۔ یہ تو طے تھا۔ دانیال کے تصور میں دو سادہ و معصوم سی آنکھیں آئیں اور ویسا ہی چہرہ جو انہیں مستقبل کے خواب دکھا رہا تھا۔

ایک میچور عمر کا انسان چاہے مرد ہو یا عورت، اگر اسے موقع ملے تو اپنا شرعی حق استعمال کرنا کوئی شرم کی بات ہے نہ گناہ کی۔ بے جا شرم، لحاظ اور

مروت بھی انسان کو چور راستوں پہ گامزن کر دیتی ہے۔ جو یقیناً گناہ ہے۔

دانیال نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اگلے ہفتے کے سرپرائز کی تیاری ابھی سے شروع تھی۔ رات میں کھانے کے بعد وہ ارم آپا اور بہنوئی کے ساتھ میٹنگ کر رہا تھا زریاب نے اگرچہ پیش کش کی تھی اس میٹنگ میں شامل ہونے کی اور اپنی مورل سپورٹ کی۔ مگر دانیال نے انکار کر دیا۔ اسے یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ زریاب اس کا ہاتھ پکڑ کر یہاں تک لے آیا مگر اب آگے کا فاصلہ خود ہی طے کرنا ہے۔ یہ جنگ اکیلے ہی لڑنی ہے۔ کسی کی مدد اور تعاون کے بغیر۔

کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کی تھی دانیال نے۔ بس اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ دانیہ کے ہمراہ زندگی گزارنا چاہتا ہے۔

آپا تو بھائی کی خواہش سن کر ہی ہکا بکا تھیں۔ کچھ دیر تک تو ان کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ پھر انہیں یاد آیا کہ کیا بولنا ہے۔

"انہوں نے منع کر دیا تھا، اب دوبارہ کیوں ہاں کریں گے؟"

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ وہ ہاں کر دیں گے۔"

"مگر وہ لڑکی اور اس کی بھاوج دونوں بہت چلتر عورتیں ہیں۔ میں کھٹک رہی تھی ان کی آنکھوں میں، تم کر لو گے ایسی لڑکی سے شادی جو گھر میں آنے سے پہلے، مجھے باہر نکالنے کے درپے ہے؟" آپا کی حیرت دور ہوئی تو زبان فراٹے بھر چکی تھی۔

دانیال نے ایک گہری سانس لی۔

"وہ لڑکی ایسی نہیں ہے۔"

دانیال کا یقین آپا کی آنکھوں میں چبھنے لگا۔

"رہی بات گھر کی تو یہ ہمارے والدین کا گھر ہے۔ آپ کا حق ہے اس پر اور آپ کا یہاں رہنا، میرے سر آنکھوں پر شادی کے بعد میری بیوی میری ذمے داری ہے۔ ہم اوپر کے پورشن میں رہیں گے۔ اگلے ماہ ویسے بھی کرایہ دار وہ پورشن خالی کر رہے ہیں۔"

"تمہیں کس نے یہ پٹیاں پڑھائی ہیں؟"

آپا اپنے حواسوں میں آ گئی تھیں۔

"اس عمر میں کون پٹیاں پڑھائے گا آپا؟"

دانیال مسکرایا۔ "خود ہی عقل آتی ہے کہ زندگی کو زندگی کے طور گزارا جائے۔"

"کچھ زیادہ ہی عقل نہیں آ گئی تمہیں؟ پہلے تو......"

آپا کی قینچی کی طرح چلتی زبان کو ان کے شوہر نے مداخلت کر کے روکا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہے دانیال، اسے اپنے فیصلے کرنے کا حق ہے۔ تم راہ میں رکاوٹ نہ بنو، بھائی کا ساتھ دو۔"

ظہیر صاحب کو دانیال کے چہرے پہ لکھا فیصلہ دکھائی دے رہا تھا۔ مخالفت کا مطلب تعلقات اور معاملات کو خراب کرنا تھا۔ انہوں نے دانیال کو مخاطب کیا۔

"ہم تمہارے ساتھ ہیں، جب کہو، تمہارا پرپوزل لے کر چلے جائیں گے۔" دانیال کا شانہ تھپتھپا کر وہ کھڑے ہو گئے۔

ارم آپا نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے شوہر نامدار کو دیکھا۔ ویسے تو وہ بیوی کے آگے پیچھے پھرنے والے شوہر تھے مگر آج اس وقت کیسے انہوں نے فوراً آنکھیں اور پارٹی بدل لی تھی۔

☆☆☆

زرمینہ نے باپ کو راز دار بنایا تھا۔ لمبی چوڑی تقریر نہیں کی تھی۔ کم لفظوں سے کام چل جائے تو الفاظ ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

"پھپھو آپ کی بہن ہیں اور آپ کی ذمے داری ان کے لیے رشتہ دیکھنا ہے، شادی کرنی ہے، جو کرنا ہے خود کریں، کسی اور پر یہ ذمے داری مت ڈالیں، چاہے وہ کوئی بھی ہو، آپ دانیال انکل

سے ملیں، جو پوچھنا ہے، جو کہنا ہے، ڈائریکٹ بات کریں اور خود کریں۔"

"مگر بیٹا! تمہاری امی کو درمیان سے ہٹا کر میں اکیلے کیسے سارے معاملات طے کرلوں؟" ابو کی تشویش اور اعتراض بجا تھے۔

"اس لیے کہ اپنی بہن کے لیے جو محبت اور خیر خواہی آپ کے دل میں ہے۔ وہ کسی دل میں نہیں ہو سکتی اور امی کو ہم درمیان سے تھوڑی نکال رہے ہیں۔ شادی کی تیاریاں تو بہرحال وہی کریں گی۔ میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ فیصلہ آپ کریں۔ پھپھو کی خوشی آپ کے فیصلے میں ہے۔" زرینہ نے انہیں قائل کرلیا تھا۔

وہ دانیال سے ملے، جو اپنے بہنوئی اور بھانجے کے ہمراہ تھا۔ ریسٹورنٹ کی اس میز پر ان کے سوالات اور خدشات کے تسلی بخش جوابات ملے۔ اور دانیال انہیں پہلے بھی پسند آیا تھا بہن کے لیے۔ مگر......

بہرحال اب انہوں نے اور دانیال کے بہنوئی صاحب نے آپس میں بات کر کے فیصلہ کرلیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے معاملات کو اپنی بیوی کی نظر سے دیکھنے کے بجائے خود اپنی نگاہ سے دیکھا تھا۔ انہوں نے گھر پر دانیال کے حوالے سے بات کی۔ اس نام پر دانیہ کے چہرے پہ جو خوشی اور چمک تھی۔ اس میں فریال بیگم کی ناگواری اور واویلا دونوں ماند پڑ گئے تھے جن کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

"تم تو خوش ہونا؟" بہت عرصے بعد انہوں نے دانیہ کے سر پہ ہاتھ رکھ کر اس سے کچھ پوچھا تھا اور جواب میں وہ۔ رو پڑی تھی۔

"ارے......رو کیوں رہی ہو۔" بھائی بوکھلا گئے۔

"رونے دیں۔ خوشی کے آنسو ہیں۔" زرینہ نے مداخلت کی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ دانیہ کے قریب آئی اور سرگوشی میں گویا ہوئی۔

"میلوڈی کوئن! رونا بند کریں۔ کسی نے آپ کی مسکراہٹ کی فرمائش کی ہے۔"

اور جس نے فرمائش کی تھی۔ وہ پریشان ہو کر سوال کر رہا تھا۔

"میں نے سنا ہے تم رو رہی تھیں۔ کیوں؟"

"یونہی......آنسو آگئے تھے۔"

"اب نہیں آنے چاہئیں، آنکھوں میں آنسو۔" دانیال کی طرف سے حکم صادر ہوا۔

"خوشی کے آنسوؤں کو تو اجازت ہونی چاہیے آنکھوں میں آنے کی۔" دانیہ کا لہجہ اسی کی طرح دھیما تھا۔

"مجھے یہ پیاری آنکھیں ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔"

"صرف آنکھیں؟" ہمیشہ کی طرح بے ساختہ سوال اور سوال کے بعد پزل ہونا، پرانی عادت تھی دانیہ کی۔

"مزید کچھ کہوں گا تو تم فون بند کرنے کی دھمکی دے دو گی۔" دانیال کا لہجہ شریر ہوا۔

"نہیں دوں گی دھمکی۔"

"یعنی دھمکی دیے بغیر ہی کال کاٹ دو گی؟"

"نہیں کاٹوں گی بھئی۔" دانیہ زچ ہوگئی۔

"اچھا یہ بتاؤ، تمہیں اندازہ تھا کہ سرپرائز کیا ہوگا؟"

"اندازہ نہیں تھا۔ معلوم تھا۔ زرینہ نے بتایا تھا۔"

"اور اسے یقیناً زریاب نے اطلاع دی ہو گی۔ بدتمیز نہ ہو تو۔"

"ایسے نہ کہیں، ان دونوں کی کوشش اور محنت ہے جو آج ہم۔" دانیہ بولتے بولتے رک گئی۔

"ادھوری باتیں کیوں کرتی ہو۔ آج تو بات مکمل کرو۔"

"بات تو مکمل ہو گئی ہے، میں کیا باتیں کروں؟" دانیہ بے ساختہ کھلکھلائی تھی۔

دانیال اس ہنسی میں گم ہوگیا۔ آگے کچھ کہنا بھول گیا۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔

وہ بات بھی مکمل ہوگئی تھی دونوں کی اور ذات بھی وہ ادھورا پن جو زندگی میں تھا اس کی تکمیل ہوگئی تھی۔

بس اب سجدہ شکر تھا جو رہ گیا تھا۔ اس کی ادائی کے لیے دونوں کی نیت باوضو تھی۔

☆☆

فاطمہ احمد

چراغِ دل

میں نے تو کبھی تم سے ملنے کی چاہ بھی نہیں کی۔ میرے لیے تو یہی کافی تھا تم اپنی زندگی میں خوش ہو۔ مجھے یہ آس تو تھی زندگی میں کبھی کبھار ہی سہی تمہاری صورت دکھائی دے جائے گی۔ تمہاری بے وفائی کے باوجود اٹھارہ سال گزرنے کے بعد بھی تمہاری محبت میرے دل سے کم نہیں ہوئی اور پتا نہیں کیوں مجھے یہ یقین ہے کہ تم بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے تھے۔

کیوں تمہاری آنکھیں مجھے دیکھتے ہی روشن ہو جاتی تھیں۔ تمہاری اک نظر سے میں تمہارے دل کا حال جان لیتی تھی اور جب ہم جدا ہوتے تو تمہارے دل کی اداسی مجھے دنوں تک بے قرار رکھتی تھی۔

تم تو کہتے تھے تمہارے بغیر میں مر جاؤں گا پھر کیوں تم نے راستہ بدلا۔ میری انا نے اجازت ہی نہیں دی۔ میں کبھی تمہارا گریبان پکڑ سکتی۔ تم میرا سامنا کرنے سے ڈرنے لگے مگر لوگوں سے میرا حال ضرور پوچھتے۔ کبھی مجھ سے تو پوچھا ہوتا کہ میری بے وفائی کے بعد تم کیسے زندہ ہو۔ تمہاری تو سانسیں میرے دم سے چلتی تھیں تو اب تم کیسے رہ رہی ہو۔

دنیا دکھاوے کے لیے میں نے اپنے کرچی کرچی دل کو ہزار پردوں میں چھپا کر ایک ہنستی مسکراتی خوش باش لڑکی کا کردار نبھایا۔ ایک اچھی بیٹی، ایک اچھی بہن پھر ایک اچھی بہو، بیوی اور ماں کا کردار بخوبی نبھایا۔ مگر میرا دل تمہاری محبت کے چراغ سے روشن رہا۔ کبھی اس کی لو کم نہیں ہوئی۔ سارا دن تھک ہار کر جب میں بستر پر لیٹتی تو تمہاری یادیں میرے آس پاس چراغاں کرتیں اور میں ان یادوں میں کھو سی جاتی جیسے کہ آج۔

☆☆☆



"السلام علیکم!"

رویحہ اپنی امی کے ساتھ بہن کے گھر آئی تو سب کو مشترکہ سلام کیا۔ چھٹی کا دن تھا۔ سب گھر پر ہی تھے۔

"نانی امی رویحہ آنی۔" بھانجا بھانجی خوشی سے چلا اٹھے اور اٹھ کر نانی اور خالہ سے لپٹ گئے۔ سب بڑے کمرے میں جمع تھے۔ سب بہت خوش تھے (کیونکہ نانی، خالائیں بہت کم کم شبنم باجی کے گھر آتیں۔ (گھر کافی دور جو تھا)

شاہ میر بھی خالہ (رویحہ کی امی) سے سلام دعا کے بعد وہیں بیٹھ گیا۔ کن انکھیوں سے رویحہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ بظاہر بھانجا، بھانجی سے باتوں میں مشغول رویحہ کا سارا دھیان بھی شاہ میر کی طرف ہی تھا۔ دونوں محبت کی ڈور سے بندھے تھے اور بہت جلد شادی کے بندھن میں بندھنے والے تھے۔

شاہ میر کی محبت بھری نگاہوں سے رویحہ کی نگاہیں حیا سے جھکی جا رہی تھیں۔ اس کے چہرے پہ شرمگیں مسکراہٹ تھی۔

"چلو رویحہ! کچن میں چلتے ہیں۔" رویحہ کی ہم عمر بھانجی منزہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"رویحہ! چائے بناؤ، تمہارے ہاتھ کی چائے سب کو پسند ہے؟"

رویحہ چائے کا پانی رکھ کر وہیں کھڑے کھڑے منزہ سے باتیں کرنے لگی۔ رویحہ کے ماموں کے بچوں کی شادی کی تھی اور رویحہ اپنے اور اپنی بہن کے کپڑے کڑھائی کے لیے دینے آئی تھی کیونکہ اس کی بھانجیاں منزہ، نزہت، ثنا کڑھائی کا کام کرتی تھیں۔

وہ آپس میں کپڑوں کے ڈیزائن شادی کی تیاریوں کے حوالے سے باتیں کرنے میں مصروف تھیں تب ہی شبنم نے منزہ کو آواز دے کر پانی منگوایا۔ لیکن منزہ کے پانی لے جانے سے پہلے شاہ میر پانی لینے کچن میں آ گیا۔

رویحہ شاہ میر کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ جلدی سے شاہ میر کو پانی دیا، اسی اثنا میں دودھ ابل گیا تو وہ اس کو دیکھنے لگی اور ہاتھ چولہے سے ٹکرا گیا۔ ایک دم سی کی آواز سے وہ کراہ کر رہ گئی۔

"تم مجھے دیکھ کر اتنا گھبراتی کیوں ہو۔ میں تمہیں کھا جاؤں گا کیا۔" شاہ میر مسکراتے ہوئے بولا۔

"آپ جائیں نا یہاں سے، سب کیا سوچیں گے۔"

"ارے سب سمجھدار ہیں یہی سوچیں گے اپنی منگیتر سے باتیں بگھار رہا ہے۔"

"مجھے اچھا نہیں لگتا، بس آپ جائیں۔" رویحہ سنجیدگی سے بولی۔

"اچھا جا رہا ہوں، پر چہرے کے زاویے درست کرو۔"

شاہ میر کے کچن سے جانے کے بعد رویحہ کی جان میں جان آئی۔ گہری گہری سانسیں لے کر خود کو نارمل کیا اور کپوں میں چائے نکال کر منزہ کو آواز دی۔

"تو لے آتی نا چائے۔" منزہ کچن میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"میرے ہاتھ پاؤں کپکپا رہے ہیں۔"

"کیوں کیا شاہ میر چاچو آئے تھے۔" منزہ شرارت سے بولی۔

"ایک تھپڑ لگے گا ناں سارے دانت باہر آ جائیں گے۔" رویحہ مصنوعی غصے سے کہتے ہوئے کچن سے نکلی۔

"اچھا رک نا، اب نانی کے پاس جا کر نہ بیٹھ جا، چل برابر والے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔"

"میں وہیں ٹھیک ہوں۔"

"چلیں ناں رویحہ آنی! ہمیں اپنے کپڑے دکھانے ہیں اور آپ سے باتیں بھی کرنی ہیں۔" دوسری بھانجیاں بھی بولیں۔

بادل نخواستہ کمرے میں آئی تو شاہ میر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ رویحہ پلٹنے لگی تو اس نے آواز دی۔

"بیٹھ جاؤ رویحہ! میں چائے پی کر باہر جا رہا

ہوں۔"

سب کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے شاہ میر کی مسکراتی، محبت لٹاتی نظریں مسلسل روحیہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ روحیہ اس کی نظروں سے نروس ہوئی جا رہی تھی۔

"مجھے نہیں بلاؤ گی شادی پر۔" شاہ میر مسکرایا۔

"نہیں بھئی، مجھے شادی انجوائے کرنی ہے اور آپ تو......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"میں تو کیا......؟"

"آپ تو بس مجھے نروس کرتے رہتے ہیں۔"

"ارے یار! تم کس زمانے میں رہ رہی ہو۔"

"یہ مجھے یار وار نہ بولا کریں مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"تو جان کہہ دیا کروں۔" شاہ میر شرارت سے بولا۔

"آپ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔" روحیہ غصے سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"غصہ تو تمہاری ناک پر دھرا رہتا ہے۔" شاہ میر اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر باہر نکل گیا۔

نکلتے نکلتے دروازے سے پلٹ کر روحیہ کو دیکھا جس کی نظریں کہہ رہی تھیں۔

"جلدی آجانا، ہم جائیں گے۔"

"میں باہر ہی ہوں۔" شاہ میر نے اطمینان دلایا۔

روحیہ کو ایسا لگا ساری روشنیاں اس کے ساتھ چلی گئیں۔

تم پاس ہوتے تو گھبراہٹ تم چلے جاتے ہو تو بے چینی۔ "یا اللہ میں کہاں پھنس گئی۔" روحیہ نے بے بسی سے سوچا۔

"ملو نہ تم تو ہم گھبرائیں ملو تو آنکھ چرائیں
ہمیں کیا ہو گیا ہے، ہمیں کیا ہو گیا ہے

منزہ شرارت سے گنگنانے لگی تو میں کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

☆☆☆

"اب تو صرف تمہاری یادیں ہی یادیں ہیں۔ رات کو آنسو تکیے کو بھگوتے رہتے ہیں۔ پہلے تو کبھی نہ کبھی تمہارا پیغام مل جاتا تھا۔ تمہیں اک نظر دیکھ لیتی تھی۔ اب تو دل ویران ہو گیا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے دنیا میں میرے لیے کچھ بھی نہیں۔ دنیا بالکل خالی ہو گئی۔ ساری رعنائیاں تم اپنے ساتھ لے گئے۔

تم تو ایسے دیس جا بسے ہو جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ تم نے تو یہ بھی نہیں سوچا تمہارے جانے کے بعد تم سے وابستہ لوگ کیسے رہیں گے۔

تمہاری زندگی کے آخری دنوں میں تم سے ملنے آئی تو میرے رونے پر تم نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"بے فکر رہو، ابھی نہیں جاؤں گا تم سب کو پہنچا کر جاؤں گا۔"

"پکی بات۔" میں نے کہا۔

"ہاں پکی بات۔"

"اب کوئی صدمہ سہنے کی طاقت نہیں ہے دل میں۔"

"اللہ جب غم دیتا ہے تو اسے سہنے کی طاقت بھی دیتا ہے۔" تم بولے۔

"مگر کچھ زخم کبھی نہیں بھرتے۔" میں بولی۔

"وقت سب سے بڑا مرہم ہے، آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

مگر میرے دل کو صبر کیوں نہیں آتا۔ کیوں تمہاری یادیں میرے دل و دماغ سے نکل نہیں پاتیں۔ کیوں میں تمہیں بھول نہیں جاتی۔ بظاہر میں خوش ہوں۔ ٹھیک ہوں مگر اندر سے میرا دل ویران ہے۔ میرا دل چاہتا ہے۔ میں یہ دنیا چھوڑ کر تمہارے پاس آجاؤں اور ہم ڈھیر ساری باتیں کریں۔

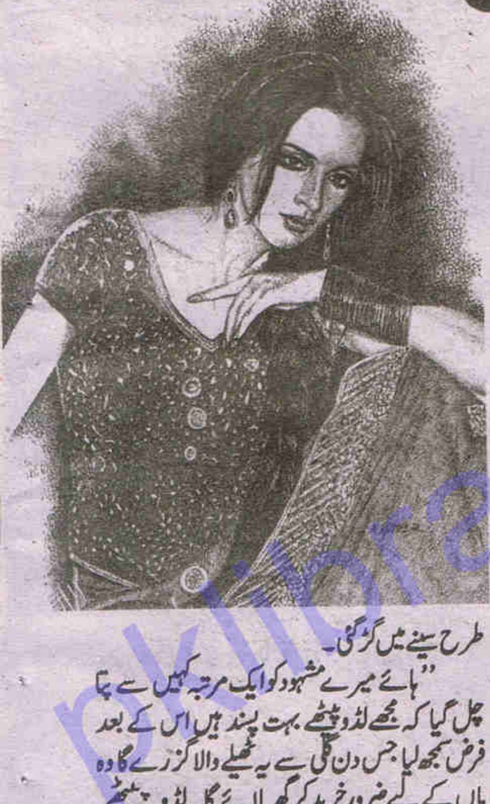
کاش تم اک بار واپس آجاؤ میں وہ ساری باتیں سنوں گی جو تم کہنا چاہتے تھے۔ جو تم سننا چاہتے تھے، کاش ایک بار پھر وقت پلٹ سکتا۔

اپنی انا کے ہاتھوں ہم ان لوگوں کو گنوا دیتے ہیں جو ہمیں جان سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ ساری عمر نارسائی کے غم میں تڑپنے سے بہتر ہے محبت میں شراکت برداشت کرلی جائے ورنہ پھر زندگی میں بہت سے کاش رہ جاتے ہیں۔

☆☆

قانتہ رابعہ

[illegible]



آہستہ آہستہ مشہود سب کی گفتگو اور تذکرے میں کم ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ سگے بہن بھائی اور خالہ ماموں بھی کسی خاص موقع پر ہی یادوں کے خزانے کی پوٹلی کھول کر جھاڑ پونچھ کرتے اسے یاد کرتے اور بس۔

باپ تو ملازمت اور اکیڈمیوں میں دن رات پڑھانے میں مصروف ہو گئے رات گئے گھر واپس آنا اور صبح سویرے نکل جانا باپ تھے ظاہر بات ہے یاد تو کرتے ہی ہوں گے لیکن دل ہی دل میں مردوں کی تو کھال تو ویسے ہی موٹی ہوتی ہے۔

مشہود کی والدہ کبھی شکوہ کرتیں۔

"کبھی تو اس کی قبر پر چلے جایا کریں۔"

"جاتا ہوں، یا گیا تھا۔" کہہ کر وہ بات ختم کر دیتے۔

ہاں یہ تھا کہ جوانی کی سرحدوں کو چھوتے بیٹے کی مرگ ناگہاں نے انہیں دنیا سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اکثر باتیں کرتے کرتے گم صم ہو جاتے خلاؤں میں تکتے رہتے۔ بیٹے کی یادوں کو سینے سے لگائے چوبیس میں سے بیس گھنٹے چھم چھم رونے والی تو ماں تھی۔

ماں جس نے ایسا بچہ جنا ادھر ڈاکٹر کے کلینک پہنچی اور منٹوں سیکنڈوں میں گل گوتھنا بیٹا ڈاکٹر کے ہاتھوں میں تھا۔ ماں جو اسے یاد کر کے ہر پل جیتی اور ہر پل مرتی تھی۔ ماں جسے یعقوب کی طرح موجود اولاد کے بجائے بچھڑنے والے کے غم میں رونا تھا۔ جب وہ یاد آتا اور وہ کون سا دن تھا جب وہ یاد نہ آتا ہو۔ گلی میں لڈو پیٹھے والا گزرا تو مشہود کی یاد برچھی کی طرح سینے میں گڑ گئی۔

"ہائے میرے مشہود کو ایک مرتبہ کہیں سے پتا چل گیا کہ مجھے لڈو پیٹھے بہت پسند ہیں اس کے بعد فرض سمجھ لیا جس دن گلی سے یہ ٹھیلے والا گزرے گا وہ ماں کے لیے ضرور خرید کر گھر لائے گا۔ لڈو پیٹھے والا گلی میں جب مشہود کے جانے کے بعد پہلی مرتبہ آیا تو سب گھر والوں کو بے ساختہ یاد آ گیا۔ سب نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سب کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔

ماں تو روتی بلکتی کمرے میں چلی گئی لیکن بیٹی نے ریڑھی والے کو روک کر پلیٹ بنوائی۔ بہت اہتمام سے ماں کے پاس لے کر گئی۔ ماں کے گلے

میں بازو ڈالے۔

"امی جان یہ میں آپ کے لیے بنوا کر لائی ہوں، مشہود بھی لاتا تھا ناں آپ کے لیے!"

لیکن ماں نے پلیٹ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، شام تک وہیں تپائی پر پڑی رہی۔ بیٹی کے جانے کے بعد وہ بہت روئیں اور بہت دیر تک روئیں گھر میں از سر نو سوگ اور ماتم کی فضا پھیل گئی حالانکہ چھوٹی بیٹی کی اس دن سالگرہ تھی۔

آنے بہانے وہ ہر کسی سے مشہود کا تذکرہ شروع کر دیتیں۔ گھنٹے دنوں میں، دن مہینوں میں، مہینے سالوں میں گزرتے چلے گئے سوائے ماں کے سب کے لیے اب مشہود بھولی بسری داستان تھا۔

اب بھی ان کی کوئی صبح مشہود کے ذکر کے بغیر شروع نہ ہوتی۔

"میرا مشہود سویرے اٹھنے کا عادی تھا۔"

سے بات شروع ہو کر رات کی سیاہی تک جاری رہتی۔ سننے والے کبھی ہاں میں ہاں ملاتے کبھی مصروف ہوتے تو ماتھے کے بل بھی گنے جا سکتے تھے۔

گرمیوں کا آغاز ہوتا تو ہر مرتبہ مخصوص فقرہ دہراتیں۔

"میرا مشہود گرمیوں کے شروع ہی میں اسپرے کرنے والے کو لے آتا تھا۔"

ساری کی ساری سردیاں بھی مرحوم بیٹے کے تذکرے سے جذبات اور ماحول کو گرم رکھتیں۔

بچے اب ملازمت کے مراحل میں داخل ہو چکے تھے۔ رشتے ناتے طے ہونے کے مراحل شروع ہو چکے تھے۔

اب گھر والوں کے لیے موضوع ان بچوں کی نوکری اور جلد قائم ہونے والے رشتے تھے۔

کچھ ہی دنوں میں بڑے بیٹے کی منگنی ہوئی۔

لڑکی اس کے ساتھ ہی آفس میں ملازمت کرتی تھی۔

بس رسمی کارروائی کے لیے دونوں گھرانے ایک دوسرے کے ہاں گئے ورنہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی والا معاملہ تھا۔

نومبر کے آغاز میں ہلچل مچ گئی۔

بیٹے کی سسرال شادی کی تاریخ طے کرنے کے لیے مدعو تھی۔

مل بیٹھ کر متوقع تاریخ بھی سوچ لی گئی تھی۔

گھر میں از سر نو رنگ روغن ہو چکا تھا۔

دونوں بہنیں دس طرح کے پکوان تیار کر کے تیار ہونے کے لیے باورچی خانے سے نکل رہی تھیں۔ جب مشہود کا بڑا بھائی مناظر حسن جس کی شادی کی آج تاریخ طے ہونا تھی۔ باورچی خانے میں آہستہ سے داخل ہوا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے بہنوں کو مخاطب کیا۔

"نورین باجی ایک کام تھا آپ سے۔"

"جی بھیا! بتائیے۔" پسینہ پونچھتے ہوئے بہن نے کہا۔

"وہ بات یہ ہے کہ آپ نے ایک کام اپنے ذمہ لینا ہے۔ آپ تو جانتی ہیں، میری سسرال والوں کو، میں چاہتا ہوں، وہ جب یہاں سے جائیں تو کوئی بدمزگی نہ ہو، سب کچھ بہت اچھے طریقے سے ہو جائے۔ آپ نے واقعی بہت اچھا کھانا بنایا ڈرائنگ روم بھی نئے پردوں سے بالکل نیا لگ رہا ہے لیکن بات یہ ہے آپ ناں......" وہ جھجک کر رکا پھر سرگوشی میں بولا۔ "آپ کوشش کریں، امی کسی طرح ان کے سامنے مشہود کا ذکر نہ لے کر بیٹھ جائیں اور اگر مشہود کی بات شروع کریں تو آپ طریقے سے موضوع بدل دیں ٹھیک۔ اصل میں جب وہ لوگ رشتہ دیکھنے اور بات پکی کرنے کے لیے آئے تب بھی اور جب عیدی لے کر آئے تب بھی امی نے سوائے مشہود کی باتوں کے کوئی موضوع ہی منتخب نہ کیا۔ وہ تو ماں ہیں انہیں تو مرحوم بیٹے کی یادوں کو دہرانا اچھا لگتا ہے لیکن میں نہیں چاہتا۔ سننے والے بیزار ہوں یا بوریت محسوس کریں اور میری امی کو سٹھیائی ہوئی بڑھیا کہیں۔"

مناظر کچھ اور بھی بول رہا تھا لیکن اس کی ماں نیچے بیٹھتی چلی گئیں۔

☆☆

نمرہ احمد

حالم

انتالیسویں قسط

"ابا نے ماں کو اپنی دولت سے محروم نہیں کیا۔لیکن میں جانتا تھا شمس کی نظر اسی دولت پہ ہے۔وہ کسی نہ کسی طرح ہماری کمپنی کا حصہ دار بننا چاہتا تھا۔اس نے بہت کوشش کی۔ مگر ابا کے بعد..... مالک اور میں ایک پیج پہ رہے۔ ہم نے ماں کو بہت سے قانونی طریقوں سے اس دولت کو ضائع کرنے سے روکے رکھا۔"

فیری کے عرشے پہ شور مچاتے نوجوانوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔وہ خوش تھے یا شاید دنیا کو یقین دلانا چاہ رہے تھے کہ وہ خوش تھے۔

"اس وقت ہم میں سے کوئی جادو جنات پہ یقین نہیں کرتا تھا۔جب شمس کسی قانونی طریقے سے کمپنی میں داخل نہ ہو سکا تو اس نے روحانی طریقے اپنا لیے۔اس نے میرے اوپر کچھ کروایا۔ مجھے آوازیں آنے لگیں اور میرا پیرانویا (پاگل پن) شروع ہو گیا۔خوف ان چیزوں کی غذا ہے۔ماں کے اس عمل سے پہلے میں ٹھنڈے مزاج کا انسان تھا۔لیکن شمس کے آنے کے بعد.... کرائسس کے بعد.... میں تلخ ہو گیا۔غصے والا۔میرا غصہ قابو نہیں ہوتا تھا اور وہی میری کمزوری بن گیا۔غصہ اور خوف۔ جنات ان دو چیزوں کو استعمال کرتے ہیں۔"

اس نے گھٹنے سینے سے لگا لیے اور ٹھوڑی ان پر رکھے اسے دیکھے گئی۔وہ آہستہ آہستہ بولتا اب سامنے دیکھ رہا تھا۔عمارتوں کی روشنیاں اس کی آنکھوں میں بھی جھلملانے لگی تھیں۔

"سبرینہ نے مجھے احساس دلایا کہ روحانی طاقتیں وجود رکھتی ہیں۔مگر میں ان چیزوں کا مقابلہ نہیں کر سکا۔میں نے سبرینہ پہ بھی حملہ کیا۔"

"سبرینہ ٹھیک ہے؟" اس نے نگاہیں چرا لیں۔دل میں قلق سا ابھرا۔

"ڈونٹ وری۔وہ محفوظ ہے۔زیاد اس کو کبھی نہیں تلاش کر سکے گا۔"

پانی اب پرسکون ہونے لگا تھا کیونکہ فیری اپنا چکر مکمل کر کے ان سے دور جا رہی تھی۔

"مالک ہمیشہ میرے ساتھ کھڑا رہا تھا۔وہ چاہتا تو ابا کے مرنے کے بعد ہماری دولت میں نقب لگا سکتا تھا۔اس دولت میں اس کا حصہ بہت کم تھا۔لیکن اس نے امانت کا حق ادا کیا۔اس نے کمپنی کو بچائے رکھا.... مگر...."

"مگر؟"

"مگر ماں اور شمس نے اس کو بھی کنفیوز کر دیا۔ میرا سائیکوسس اسے دکھائی دے رہا تھا۔مالک جادو کو نہیں مانتا تھا۔علاج کو مانتا تھا۔اس نے مجھے ماں کے ساتھ مل کے ذہنی امراض کے ہسپتال داخل کروا دیا۔"

ماہر نے گردن اٹھا کے سیاہ آسمان کو دیکھا۔ بادل ہر طرف پھیلے تھے۔اندھیرے پہ اندھیرا۔ درمیان میں کہیں سے چاند جھلک رہا تھا۔آدھا چاند۔

"میں اس دن کو کبھی نہیں بھول سکتا جب مالک

مکمل ناول

کے رپورٹ کرنے پہ وہ مجھے لینے آئے تھے۔ کسی مجرم کی طرح انہوں نے مجھے گرفتار کیا تھا۔ پھر وہ مجھے راہداری میں زبردستی آگے لے جا رہے تھے۔"

وہ چاند کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تب ہلال نے مجھے روکا تھا۔ اور اس نے کہا تھا کہ جب میں واپس آؤں گا تب وہ وہاں نہیں ہوگی۔ ہلال ایسی پراسرار باتیں کیا کرتی تھی۔ لیکن تب اس نے وہ نام لیا تھا۔ کہ وہ اس کا انتظار کرے گی۔ وہ اسے بچالے گا۔"

"بدر؟"

ماہر نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"اگلے چند ماہ جو اسائیلم میں گزرے..... یہ نام میرے ذہن پہ دستک دیتا رہا۔ کون بدر؟ وہ کس کی بات کر رہی تھی؟ جب میں اپنے خوف کا مقابلہ کر کے تندرست ہو کے باہر آیا تب تک بہت سا نقصان ہو چکا تھا۔ زیاد نے میری ماں کو مار دیا تھا۔ ہلال غائب تھی۔ پھر میں نے اپنی زندگی کی ٹوٹی کرچیاں سمیٹیں اور اپنے اصل کی طرف واپس لوٹا۔ خود ساختہ جلاوطنی اختیار کی اور ہلال کو ڈھونڈنے لگا۔ لیکن یہ نام ہمیشہ ذہن میں رہا۔ یہ نام واحد lead (رہنمائی) تھا جو مجھے ہلال تک لے جا سکتا تھا۔ درمیان میں کئی نام آئے۔ کشمالہ مبین۔ عالیان سادان۔ کبیرہ بیگم۔ مگر بدر کو کوئی نہیں جانتا تھا۔"

اب کے اس نے گردن موڑ کے مالا کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"میں اس لیے اس کا نام لینے سے نہیں ہچکچاتا کیونکہ وہ زیاد کا بیٹا ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ میرا ایک ٹراما ہے۔ مجھے وہ دن یاد آتا ہے جب وہ مجھے کسی قیدی کی طرح ایمبولینس میں ڈالنے لے جا رہے تھے اور راہداری کی دیوار پر مون فیز کے اسٹکرز لگ



رہے تھے۔ بدر سے ہلال اور ہلال سے بدر تک۔"

چند ثانیے خاموشی سے کٹ گئے۔ فیری دور جا چکا تھا اور آوازیں دم توڑ گئی تھیں۔

"کیا تم کبھی مکمل طور پہ (زخم کا مندمل ہونا) ہیل ہوسکو گے، ماہر؟"

"کوئی بھی مکمل طور پہ کبھی ہیل نہیں ہوسکتا، مالا۔ میں بھی نہیں۔ تم بھی نہیں۔ اس عمر میں تو کبھی نہیں۔ بس ہر وقت خود پہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اپنے اصل سے قریب ترین جانے کے لیے۔"

"تم نے کبھی اپنی ماں کو معاف نہیں کیا؟"

"معاف کرنے سے ہیلنگ کہاں ہوتی ہے۔"

پھر وہ اس کی طرف گھوما اور مسکرا کے اسے دیکھا۔

"اب بتاؤ... میری دی ہوئی تکلیف کا رنگ براؤن کیوں تھا؟"

وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرادی۔

"تمہاری دی گئی تکلیف جب بھی یاد آئی تمہارا چہرہ یاد آیا۔ اور...."

اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ابرو سے اشارہ کیا۔

ایک لمحے کے لیے ماہر نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"اوہ۔" پھر وہ بے اختیار ہنس دیا۔

وہ اس رنگ کو مالا سے جڑی چیزوں میں ڈھونڈتا آرہا تھا۔ وہ رنگ تو اس کے اندر تھا۔

"اب تم بتاؤ، پرپل کیوں؟"

"یہ ڈیل نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنے حصے کا جواب دے چکا ہوں۔" وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے کھڑا ہو رہا تھا۔

"ہم ایک نئی ڈیل کرسکتے ہیں۔"

مگر وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ وہ اٹھ کے اس کے پیچھے آئی۔

"تم نے زارا سے منگنی کیوں کی؟"

وہ وہیں پانی کے کنارے رک گیا۔ گہری سانس لے کر سوچا۔

"نو فلٹر؟" جیسے اس سے اجازت مانگی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"نما لک بیمار تھا۔ اور میں گلٹی، میں اسے اس کی زندگی کی آخری خوشی دینا چاہ رہا تھا۔"

"پھر تم اس سے اتنا ڈی ٹیچڈ (علیحدہ) کیوں ہو؟"

ماہر نے ابرو اٹھا کے دیکھا۔

"یعنی؟"

"تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ اس وقت تمہیں اس کے ساتھ ہونا چاہیے۔ لیکن تم نہیں ہو۔" وہ رک رک کے کہہ رہی تھی۔ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے۔ ان کے تعلق کی گہرائی کتنی تھی؟

"تمہیں ایک دم سے زارا کا خیال کیوں آیا؟"

"کیونکہ وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔ اور تم نے مجھے اپنے ساتھ والا اپارٹمنٹ دے دیا ہے۔ کیا وہ یہ بات جانتی ہے؟"

"وہ یہ جانتی ہے کہ میں نے تم سے تمہاری مدد کا وعدہ کیا ہے۔ اس کے لیے مجھے جو کرنا ہوا میں کروں گا۔ باقی اس نے مجھ سے منگنی مجھے جانتے ہوئے کی تھی۔ میرا لائف اسٹائل، میرا کام اس کو سب معلوم ہے۔"

"کیا تم اس کے ساتھ بھی یہاں واک کرنے آتے ہو؟"

وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ایک طرف سڑک تھی۔ دوسری جانب پانی۔ دونوں ہی تاریک تھے۔

"نہیں۔ ہم بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ہم نے بہت سی پکنکس اور ویکیشنز ایک ساتھ کی ہیں۔ کچھ بھی نیا..." وہ رک گیا اور سر جھٹکا۔ "تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"کیونکہ مجھے تمہارے اور زارا کے ریلیشن

شپ کی فکر ہے۔"

"تم زارا کے لیے فکر مند ہو یا اپنے لیے؟"

"اپنے لیے؟" مالا نے دو بار پلکیں جھپکائیں۔

وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"شاید تمہیں یہ خوف ہے کہ اگر تم ماہر فرید کی شخصیت کو قریب سے جان لو تو تمہیں اس سے محبت نہ ہو جائے؟"

مالا نے گہری سانس کھینچی۔

"اگر مجھے تم سے محبت ہوئی تو تمہاری شخصیت کی وجہ سے نہیں ہوگی۔"

وہ چونکا۔ سانس رک گیا۔

"پھر کس لیے ہوگی؟"

"تمہارے پیسے کے لیے ہوگی نا۔ بہت پسند ہے مجھے پیسہ۔ زندگی بدل جائے گی میری۔" آنکھیں گھما کے کہا اور سر جھٹکتی آگے بڑھ گئی۔

وہ زور سے ہنس دیا۔ وہ آگے جا رہی تھی اور اس کی ٹوپی کی گیند دائیں بائیں جھول رہی تھی۔

"میری کار اس طرف پارکڈ ہے۔" وہ بیکری سے مخالف سمت میں جا رہی تھی جب ماہر نے پکارا۔

"اور میری بس یہاں سے آئے گی۔" مڑے بغیر بازو لمبا کر کے اشارہ کیا۔

"ہماری ایک ہی منزل ہے، مالا۔" وہ جیسے تھک گیا تھا۔

"راستے الگ ہیں۔" اٹھے ہاتھ کی تین انگلیاں ہلائیں اور آگے بڑھتی گئی۔

وہ وہیں کھڑا کتنی ہی دیر اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔ اس کی کہی ہوئی بات سے چہرے پہ آئی مسکراہٹ ابھی تک موجود تھی۔ پھر سر جھکایا اور انگلی میں پہنی انگوٹھی دیکھی تو مسکراہٹ تھمی۔

حقیقت نے جیسے دماغ کے چودہ طبق کھول دیے تھے۔

ماہر نے دوبارہ چہرہ اٹھایا۔ وہ دور چلتی جا رہی تھی۔ پہلو میں شاپنگ بیگ اٹھائے جس میں اس کے بچے کے کپڑے تھے۔ وہ بچہ جس کو لے کر وہ یہاں سے چلی جائے گی۔

یہ کشمالہ مبین کی حقیقت تھی۔

اور وہ پھر سے وہی غلطی کر رہا تھا۔ وہ اس کی حقیقت کو بھولنے لگا تھا۔

اور اپنی بھی۔

☆☆☆

ماہر سے اس کی اگلی ملاقات صبح آفس کی لفٹ میں ہوئی۔ وہ باہر نکل رہا تھا اور وہ عجلت میں اندر جانے لگی تھی۔

"ماہر... پولیس کمشنر نے بلایا ہے۔ عالیان کا اسکیچ بنوانے تم چلو گے؟" اس نے چنگیز کی کال کے بعد ماہر کو میسج بھی چھوڑے اور کالز بھی کیں لیکن جواب ندارد۔ اب دکھائی دیا تو چھوٹتے ہی پوچھا۔

"نہیں۔ بزی ہوں۔" وہ اس سے نگاہ ملائے بنا آگے بڑھ گیا۔

"میں پھر... اکیلی چلی جاؤں؟" وہ لفٹ کے دروازوں کے درمیان کھڑی ایڑیوں پہ گھومی کیونکہ وہ مخالف سمت میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

"ہوں۔" سر کو خفیف سا خم دیا۔ مالا نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ وہ ایک دفعہ بھی نہیں پلٹا۔ کان میں ہینڈز فری بھی نہیں تھے۔ شاید اس کی طبیعت خراب ہو۔ یا کسی سوچ میں ہو۔

اور اس کے کام بھی تو بہت ہوں گے۔ وہ فارغ تھوڑا ہی تھا۔ یقیناً سرخ عمارت کا کوئی نیا مسئلہ ہوگا۔ وہ پہلے ہی اس کا بہت وقت لیتی تھی۔ اور اس ملاقات میں ماہر کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ خود کو تسلیاں دیتی لفٹ میں سوار ہوئی۔

دھاتی دروازے آپس میں ملنے سے پہلے مالا نے دیکھا ماہر ایک آرکیٹیکٹ کے کیبن پہ جھکا اس کی اسکرین کو دیکھتا کچھ کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

دیوار گیر کھڑکی سے آتی روشنی باش کو مسار چنگیز کے آفس کو چمکائے ہوئے تھی۔ ٹیبل پر حسب معمول فائلز، کاغذ اور رسیدوں کے انبار لگے تھے۔ فضا میں کولون اور باسی سگریٹ کی مہک تھی۔

چنگیز ریسیور کان سے لگائے مقامی زبان میں کسی سے کچھ کہہ رہا تھا، ایسے کہ ماتھے پہ تیوریاں تھیں۔

دروازہ بجا تو اس نے ریسیور کندھے پہ رکھا اور اُکھڑے انداز میں آجاؤ کہا۔ لیکن دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی نووارد کا چہرہ دیکھ کے اس کے تاثرات بدلے۔ آنکھوں میں استعجاب اترا۔ اپنے کالر سے معذرت کی، ریسیور کریڈل پر واپس رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"ماہر بے؟"

ساتھ ہی اس نے دیوار پہ لگی گھڑی کو دیکھا۔ یہ یقیناً اس کی لنچ بریک کا وقت تھا۔

"کشمالہ خانم کچھ دیر پہلے ہی یہاں سے نکلی ہیں۔" اس نے بیٹھتے ہوئے اچنبھے سے ماہر کو دیکھا۔ وہ کوٹ کا بٹن کھولتے ہوئے کرسی کھینچ رہا تھا۔ چہرہ سنجیدہ اور بے تاثر تھا۔ صبح وہ مالا کے ساتھ اسٹیشن نہیں آیا۔ اور اب اس کے جانے کے بعد آرہا تھا۔ کیوں؟

"ہم نے عالیان نامی شخص کا اسکیچ بنوالیا ہے۔ بلکہ حانم نے خود ہی بنا کے دیا ہے۔ میں اس کے بارے میں انکوائری کھول چکا ہوں۔ جیسے ہی کچھ معلوم ہوتا ہے، بتاؤں گا۔" چنگیز آخر میں "فون پر" کہتے کہتے رک گیا۔

(اسے آنے کی کیا ضرورت تھی؟)

"جانتا ہوں۔" ماہر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

"تم خیریت سے آئے ہو؟ کوئی کام تھا؟"

چنگیز بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"میری سرخ عمارت کی کنسٹرکشن چل رہی ہے، تم جانتے ہو۔ وہ بھی اس موسم میں۔"

چنگیز ہاتھ باہم پھنسائے آگے کو ہوا، تشویش سے اسے دیکھے گیا۔

"اور میرا اوپر نیچے بہت خرچہ ہو چکا ہے۔"

چنگیز کے ماتھے کی لکیریں گہری ہوئیں۔ سینے میں تنگی اٹھی۔

اور میں چھ سو ڈالر بچانا چاہتا ہوں۔"

"یعنی؟"

"میری تھیراپسٹ ایک سیشن کے چھ سو ڈالر لیتی ہے۔"

چنگیز چند لمحے نا سمجھی سے اسے دیکھے گیا۔

"لیکن... تم بنا پیسے لیے میری بات سن سکتے ہو۔"

چنگیز کے ابرو استعجاب سے اوپر اٹھے۔ وہ اسی انداز میں کہے جا رہا تھا۔

"میں کسی اور دوست کے پاس جاتا لیکن تم سے زیادہ اوب جیکٹیوبلی - کوئی بھی میری سچویشن کو نہیں دیکھے گا۔"

"اور میں آبجیکٹو کیوں ہوں گا؟"

"کیونکہ تم مجھے پسند نہیں کرتے، اس لیے بے رحم سچ بول سکو گے۔" ماہر فرید مسکرایا۔

چنگیز چند لمحے آنکھیں چھوٹی کیے غور سے اسے دیکھتا رہا۔ سامنے بیٹھا سوٹ میں ملبوس مسکراتا ہوا آدمی وہی تھا جس کی وجہ سے اسے سارے ڈیپارٹمنٹ کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑی تھی۔ اس نے کورٹ میں اسے نادان ثابت کیا تھا۔ اور پھر اگلے چھ ماہ جب اس کا کیس چلا، تب کیسے چنگیز اس سے نگاہ پھیر کے گزر جاتا تھا۔

لیکن وہ ایک لمحہ جب چنگیز کو محسوس ہوا کہ وہ مالی تنگی کا شکار ہے تو اسے اپنے سینے میں بھی وہی تنگی محسوس ہوئی تھی۔

"اور میں یہ کیوں کروں گا؟" اس نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ اور پھر ماہر کو۔ اس کا وقت تھیراپسٹ سے زیادہ قیمتی تھا۔

ماہر نے جیب سے کچھ نکال کے میز پہ رکھا تو

چنگیز کے چہرے پہ مسکراہٹ اُمڈ آئی۔

"56 کوہیبا بہی کے ـــ" کا باکس سامنے تھا۔ یہ اس برانڈ کے کیوبن سگارز کی بینٹلی تھے۔

جب تک ماہر نے سگارز دونوں کے سامنے رکھے، چنگیز ریسیور اٹھا کے اپنے اسسٹنٹ کو اگلے نوے منٹ تک مخل نہ ہونے کا کہہ چکا تھا۔ اور ساتھ ہی کھڑکی کا شیشہ سلائیڈ کر کے کھول دیا تھا۔ ایسے کہ ٹھنڈی ہوا اندر آنے لگی تھی۔

"کہو جو کہنا ہے۔"

ماہر کا چہرہ اب پہلے جیسا بے تاثر نہیں تھا بلکہ اس پہ شدید ہیجان اور تذبذب تھا۔

"میں سب کے بارے میں درست ہوتا ہوں۔ سوائے اپنے۔"

"بولتے رہو۔" چنگیز نے شعلہ سگار کو دکھاتے ہوئے اسے ہونٹوں کے درمیان رکھا۔ دھوئیں کا مرغولہ تیزی سے اوپر کو اٹھا۔ پھر چھت سے ٹکرا کے وہ کھڑکی کی جانب لپکا۔

دھوئیں کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ اگر کشمالہ وہاں ہوتی تو اسے سخت ناپسندیدگی سے دیکھتی۔ لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ نہ اسے وہاں ہونا چاہیے تھا۔

☆☆☆

پولیس اسٹیشن سے نکل کے وہ سیدھا بس اسٹاپ تک آئی تھی۔ وہاں پہنچ کے یاد آیا کہ اپنا ڈرائیورز لائسنس وہ اسٹیشن میں بھول آئی ہے۔ سیکیورٹی کے لیے ایک اہلکار نے ہر دفعہ کی طرح وہ اس سے لے لیا تھا۔ واپسی پہ وہ اسے لینا بھول گئی۔ وہ اگلی بس لے لے گی، یہ سوچ کے الٹے قدموں واپس آئی۔ اپنا کارڈ لیا، اہلکار کو جتایا کہ اسے یہ بات خود یاد رکھنی چاہیے تھی (جس پہ اس نے ترش انداز میں کندھے اچکا دیے۔) اور جب باہر نکلی تو ایک دم رک گئی۔

پولیس اسٹیشن کے سامنے کارز پارک کرنے کی ایک ہی جگہ تھی۔ اور وہاں کھڑی سیاہ کار اور اس کی نمبر پلیٹ وہ دور سے پہچان گئی تھی۔

ماہر؟ ادھر؟ اس نے فوراً فون نکالا اور دیکھا۔ شاید وہ اس کے پیچھے آیا ہو۔ شاید کوئی پیغام یا مسڈ کال ہو۔ لیکن ندارد۔

یعنی وہ اس کے لیے مصروف تھا۔ اپنے کسی کام سے آیا تھا۔

کشمالہ کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔ واپس بس اسٹاپ تک جاتے ہوئے وہ بل اسی طرح قائم رہے۔

پھر وہ آفس نہیں گئی۔ سیدھی گھر جانے والی بس پکڑ لی۔

گھر؟ اس نے تلخی سے سوچا تھا۔ وہ تو خانہ بدوش تھی۔ لاہور سے مکہ اور وین کوور سے استنبول تک۔ اس کا گھر کہیں نہیں تھا۔ بہت سے کرایے کے مکان تھے اور بہت سے عارضی مکین تھے۔

نشانتشی سے گزرتے ہوئے وہ بس سے اتر گئی حالانکہ یہ اس کا اسٹاپ نہ تھا۔ اسے ایک دکان کے چمکتے شیشوں کے پار بچوں کے جوتے دکھائی دیے تھے۔

بدر کا سائز اسے ازبر تھا۔ وہ جوتا ہاتھ میں پکڑ کے بتا سکتی تھی کہ اسے پورا آئے گا یا نہیں۔ لیکن کیا ان گزرے چار ماہ میں اس کا پیر بڑا ہوا ہوگا؟ کیا اس کے اغوا کاروں نے اس کو خوراک ٹھیک سے دی ہوگی؟ اسے خالص دودھ ملا ہوگا؟ چار ماہ میں اس کا پیر کتنا بڑھ سکتا تھا؟

وہ ایک ایک جوتے کو ہاتھ میں لیے دیکھ رہی تھی۔ کیا وہ جب اسے ملے گا تو ویسا ہی ہوگا؟ کیا وہ اپنے ہی بیٹے کو پہچان جائے گی یا وہ قدیم داستانوں کی طرح چیلنجنگ ـــ بن جائے گا؟ وہ جعلی بچہ جسے پریاں اس کے پنگھوڑے میں اصلی بچے کی جگہ رکھ آتی تھیں۔ وہ چینجلنگ جس کی آنکھوں کی چمک مالیان کی آنکھوں جیسی تھی۔ وہ اسکیچ آرٹسٹ کو

اس کے خدوخال سمجھا سکتی تھی لیکن اس چمک کو لفظوں میں بیان کرنا ناممکن تھا۔

موبائل تھرتھرایا تو اس کے ماتھے کے بل واپس آگئے۔ اس وقت عموماً ماہر ہی کال کر سکتا تھا۔ کیا وہ ظاہر کرے کہ اسے معلوم تھا وہ پولیس اسٹیشن آیا تھا یا....؟

چمکتی اسکرین پہ آتا نمبر "بلاکڈ نمبر" تھا۔ اس کی ساری حسیات جاگ اٹھیں۔

"کون؟" وہ وسط دکان میں کھڑی جوتے ہاتھ میں لیے بالکل ساکت تھی۔

"لگتا ہے تمہیں میری بات پہ یقین نہیں آیا۔" اس کی دھیمی آواز مالا کے کانوں میں گونجی۔

"تم نے ماہر کو حقیقت نہیں بتائی، حالانکہ یہ بدر کا گیٹ آؤٹ آف جیل فری کارڈ تھا۔ چچ چچ..."

"مجھے بالکل بھی یقین نہیں ہے کہ تم اسے چھوڑ دو گے۔ تم صرف مجھے ستار ہے ہو۔"

"کم آن، کزن۔ میں اتنا برا نہیں ہوں۔ اپنے قول کا پابند ہوں۔ تم جیسے ہی ماہر کو بتاؤ گی، میں بدر کو تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ زارا تمہاری کلائنٹ نہیں تھی۔ میں جھوٹی باتیں آگے نہیں پہنچا سکتی۔ میں تمہیں کسی اور طریقے سے تلاش کر لوں گی۔"

"پولیس کو میرا اسکیچ دے کر؟" وہ ہنسا۔ "اگر مجھے اس کا ڈر ہوتا تو ماسک پہن کے تم سے ملتا۔" پھر وہ سنجیدہ ہوا۔ "سنو، مالا.... تمہارے بیٹے کے پاس وقت کم ہے۔ اس کو ضائع مت کرو۔ میں زیادہ دیر اس کا خیال نہیں رکھ سکتا۔ اگر تم نے دیر کی تو میں اس سے چھٹکارا پا لوں گا۔"

جیسے کسی نے اس کا دل پیر تلے کچل دیا۔

"تم..." شدت جذبات سے چہرہ سرخ ہوا۔ "تم... کیا ثبوت ہے کہ وہ زندہ ہے؟"

دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔

"مجھے تمہارے سوال پہ حیرت ہوئی ہے۔ تمہیں ہی سب سے زیادہ یقین تھا کہ وہ زندہ ہے۔ تم کیوں بے یقین ہونے لگیں؟"

"مجھے ثبوت دو کہ وہ زندہ ہے۔ پھر میں کچھ کروں گی۔"

"کیا چاہتی ہو؟ آج کے اخبار کے ساتھ اس کی تصویر بھیجوں تاکہ تم بیک گراؤنڈ میں موجود چیزوں میں سے کلیوز ڈھونڈ کے اس تک پہنچ جاؤ۔ ناں ناں۔ نیٹ فلکس نہیں چل رہا یہاں۔ تمہیں بیٹا چاہیے تو وہ کرو جو میں نے کہا ہے۔ ورنہ نتائج کا ذمہ دار میں نہیں ہوں گا۔"

ٹوں ٹوں سنائی دی اور کال کٹ گئی۔ وہ جوتے ہاتھ میں لیے بھیگی آنکھوں کے ساتھ کھڑی رہ گئی۔

وہ کیسے ماہر اور زارا کے درمیان آسکتی تھی؟

اور کیا گارنٹی تھی کہ عالیان اپنی بات پہ قائم رہے گا؟

وہ واپس اپارٹمنٹ آگئی۔ جوتے نہیں لیے۔ وہ اب بدر کے سائز کے بارے میں پہلے جیسی پر یقین نہیں رہی تھی۔ وہ کسی بھی چیز کے بارے میں پر یقین نہیں تھی۔

یہ اپارٹمنٹ پہلے روز کی نسبت ہرا بھرا لگ رہا تھا کیونکہ ہر کھڑکی میں جہاں جہاں سے سورج جھانکتا، مالا نے وہاں ایک گملا سجا دیا تھا۔ سبز سبز پتے سفید اپارٹمنٹ کو تازگی کا احساس دے رہے تھے۔

اس وقت بھی وہ جگ سے ایک گملے میں پانی ڈال رہی تھی جب ڈور بیل بجی۔

کیا وہ بھی پولیس اسٹیشن سے واپس آگیا تھا؟ کیا وہ اس سے صبح کے رویے کے لیے معذرت کرے گا؟ یا یہ ظاہر کرے گا کہ....

چوکھٹ میں ہلال کھڑی تھی۔ مسکراتے ہوئے ایک ڈسپوزیبل باکس پکڑے۔

"چیز کیک۔ فیضی خانم نے گھر میں بنایا ہے۔ میں تمہارے لیے لے آئی۔"

نیلی جینز پہ ڈھیلا ڈھالا سا سفید سوئیٹر پہنے، لمبے گھنگریالے بالوں والی ہلال مسکرا رہی تھی۔

وہ بھی مسکرادی۔ ہلال کو دیکھ کے ساری کلفت دور ہوگئی۔
"تم چیز کیک بنا سکتی ہو، ہلال؟"
"کیا جن کی آنکھیں نہیں ہوتیں وہ چیز کیک نہیں بنا سکتے ؟"
وہ ہنس دی۔ اب وہ صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھی تھیں، ایسے کہ دونوں کا رخ ایک دوسرے کی جانب تھا۔ باکس وہ فریج میں رکھ چکی تھی یہ کہہ کر کہ بعد میں کھائے گی۔ وہ ہلال کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی لیکن اتنے میٹھے سے اس کے دانے واپس آسکتے تھے۔
"تم اپ سیٹ ہو، مالا؟" کچھ دیر بعد ہلال کے ابرو تشویش سے اکٹھے ہوئے۔ بھوری آنکھیں مالا کے کندھے کے پیچھے دیکھ رہی تھیں۔ کسی دوسری دنیا میں۔
"نہیں۔" وہ پھیکا سا مسکرائی اور آواز کو تازہ دم بنانے کی کوشش کی۔ "بس تھک گئی ہوں۔"
"کنفیوژڈ ہو تم جیسے۔ دو راستوں کے درمیان۔"
مالا پیر اوپر کیے کشن گود میں رکھے بیٹھی تھی۔ گہری سانس لی اور دکھتی کنپٹی دبائی۔
"اگر انسان دو راستوں میں کنفیوژڈ ہو تو کیا کرنا چاہیے؟"
ہلال سادگی سے مسکرائی۔
"جو دل کہے۔ دل سچ بولتا ہے۔"
پھر اس کے چہرے کی جوت بجھ گئی۔
"کیا ماہر بھائی بھی سوزی کو قبول کرے گا؟"
"وہ اسے پہلے ہی قبول کر چکا ہے۔ اور اب تو بیریل اور سوزی واپس آچکے ہیں۔ صبح فلائیٹ تھی نا ان کی؟" ساتھ ہی دل میں گلٹ ابھرا۔ اس کی وجہ سے وہ دونوں الگ اپارٹمنٹ میں نہیں رہ سکتے تھے۔ لیکن خیر.... اگر انہیں الگ رہنا ہوتا تو کہیں کرایے پہ گھر لے لیتے۔ وہ اب دوسرے دفعہ ان کے لیے شفٹنگ نہیں کرے گی۔
"نہیں۔ وہ ان سے خفا ہے۔ صبح جب وہ آئے تو ماہر بھائی ان سے کوئی بات کیے بنا ہی باہر نکل گیا۔ وہ انہیں جب بھی دیکھتا ہے، اس کی انرجی ایک دم بہت کلوزڈ اپ ہو جاتی ہے۔"
مالا نے نرمی سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے۔ وہ ٹھنڈے تھے۔ برف جیسے۔
"ماہر ایڈجسٹ کرلے گا۔ مجھے تو وہ بری نہیں لگی۔ تمہیں کیسی لگی؟"
"میں انسانوں میں برائی نہیں ڈھونڈتی، مالا۔" ہلال اداسی سے مسکرائی۔
مالا چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اس کی کنپٹی کا زخم۔ ٹھوڑی کا نشان۔ وقت کے ساتھ سب مندمل ہو گیا تھا لیکن ختم نہیں ہوا تھا۔
"مجھے ماہر نے بتایا تھا.... تمہاری ماں کے بارے میں۔ اور کس طرح زیاد نے...." اس نے افسوس سے سر جھٹکا۔
"وہ سب ماضی میں ہے، مالا۔"
"تم سے ایک بات پوچھوں، ہلال؟"
"پوچھو۔"
کیا تم کبھی زیاد کو معاف کر سکو گی؟"
اس بات پہ ہلال ہنس مسکرادی۔
"کب کا کر دیا، مالا۔"
کشمالہ نے بے یقینی سے دونوں ابرو اٹھائے۔
"کیا تم نے واقعی اسے معاف کر دیا ہے؟ زیاد اور... اور نگینہ بیگم؟ سب کو؟ ہر اس چیز کے باوجود جو انہوں نے تمہارے ساتھ کی؟"
اس نے سادگی سے سر اوپر نیچے ہلایا۔
"مگر کیوں؟"
"دل بہت چھوٹا سا ہوتا ہے، مالا۔ اس میں پرانی نفرتیں بھرتے رہیں گے تو نئی محبتوں کی جگہ کیسے بنے گی؟"
کشمالہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔
"کیا واقعی انسان اتنے زیاں کے بعد کسی کو معاف کر سکتا ہے؟"
"کر سکتا ہے۔"

"اور جو نہ کر سکے؟"

"جو معاف نہیں کرتے وہ دوسروں کے دیے زخموں سے خود کو بھرتے رہتے ہیں۔ کسی کے گناہ کا بوجھ ہم کیوں اٹھائیں؟"

اس کی پلکوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کے گرنے لگے۔ وہ کچھ کہنے لگی تھی کہ ڈور بیل بجی۔

"ہلال کی کال ہے۔" دروازے پہ فیضی خانم کارڈلیس فون ہاتھ میں لیے کھڑی تھیں۔ مالا نے آنکھیں رگڑتے ہوئے انہیں اندر آنے کا رستہ دیا۔ وہ صوفے تک گئیں اور فون ہلال کو تھمایا۔

"اس نے کہا کہ وہ کچھ دیر بعد دوبارہ کال کرے گا۔ میں واپس جا رہی ہوں۔ میرا کھانا اوون میں ہے۔" وہ عجلت میں باہر نکل گئیں۔

کشمالہ جب تک واپس آ کے بیٹھی تو دیکھا ہلال کے چہرے پہ کچھ بدلا ہوا تھا۔ کارڈلیس سختی سے ہاتھ میں پکڑے وہ بے چین نظر آئی۔

"کس کا فون تھا؟" اس نے غور سے ہلال کا چہرہ دیکھا۔

"ایک دوست کا۔" وہ بڑبڑائی۔

"تمہارے دوست ہیں یہاں، ہلال؟"

ہلال نے جواب نہیں دیا۔ فون پہ اپنی گرفت سخت کر لی۔ اب وہ پیر نیچے اتار چکی تھی، جیسے جانے کو بے تاب ہو۔

"میں اصل میں تمہیں کچھ اور کہنے کے لیے آئی تھی۔" وہ عجلت میں بتانے لگی۔

"مالک ہاسپٹل سے گھر آ چکا ہے۔ اور بیربل بھائی لوگ واپس۔ تو سوزی نے کہا کہ سب کہیں ڈنر کرتے ہیں۔ ماہر بھائی نے مجھے کہا تھا کہ میں تمہیں بھی انوائیٹ کر لوں۔"

"مجھے؟" اس نے سینے پہ انگلی رکھی، حالانکہ وہ اس کی انگلی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"میں کیا کروں گی فیملی ڈنر پہ؟"

"تمہاری موجودگی سے شاید وہ دونوں لڑنے سے باز رہیں۔ ورنہ مجھے ڈر ہے ماہر بھائی ایک دم اس پہ پھٹ پڑے گا۔ پلیز تم ضرور آنا۔"

اسے پچھلے ڈنر کی عجیب و غریب سی کیفیت یاد تھی۔ اور پھر اس دفعہ ماہر نے اسے خود نہیں بلایا۔ ہلال سے کہہ دیا۔ خود بھی کہہ سکتا تھا۔ لیکن صبح سے اس کا رویہ بدلا بدلا سا تھا۔ ایسے میں وہ بالکل بھی ان کے کسی فیملی ڈنر میں شرکت نہیں کرے گی۔

"زارا بھی ہو گی۔"

وہ جو انکار کے لیے الفاظ جمع کر رہی تھی، چونک گئی۔ "زارا بھی ہو گی؟"

"ہاں۔ تم اس سے ملی ہو کیا؟"

اسے زارا سے آخری ملاقات یاد آئی جو عالیان کے فون کے توسط سے ہوئی تھی۔ دو سیکنڈ کی یادگار ملاقات۔

"تم آؤ گی نا، مالا؟"

مالا نے مسکرا کے سر ہلا دیا۔ ہلال منتظر بیٹھی رہی تو وہ جلدی سے بولی۔ "ہاں ہاں۔ میں ضرور آؤں گی۔"

ہلال کارڈلیس فون لیے واپس اپنے اپارٹمنٹ میں آئی۔ فیضی خانم کچن میں مصروف تھیں۔ وہ چپ چاپ بالکونی کا دروازہ کھول کے باہر آ بیٹھی۔

باہر ٹھنڈ تھی۔ سرد ہوا سے بال اڑنے لگے جنہیں وہ بار بار کان کے پیچھے اڑس رہی تھی۔ چہرے پہ بے چینی تھی۔ دفعتاً کارڈلیس فون تھرتھرایا۔ اس نے جلدی سے انگلیوں سے بٹن ٹٹولے۔ کال کا بٹن پریس کیا۔ پھر فون کان سے لگایا۔

"تم نے میرے خط کا جواب نہیں دیا، ہلال۔" ایک سرد مگر ہلکی آواز سماعتوں میں گونجی۔

ہلال شمس کی پیشانی پہ بل پڑے۔

"مجھ سے دور رہو۔ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔" فون نیچے کیا اور بٹن دبا دیا۔ اسے امید تھی کہ وہ دوبارہ بجے گا لیکن وہ بالکونی کی کرسیوں کی طرح سرد رہا۔ سرد اور خاموش۔

کھڑکی کھلی ہونے کے باوجود دھواں پوری طرح سے پولیس کمشنر کے آفس سے باہر نہیں نکل رہا تھا۔ چنگیز پیچھے ٹیک لگائے سگار انگلیوں میں دبائے سوچتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یعنی وہ سب جھوٹ تھا۔ کہ میں مالا سے موو آن کر چکا ہوں۔ میں اسے بھلا چکا ہوں وغیرہ وغیرہ۔"

ماہر نے جھک کے سگار کی راکھ ایش ٹرے میں جھٹکی۔

"جھوٹ تھا۔"

"یعنی تم اسے ابھی تک دل سے نہیں نکال سکے؟"

"نہیں نکال سکا۔"

"اور اب تمہیں ڈر ہے کہ وہ تمہارے اور زارا کے درمیان آجائے گی؟"

"مجھے ڈر ہے کہ ہر چیز پیچیدہ ہو جائے گی۔" اس کی آنکھوں میں شکست تھی اور پیشانی پہ لکیریں۔

"میں زارا کے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں۔"

"کر رہے ہو۔"

ماہر نے ملامتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"کیا؟ بے رحم سچ سننا چاہتے تھے تو سنو، ماہر بے۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ "تم ایک ون وومن مین ہو۔ اس لیے ایک عورت کے ہوتے ہوئے اگر تم دوسری عورت کی طرف متوجہ ہو گے تو تمہارا دل ہمیشہ گلٹ کا شکار رہے گا۔ اس لیے تمہارے پاس صرف دو آپشنز ہیں۔"

چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ پھر ماہر نے بجا ہوا سگار ایش ٹرے میں رکھ دیا۔

"بتاؤ۔" ٹیک لگائے بیٹھا اب وہ جیسے چنگیز کا بے رحم سچ سننے کے لیے تیار تھا۔

"پہلا آپشن۔ مالا سے دور رہو۔ اور زیادہ سے زیادہ وقت زارا کے ساتھ شادی کی تیاری میں صرف کرو۔ دھیان بٹ جائے گا۔ مالا اپنے بیٹے کو لیے بنا یہاں سے وین کو ور جائے یا نہ جائے، تم نے چند ہفتے بعد ویسے بھی لندن چلے جانا تھا۔ تم وہاں چلے جاؤ۔ اپنا گھر سیٹ کرو۔ شادی کی تیاری کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"آنکھ سے اوجھل۔ دماغ سے اوجھل۔" وہ زخمی سا مسکرایا۔

"دوسرا آپشن؟"

چنگیز نے گہری سانس لی اور کندھے اچکائے۔

"دوسرا آپشن تم پہلے سے جانتے ہو۔ میرے پاس اس لیے آئے ہو کہ میں تمہیں کہہ سکوں کہ وہ آپشن آسان ہو گا۔ تاکہ تم اس پہ غور کرو۔"

ماہر کی گردن میں گلٹی سی ڈوب کے ابھری، مگر بولا کچھ نہیں۔

"دوسرا آپشن آسان نہیں ہو گا، ماہر بے۔ تمہارا چچا مرنے والا ہے۔ اس موقع پہ اس کی بیٹی کو چھوڑو گے تو خود کو کبھی معاف نہیں کر سکو گے۔ مالک فرید تمہیں کتنا ہی اپنا بیٹا سمجھے، کتنی ہی محبت کیوں نہ کرے تم سے، وہ اس کی بیٹی ہے۔ اور وہ ہے بھی کافی جذباتی۔" اس نے جھرجھری لی۔ "وہ بہت بری طرح ری ایکٹ کرے گی۔ مالک مر جائے گا۔ اور تم ہمیشہ گلٹ میں رہو گے۔"

"میں مالک کو دکھ نہیں دے سکتا۔" اس کے چہرے پہ شکست لکھی تھی۔ "میں مسلسل گلٹی محسوس کر رہا ہوں۔ رات مجھے مالک اور زارا کے ساتھ ڈنر پہ جانا ہے۔ اور مجھے اپنا آپ مجرم لگ رہا ہے۔"

"شادیوں میں سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ تم نے کچھ سوچ کے ہی زارا سے منگنی کی تھی۔ اب اس کو قائم رکھو۔ چپ چاپ وہی کرو جس سے مالک کو دکھ نہ پہنچے۔"

"یاسمین مجھے یہ مشورہ نہ دیتی۔ وہ مجھے کہتی کہ میں اپنے دل کی سنوں۔" افسوس سے چنگیز کو دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"اسی لیے تم اس کے پاس نہیں گئے۔ اور چھ سو ڈالر کے سگارز لیے میرے پاس چلے آئے۔"

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ چنگیز بھی مسکرا

دیا۔ کمرے میں صرف سگار نہیں جلے تھے۔ بہت سی رنجشیں بھی راکھ ہوگئی تھیں۔

"ویسے..." چنگیز نے سگار نیچے کیا اور سوچتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"بالفرض تم مالک کو دکھ دے کر زارا سے رشتہ توڑ دو..... تب بھی..... کیا مالا اور تم ایک ہو سکتے ہو؟"

ماہر نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے، پھر رک گیا۔ اس کے پاس اس بات کا جواب نہ تھا۔

"کیا اسے تمہارے اندر دلچسپی ہے؟ یا تم صرف اس کا ایک سپورٹ سسٹم ہو جو اس کے بیٹے کی تلاش میں اس کی مدد کر رہا ہے؟"

اس نے سر جھکا دیا۔ سارے جواب واضح تھے۔

"یاسمین خانم تمہیں یہ ضرور کہتی کہ اپنے دل کی سنو۔ لیکن وہ یہ بھی یاد دلاتی کہ دل کی وہاں سنی جائے جہاں دوسری جانب سے فیلنگز برابر کی ہوں۔ مجھے وہ صرف ایک پریشان عورت لگتی ہے جس کے دل و دماغ میں صرف اس کا بچہ ہے۔ ہونا بھی چاہیے۔"

ماہر کھلی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ دھوئیں کے بادل اب کم ہو گئے تھے اور اصلی بادل دکھائی دینے لگے تھے۔

"وقتی طور پہ شاید وہ تم سے اٹیچڈ ہو جائے۔ جیسے انسان ٹرین میں کسی ہم سفر سے ہو جاتا ہے۔ اچھی گپ شپ۔ ہنسی مذاق۔ ایک دوسرے کا خیال کرنا۔ لیکن منزل آنے پہ ہم سفر کو الوداع کہنا بہت آسان ہوتا ہے۔"

"وہ چلی جائے گی اور میں اپنے گلٹ کے ساتھ تنہا رہ جاؤں گا۔"

"اور یاسمین خانم تمہیں یہ ضرور کہتی کہ زارا یا مالا کو چننے کی بجائے اپنا چناؤ کرو۔"

اور ماہر فرید نے سمجھ کے سر ہلا دیا۔ بے رحم سچ تکلیف دہ تھا لیکن سچ تھا۔ وہ اس سے منہ نہیں موڑ سکتا تھا۔

☆☆☆

ٹیکسی نے اسے ریستوران کے سامنے اتارا جہاں ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مالا نے سر اٹھا کے پہلے آسمان کو دیکھا جو صاف تھا۔ اور پھر ریستوران کی گلاس وال میں اپنے عکس کو۔ وہ سادگی سے تیار ہوئی تھی۔ سفید گرم کوٹ کے نیچے لمبا سبز لباس جھلک رہا تھا۔ بال کھلے تھے اور کانوں میں ننھے زمرد تھے۔ سبز رنگ آنکھوں کو مزید اُبھار رہا تھا۔

خود پہ ایک تنقیدی نگاہ ڈال کے کشمالہ دروازے کی طرف بڑھی جب کلچ میں رکھا موبائل تھرتھرایا۔

واٹس ایپ پہ کسی دوسرے ملک کے نمبر سے میسج آیا تھا۔

"تم ہی کہتی تھیں نا کہ ہر شخص کو اس کے حصے کا سچ جاننا چاہیے۔ کیا آج تم فرید لار کے فیملی ڈنر پہ سچ بول پاؤ گی، مائی ڈیئر مالا؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ اس نمبر کے بارے میں چنگیز کو نہیں بتا سکتی تھی، کہ ایسی صورت میں اسے میسج کا اسکرین شاٹ بھیجنا پڑتا۔ اُف۔

وہ ڈنر ہال میں داخل ہوئی تو چہرے پہ جھنجھلایا ہوا تاثر تھا، جسے وہاں بیٹھے لوگوں کی خود پہ اٹھتی نگاہوں کے باعث اسے جلدی سے درست کرنا پڑا۔

چھت سے لٹکتے فانوس اور دیواروں پہ لگے قمقموں کے باعث وہ جگہ خوب روشن تھی۔ عموماً شام کے وقت ریستوران ایسے روشن نہیں ہوتے تھے، لیکن شاید میزبان نے خود ہی ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں روشنی تیز ہو اور سب عیاں ہو جائے۔

طویل میز بھر چکی تھی۔ شاید وہی دیر سے پہنچی تھی۔ سب کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں تو اس نے رسمی مسکراہٹ کے ساتھ سلام کیا۔

سربراہی کرسی پر مالک فرید براجمان تھے۔ وہ مزید کمزور دکھائی دیتے تھے۔ البتہ سوٹ بے شکن تھا اور بال جیل سے پیچھے جمے تھے۔ نگاہ اٹھا کے اسے دیکھا۔ موہوم سا مسکرائے اور کرسی کی طرف اشارہ کیا

جو عین ان کی سیدھ میں تھی۔

میز کی دوسری سربراہی کرسی۔

باوردی بیرے نے کرسی کھینچی، اس نے کوٹ اتارا، جسے بیرے نے فوراً تھام لیا وہ کرسی پر بیٹھی۔ پھر فرصت سے میز پہ موجود نفوس کا جائزہ لیا۔

مالک فرید کے بائیں ہاتھ زارا بیٹھی تھی۔ اس نے کشمالہ سے نگاہ نہیں ملائی تھی۔ وہ فون کان سے لگائے کسی سے بات کر رہی تھی۔ جیسے ورک کال ہو۔ مالا کی گہری نظریں اس سے ہوتی ہوئی بیربل اور سوزی کی طرف اٹھیں جو زارا کے بائیں جانب بیٹھے تھے۔ سوزی نے خوش گوار مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سلام کا جواب دیا اور دوبارہ بیربل باتیں کرنے لگی۔

ہلال نے بھی چہرہ اٹھا کے اس کو سلام کیا۔ پھر سر جھکا دیا۔ اس کی گود میں کوئی کتاب تھی جسے وہ انگلیوں سے پڑھ رہی تھی۔ شاید ڈنر ٹیبلز پہ کتابیں لے آنا اس کی عادت تھی اور کوئی اسے اس بات پہ ٹوکتا نہیں تھا۔

وہ مالک فرید کے دائیں ہاتھ براجمان تھا۔ زارا کی سیدھ میں۔ اپنے موبائل پہ جھکا۔ کشمالہ کے سلام کا جواب اس نے سر کے خم سے دیا تھا لیکن نگاہ نہیں اٹھائی تھی۔

کچھ تھا فضا میں عجیب سا ایک دم ہی اسے افسوس ہونے لگا۔ وہ یہاں کیوں آئی؟ لیکن نہیں۔ اسے آنا تھا۔ اسے زارا کی آنکھوں میں ایک دفعہ دیکھنا تھا۔ تاکہ وہ یہ جان سکے کہ اس روز عالیان کے موبائل پہ دکھائی دینے والی زارا اصلی تھی یا کسی اے آئی کی پیداوار۔

"تمہارے والد اچھے انسان تھے۔ ان کی موت کا بہت افسوس ہوا۔" مالک فرید بے تاثر چہرے اور مشینی انداز میں سوزی سے مخاطب ہوئے، تو وہ جو بیربل سے بات کر رہی تھی، فوراً مؤدب سی ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"بابا کی ڈیتھ بہت اچانک ہوئی۔ بہت بڑی ٹریجڈی۔"

سوزی کے چہرے پہ ملال ابھرا۔ نگاہیں جھکا دیں۔

مالا نے پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے غور سے اس کو دیکھا۔ ٹیبل پہ موجود تمام افراد سیاہ سفید پہنے ہوئے تھے۔ زارا کا ڈریس بھی سیاہ تھا۔ البتہ سوزی نے خون جیسے رنگ کا سرخ لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا کیلی بیگ میز پر جما تھا۔

"تمہاری باقی فیملی...؟" مالک فرید نے سوالیہ انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑا۔ ان کی آنکھیں سوزی کو اسکین کر رہی تھیں۔

"بابا کی ڈیتھ کے بعد ماما بہت ڈس ہارٹ ہوئیں اور امریکہ شفٹ ہو گئیں۔ میرا چھوٹا بھائی بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ چھوٹی سی فیملی ہے میری۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔ پھر ٹیبل پہ موجود افراد کو باری باری دیکھا۔

"لیکن اس فیملی کا حصہ بننے کے بعد اب میری فیملی چھوٹی نہیں رہی۔ مجھے ہمیشہ سے بڑی فیملیز اچھی لگتی تھیں۔"

بیربل نے بھی مسکرا کر اسے دیکھا۔ وہ آج پہلے سے زیادہ معتبر اور سوبر لگ رہا تھا۔ اسے شاید ہی کبھی مالا نے اتنے فارمل ڈنر سوٹ میں دیکھا ہو۔

"تو تمہاری چھوٹی سی فیملی ہم سے ملنے کب آئے گی؟" ماہر نے ایک دم چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا تو سوزین کی مسکراہٹ پھیکی ہوئی۔

"میں نے آپ کو بتایا نا.. ہمارے اس فیصلے سے..." اس نے دانت سے نچلا لب کاٹا۔ "وہ لوگ مجھ سے ناراض ہیں۔" پھر بے اختیار مالک فرید کو دیکھا۔

"میں چاہتی تھی کہ اگر آپ ماما سے بات کریں اور انہیں یہاں انوائیٹ کریں، تو شاید وہ نرم پڑ جائیں۔"

مالک فرید نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ...

"بالکل نہیں۔ یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے۔ اس کو خود حل کرو۔" ماہر نے بات کاٹ دی۔

مالک فرید نے ناگواری سے ماہر کو دیکھا، لیکن بولے نہیں۔

میز پہ عجیب سا تناؤ در آیا تھا۔ جہاں سوزی کے چہرے کی جوت بجھ گئی، وہاں بیربل نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"میں بات کروں گا۔ وہ جب ہم سے ملیں گی تو ٹھیک ہو جائیں گی۔" اس نے نرم آواز میں بیوی کو تسلی دی۔

سوزی نے بے اختیار بیربل کو دیکھا اور مسکرائی تو اس کی آنکھوں میں پانی تھا۔

اس نے انگلی کی نوک سے آنکھ کا کنارہ صاف کیا اور سر اثبات میں ہلایا۔

مالا کی نگاہ زارا کی طرف اٹھی۔ جواب فون نیچے کر چکی تھی۔ وہ اب ماہر کو دیکھ رہی تھی۔ کشمالہ مبین جیسے اس کے لیے غیر مرئی گھڑی پہنے ہوئے تھی۔ اسے دکھائی ہی نہ دی۔

"آپ کا کلینیکل ٹرائل کب شروع ہو رہا ہے؟" سوزی نے مالک فرید سے بات کرنے کی کوشش کی تو ایک دم سب نے چونک کے اسے دیکھا۔

وہ پزل سی ہو گئی۔ فوراً بیربل کی طرف اشارہ کیا۔

"سوری۔ مجھے بیربل نے بتایا تھا۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔"

مالک فرید نے بس ہوں کہہ کے نیپکن اٹھایا اور گود میں بچھانے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔

میز پہ ایک دفعہ پھر سے خاموشی چھا گئی۔ عجیب سی خاموشی۔ ہر شخص جیسے اپنے ہی کسی خیال میں تھا۔

"آپ کا ہنی مون کیسا گزرا؟" ہلال کی مدھم آواز نے خاموشی کو توڑا۔ وہ چہرہ ان دونوں میاں بیوی کی طرف کیے ہوئے تھی۔ مگر وہ اداس لگتی تھی۔ یا کسی تفکر بھری سوچ میں گم۔

"بہت اچھا۔" بیربل قدرے پر جوش سا بتانے لگا۔ وہ کہاں کہاں گئے۔ انہوں نے کیا کیا۔ مونٹینیگرو کا موسم کیسا تھا۔

وہ بول رہا تھا اور مالا بار بار ماہر کو دیکھ رہی تھی۔

کچھ تھا اس کے انداز میں جو بدلا ہوا تھا۔ اس نے ایک دفعہ بھی نگاہ اٹھا کے اسے نہیں دیکھا تھا۔ کیا اس نے کچھ کیا تھا؟ کیا وہ اس سے خفا تھا؟ یا کہیں......

اس کا دل زور سے دھڑکا۔

اوہ نو..... کہیں عالیان نے اس سے رابطہ کر کے کچھ کہہ تو نہیں دیا؟

کیا وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ مالا ایک دفعہ پھر اس سے حقیقت چھپا رہی ہے؟

اتنی مشکل سے وہ دونوں ایک دوسرے پہ بھروسہ کرنے لگے تھے۔ اُف۔

"آپ کو اپنے بیٹے کا کچھ پتا چلا؟"

سوزی نے ایک دم اسے مخاطب کیا تو وہ اپنے خیال سے چونکی۔

سب اس کی طرف متوجہ تھے۔ زارا بھی۔ دونوں کی نگاہ ملی۔

زارا دوبارہ ماہر کو دیکھنے لگی۔ لیکن وہ ایک نظر..... بظاہر بہت پرسکون، لاتعلق سی نظر تھی.....

لیکن وہ نظر اسے سمجھا گئی کہ ان کی دو سیکنڈ کی آخری ملاقات اصلی تھی۔

مالا نے نگاہ ایک بار پھر سوزی کی طرف کی۔ پھیکا سا مسکرائی۔

"میرے بیٹے کا اغوا کار مجھ سے ملنے آیا تھا۔"

سب اسے دیکھ رہے تھے۔ سوائے ماہر فرید کے۔ وہ موبائل سامنے کیے بٹن دبا رہا تھا۔ وہ کن اکھیوں سے اسے دیکھ سکتی تھی۔

"کون؟" مالک فرید چونکے تھے۔

"اس کا نام عالیان ہے اور وہ جادو ٹونے میں ملوث ہے۔ مجھے خود ابھی معلوم ہوا ہے کہ وہ میری ایکس ٹینڈڈ فیملی کا حصہ ہے۔"

"تمہاری فیملی میں بہت زیادہ ہی جادو ٹونا نہیں ہوتا، مالا؟ کبھی ساس... کبھی شوہر... اور کبھی کزن..." زارینہ فرید نے اسے پہلی دفعہ مخاطب کیا۔ دونوں کی نگاہ پھر ملی۔

"ہر فیملی میں ہوتا ہے، زارا۔"

"ہر فیملی میں نہیں ہوتا۔" زارا کی آواز اونچی ہوئی۔ تنبیہی نظریں مالا پہ جمی تھیں۔

"ہوتا ہے۔ ہر فیملی میں ایک شخص ہوتا ہے جو ان چیزوں میں ملوث ہوتا ہے۔ لیکن اس کا راز کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔" وہ اسی سنجیدگی سے زارا کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

زارا کے چہرے پہ سایہ سا لہرایا۔ لیکن اس نے کندھے اچکا کے چہرہ سامنے کرلیا۔

پھر ایک دم وہ مسکرائی اور کھنکاری۔ چمچے کو کانچ کے گلاس سے تین دفعہ ٹکرایا۔

"بائی دا وے... مجھے آپ سب کو کچھ بتانا تھا۔"

ماہر نے چونک کے فون سے چہرہ اٹھایا۔

"بابا اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم شادی کی تاریخ کو پیچھے لے آئیں۔"

ماہر کے ابرو نا سمجھی سے اکٹھے ہوئے۔

"کیا مطلب؟" پہلے اس نے مالک کو دیکھا، پھر زارا کو، جس نے اس کا سوال سنا ہی نہیں تھا۔

"...اور بابا کے کلینیکل ٹرائل شروع ہونے سے پہلے ہماری شادی کا ایونٹ رکھا جائے۔ یعنی آج سے..." اس نے کلائی پر بندھی اسمارٹ واچ دیکھی۔ "دو ہفتے بعد۔"

اور مالا کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ اتنی زور سے کہ سانس آنا رک گئی۔

ماہر نے آہستہ سے فون میز پر رکھا۔ مٹھی بھینچ لی، جیسے وہ بہت ضبط کر رہا ہو۔

پھر جب بولا تو لہجہ دھیما مگر دوٹوک تھا۔

"ہم اس بارے میں بعد میں بات کریں گے، زارا۔"

"شیور۔ ویسے میں نے وینیو پسند کرلیا ہے اور دو ہفتے بعد کی تاریخ میں وہ available (دستیاب) ہے۔" وہ مسکرا کے اسی انداز میں اسے کہہ رہی تھی۔

ماہر نے پھر سے پہلو بدلا۔

"ہم بعد میں بات کریں گے۔" زارا کو دیکھتی اس کی بھوری آنکھوں میں تنبیہہ تھی۔

"یہ تو بہت اچھا فیصلہ ہے۔" سوزین ایک دم سے چہکی۔ "فیملی ویڈنگ۔ سو ایکسائٹنگ۔ زارا... آپ کو جہاں میری ضرورت ہو بتایئے گا۔ وینیو سلیکشن، کیک ٹیسٹنگ... جہاں بھی مجھے ساتھ لے جانا ہو میں..."

زارا نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"I can manage." (میں انتظام کرسکتی ہوں) اور پھر سیدھی ہوگئی۔

سوزی کا چہرہ بجھ گیا۔ اس نے ماہر کو دیکھا۔ شاید وہ اس کے لیے کچھ بولے۔ لیکن اس کا چہرہ تناؤ کا شکار لگتا تھا۔

سوزی کے کندھے ڈھلک گئے۔

"ہم دونوں ساتھ شاپنگ پہ جاسکتے ہیں۔" ہلال کی آواز پہ سوزی نے چہرہ اٹھایا۔ پھر اس کی آنکھوں میں نمی در آئی۔ مسکرا کے سر ہلایا۔ پھر بے اختیار کشمالہ کو دیکھا۔

"آپ بھی ہمارے ساتھ چلنا۔" اس نے جیسے رسماً پیشکش کی۔

مالا نے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"سوری۔ مجھے پولیس اسٹیشن اور دوسرے کاموں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملے گی کہ..." بدقت وہ کہنے لگی کیونکہ سینے میں عجیب سی گھٹن ہو رہی تھی۔ جیسے متلی ہو۔ مگر...

"لیکن دوسروں کے فیملی ڈنرز میں شرکت کے لیے آپ کے پاس بہت وقت ہے۔"

زارا نے اسی مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

"زارا۔" ماہر نے پہلے اسے گھورا... اور پھر... بے اختیار مالا کو دیکھا۔ یہ پہلی دفعہ تھا جب اس نے

اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ سبز لباس والی لڑکی کی رنگت زرد ہو رہی تھی اور وہ شدید غیر آرام دہ دکھائی دیتی تھی۔ کھانا ابھی تک سرو نہیں ہوا تھا اور وہ یوں کنارے پر بیٹھی تھی گویا بھاگ جانا چاہتی ہو۔ زارا کے الفاظ پہ وہ کچھ بول نہ سکی۔ ہونٹ کھولے ہی تھے کہ.....

"میں نے سنا ہے بیربل نے بھی تمہارے ذمے زائد کام لگا دیے۔" مالک فرید کی آواز گونجی۔

ساتھ ہی انہوں نے ایک تنبیہی نظر بیربل پہ ڈالی جو قدرے بجھا ہوا بیٹھا تھا۔ اس بات پہ پھیکا سا مسکرایا اور ممنون نظروں سے مالا کو دیکھا۔

"مجھے معلوم تھا آپ یہ کام انجوائے کریں گی۔" پھر رک کے اضافہ کیا۔ "میرا اسٹاف آپ کو اتنا پسند نہیں کرتا۔ جس کا مطلب ہے کہ آپ نے ان پہ ٹھیک سختی کی تھی۔ اب تک انہوں نے یقیناً آپ کے بہت سارے نام رکھ لیے ہوں گے۔"

زارا کی بات کا اثر زائل ہونے لگا۔ وہ مسکرا دی اور بوتل سے پانی گلاس میں انڈیلتے ہوئے بولی۔

"وہ میرا جیسا بھی نام رکھ لیں، وہ پنو کیو جیسا کیوٹ نہیں ہو گا۔"

پانی کا گھونٹ بھرا۔ پھر گلاس نیچے رکھا تو دیکھا ... سب اس کو دیکھ رہے تھے۔ حتیٰ کہ ماہر بھی۔ بے یقینی سے۔

ایک لمحے کے لیے اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس نے ایسا کیا کہا ہے۔ پھر اس نے بیربل کا چہرہ دیکھا۔ اس پہ نا سمجھی تھی۔

"پنو کیو کون؟"

"یعنی جو تمہارا اسٹاف تمہیں ... " وہ رک گئی۔ ماہر کو دیکھا۔ اس نے بے اختیار ماتھے کو چھوا تھا۔

اور تب اسے احساس ہوا کہ اس نے کیا کر دیا ہے۔

بیربل کا چہرہ ایک دم سفید ہوا تھا۔

"میرے اسٹاف نے میرا کوئی نام نہیں رکھا۔ کبھی بھی نہیں۔" اس نے نیپکن مروڑ کے آہستہ سے میز پر رکھا۔ وہ بے یقینی سے کشمالہ کو دیکھ رہا تھا۔ بنا پلک جھپکے۔

سوزی نے بے اختیار اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ لیکن بیربل نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ایک کانٹا چھری زور سے زمین پر گرے۔

"میں اپنے اسٹاف کے ساتھ کبھی..... کبھی..... (ماہر اور مالک کو دیکھا) روبوٹ یا مشین کی طرح بی ہیو نہیں کرتا۔ میں ان کا خیال کرتا ہوں۔ ان کے ساتھ.....ان کے ساتھ اچھے سے بات کرتا ہوں۔ وہ کبھی بھی.....وہ کبھی بھی میرا کوئی نام نہیں رکھ سکتے۔"

سفید چہرہ اب سرخ ہونے لگا تھا۔

"نہیں... سوری.. میرا مطلب... " وہ گھبرا کے کہنے لگی لیکن وہ نہیں سن رہا تھا۔

"وہ لوگ مجھے ..." بیربل نے تھوک نگلا۔ آنکھیں بھیگنے لگیں۔ "وہ مجھے پنو کیو کہتے ہیں؟ وہ میرے پیٹھ پیچھے میرا نام رکھتے ہیں؟" اس نے گردن موڑ کے باری باری سب کو ملامتی نظروں سے دیکھا۔

"اور آپ سب جانتے تھے۔" وہ کرسی دھکیل کے اٹھا۔

"بیربل... بی...!" ماہر پیچھے سے چلایا۔ لیکن وہ لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل چکا تھا۔

مالا کا چہرہ گلابی ہونے لگا۔ بے اختیار ماہر کو دیکھا۔ ہونٹ سوری میں گول ہوئے۔ لیکن ماہر نے افسوس سے سر دائیں بائیں ہلایا۔

"وہ سینیٹو ہے۔ اس کو ہر بات نہیں کہی جا سکتی۔ وہ سینیٹو ہے۔" اس نے پھر دہرایا۔ یہ وہ پہلی بات تھی جو اس نے مالا کو دیکھ کے کہی تھی۔

سوزی فوراً سے اٹھنے لگی تو ماہر نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔

"تم یہیں ٹھہرو۔" اس کا انداز سخت تھا۔ وہ وہیں رک گئی۔

وہ مالا پہ ایک افسوس بھری نظر ڈال کے اٹھا اور تیزی سے باہر آیا۔

بیربل ریسٹوران کی گلاس وال کے باہر دکھائی

دیا سڑک کنارے، جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ اس نے اپنا کوٹ نہیں پہن رکھا تھا۔ ماہر نے دروازہ کھولا تو سرد تھپیڑا چہرے سے ٹکرایا۔ اس وقت وہ اپنا کوٹ نہیں مانگ سکتا تھا۔ نہ اسے سردی کی پرواہ تھی۔

"اٹس اوکے، بی۔ ہر اسٹاف اپنے مالک کا نام رکھتا ہے۔"

بیربل نے گردن موڑی تو گیلی آنکھوں میں شکوہ تھا۔

"نہ میں کوئی سائیکو پیتھ ہوں، نہ کوئی سخت باس۔ میں ان کا خیال رکھتا ہوں۔ کسی فیملی ممبر کی طرح۔"

وہ دونوں اب آمنے سامنے سڑک کنارے کھڑے تھے۔ اور تاریک گلاس وال میں ان کا عکس بھی ایسے ہی موجود تھا۔

"جس کو جتنے پیسے چاہئیں، دے دیے۔ جس کو چھٹی چاہیے، اس کو ریلیکس کر دیا۔ اور وہ لوگ..." وہ سر دائیں بائیں ہلا رہا تھا۔

"کارپوریٹس کسی کی فیملی نہیں ہوتیں۔ وہ لوگ کام کے لیے آتے ہیں۔ کام کر کے چلے جاتے ہیں۔ تم ان کو پے کرتے ہو۔ آپ کا اسٹاف کبھی بھی آپ کی فیملی نہیں ہوتا۔ نہ بن سکتا ہے۔ سو ان چیزوں پہ اتنا حساس ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک مذاق۔ ہے یہ، بی۔ چلتا رہتا ہے۔"

بیربل نے سر ہلایا۔ گہری سانس لی۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جہاں فیملی ہی آپ کے خلاف ہو جائے، وہاں اسٹاف کا کیا گلہ کرنا۔"

ماہر کے لب بھینچ گئے۔ وہ جانتا تھا بات کس طرف جا رہی ہے۔

ایک سرد سا تناؤ دونوں کے درمیان پھر سے حائل ہو گیا۔

"تم نے دل سے سوزی کو قبول..."

"میں اس بارے میں اگر کچھ بولوں گا تو تمہیں برا لگے گا۔ کیا تم واقعی چاہتے ہو کہ میں کچھ بولوں؟" اس کا لہجہ ایک دم سخت ہو گیا۔

بیربل چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔ درست۔" ساتھ ہی موبائل نکالا۔ ماہر نے چونک کے اسے دیکھا۔ وہ کال ملا کے فون کان سے لگائے ہوئے تھا لیکن دیکھ وہ ماہر کو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں۔

"تم کس کو کال کر رہے ہو؟" اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی۔

بیربل نے جواب نہیں دیا۔ اس کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ سلسلہ کلام جڑ گیا۔

"شیف۔" وہ ماہر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "تم سمیت پورا اسٹاف اس نوکری سے فارغ ہے۔ کل سے کام پہ مت آنا۔ شب بخیر۔" ماہر کو دیکھتے ہوئے اس نے فون نیچے کیا۔

"ٹھیک کہا تم نے۔ یہ میری فیملی نہیں ہے۔ اس لیے حساس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"مت کرو ایسے۔ وہ غریب لوگ ہیں۔ ایسے کسی کو تم نوکری سے نہیں نکال سکتے۔"

مگر بیربل نے چند بٹن دبائے اور ریستوران اسٹاف کی گروپ چیٹ کھولی۔ موبائل چہرے کے قریب لے گیا اور پیغام ریکارڈ کیا۔

"میں تم سب کو جاب سے فائر کر رہا ہوں۔ پورے مہینے کی تنخواہ صبح سے پہلے کلیئر کر دی جائے گی۔ کل سے کوئی بیکری میں داخل نہ ہو۔" فون نیچے کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"اندر سب انتظار کر رہے ہوں۔ چلیں؟"

طنزیہ نگاہ ماہر پہ ڈال کے وہ ریستوران کے اندر چلا گیا۔ ماہر تیزی سے پیچھے لپکا۔

"ڈیلیٹ کرو اپنا میسج۔ کہو یہ ایک مذاق تھا۔ وہ تمہاری ساری بیکری رن کرتے ہیں، بی۔"

وہ لابی میں آگے پیچھے چلتے جا رہے تھے۔

"مگر وہ میری فیملی نہیں ہیں۔" اس کا چہرہ زخمی تھا۔

"یہی ہوتا ہے۔ یہی ہوتا ہے جب تم غلط پارٹنر

چلتے ہو... وہ تمہیں تمہارے اصل سے دور کر دیتا ہے۔"

بیربل نے افسوس سے سر دائیں بائیں ہلایا۔
"تم کبھی اس کو قبول نہیں کرو گے۔ مجھے مزید تمہارا اپروول نہیں چاہیے۔"

وہ ابھی اس بات کا اچھا سا جواب دیتا لیکن ہال کے دہانے پہ اس کے قدم زنجیر ہو گئے۔

مالک فرید کی سیدھ میں سربراہی کرسی اب خالی تھی۔

"مالا کہاں ہے؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔
زارا نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے نہیں سنا۔
سوزی بے اختیار بیربل کی طرف بڑھی تھی۔ جواب خود کو پرسکون کر چکا تھا۔ البتہ مالک فرید نے بغور اسے دیکھتے ہوئے بس اتنا کہا۔

"اسے کہیں جانا تھا۔ کوئی کال آ گئی تھی اسے۔"

ایک دم سے ہال کی ساری رونق ختم ہو گئی۔
وہ کس راستے سے گئی تھی؟ اس نے تو اسے باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کیا وہ ابھی تک ریستوران کے اندر تھی؟ شاید باتھ روم میں؟ اس انتظار میں کہ ماہر اور بیربل سامنے سے ہٹیں تو وہ باہر نکلے؟ اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔ کیا وہ رو رہی ہو گی؟

کیا اسے مالا کے پیچھے جانا چاہیے؟
یا اسے بیکری کے ملازموں کے بارے میں کچھ کرنا چاہیے؟

وہ ہمیشہ کی طرح دو راستوں کے دہانے پہ کھڑا تھا۔

بیرے پکوان ہتھیلیوں پہ اٹھائے ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ ہلال اسے پکار رہی تھی۔ وہ سر جھٹک کے واپس اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ اور آکورڈ ڈنر وہیں سے شروع ہو گیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

☆☆☆

اپارٹمنٹ میں آتے کے ساتھ ہی کشمالہ مبین نے جوتے اور پرس دائیں بائیں پھینک دیے۔ دل بہت خراب ہو رہا تھا۔ بار بار آنکھیں بھر آتیں اور وہ انہیں رگڑ دیتی، جس سے سارا مسکارا بہہ گیا تھا۔

اسے سب سے زیادہ برا کیا لگا تھا؟ وہ لاؤنج میں صوفے پر لیٹ گئی اور چھت پر لٹکتے فانوس کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ یہ ان گزرے برسوں میں بنائی اس کی عادت تھی۔ سیلف چیک ان۔ خود سے پوچھنا۔ اب بھی وہ خود سے پوچھ رہی تھی۔ تمہیں سب سے زیادہ کیا برا لگا ہے، مالا؟

زارا کے الفاظ؟ بیربل کو دکھ دینا؟ ماہر کی سرد مہری؟ یا یہ کہ دو ہفتے بعد وہ زارا سے شادی کر رہا تھا۔

اسے عالیان کا میسج یاد آیا۔ فیصلہ کتنا آسان تھا۔ وہ عالیان کی بات مان کے زارا کا تاش کے پتوں سے بنا گھر بہت آرام سے ملیامیٹ کر سکتی تھی۔ اور اس کے بدلے میں اس کا بیٹا اس کو واپس مل جائے گا۔

لیکن اگر وہ ایسا کرتی تو وہ مالا نہ ہوتی۔
اُف... وہ کیا کرے؟
پھر وہ اٹھی۔ رگڑ رگڑ کے چہرہ دھویا۔ کانوں سے زمرد کے ٹاپس نوچ اتارے اور سویٹ پینٹس اور ہڈی پہن کے گھر سمیٹنے لگی۔ ایک ایک کمرے کا فرش صاف کیا۔ ایک ایک کھڑکی کا شیشہ چمکایا۔ وہ کچن کا کاؤنٹر ٹاپ صاف کر رہی تھی جب گھنٹی بجی۔ دستانے کھینچ کے اتارے۔ جانتی تھی کون ہو گا۔ اس دفعہ وہ درست ہو گی۔

پہلے سنک کا نل کھولا۔ ہاتھ دھوئے۔ چند چھینٹے ہڈی کے اوپر پڑے۔ گھنٹی پھر سے بجی۔ اس نے ہڈی سے ہی گیلے ہاتھ پونچھے اور جا کے دروازہ کھولا۔

وہ چوکھٹ میں کھڑا تھا۔ کوٹ بازو پر تہہ کر کے ڈالا ہوا تھا۔ ساتھ والے اپارٹمنٹ کا دروازہ ابھی ابھی بند ہوا تھا۔ آوازیں آ رہی تھیں۔ بہت سے افراد کے اندر جانے کی جوتے اتارنے کی، وہ سب ابھی ابھی واپس آئے تھے۔

"تم ڈنر چھوڑ کے کیوں آ گئیں؟" وہ تکان

سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہاری فیملی کے درمیان اتنے راز ہوتے ہیں۔ آئندہ نہ میرے ساتھ اپنا کوئی فیملی سیکرٹ شیئر کرنا نہ مجھے اپنے آکورڈ فیملی ڈنرز پہ مدعو کرنا۔" مالا نے چہرہ سپاٹ رکھنا چاہا لیکن وہ سرخ ہوتا گیا اور آواز غصے سے کپکپا گئی۔

وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔

پونی میں بندھے بال اور سویٹ شرٹ کے سینے پہ گیلی انگلیوں کے نشان لیے وہ جیسے بھری ہوئی کھڑی تھی۔

"میری زندگی میں پہلے ہی بہت مسئلے ہیں۔ پلیز ان میں اضافہ مت کرو۔"

"او کے۔" ماہر نے آہستہ سے کہا اور اپنے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

کشمالہ جبین کے سر پہ لگی تلووں پہ بجھی۔

او کے؟ او کے کیا ہوتا ہے؟

پہلے اس نے کل سارا دن اس کے ساتھ عجیب سارویہ رکھا۔ اور اب اتنا بھی نہیں کہا کہ اٹس او کے مالا، ہیر بل والے معاملے میں تمہاری غلطی نہیں تھی۔

او کے؟ صرف او کے؟

اس نے زور سے دروازہ بند کیا۔ بہت سا غصہ اُبل اُبل کے باہر آنے کو بے تاب تھا۔ وہ کاؤنٹر ٹاپ کے ساتھ جا رکی۔ آنکھیں بند کیں۔ چند گہرے سانس لیے۔

اسے غصہ نہیں کرنا تھا۔ اسے اپنی صفائی مکمل کرنی تھی۔

وہ بالکونی میں چلی آئی۔ پہلے دیوار گیر کھڑکیوں کے شیشے پر اسپرے کیا۔ پھر مائیکرو فائبر کپڑے سے انہیں صاف کرنے لگی۔ باہر ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی۔ چند لمحوں میں ہی اس کے ہاتھ جمنے لگے۔ اس وقت صفائی کا فیصلہ....

"تم خود سے کیسے اتنا بڑا فیصلہ کر سکتی ہو؟ اور وہ بھی ایک فیملی ڈنر پہ اناؤنسمنٹ کی صورت میں؟"

مالا کا سارا وجود ساکت ہو گیا۔ بے یقینی سے وہ پلٹی۔ اس کی بالکونی خالی تھی۔ لیکن ہوا مشترک تھی۔ ساتھ والی بالکونی سے آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ قدموں کی آواز۔ جیسے دو لوگ یکے بعد دیگرے باہر آئے ہوں۔

"خود سے کچھ نہیں کیا میں نے۔ بابا کے ساتھ ڈیسائڈ کیا ہے۔"

مالا نے کپڑا مٹھی میں بھینچ لیا۔ بنا چاپ کے وہ اس مشترکہ دیوار تک سرکتی گئی جس نے دونوں بالکونیز کے درمیان پردہ کر رکھا تھا۔ لیکن ہوا تو سانجھی تھی۔ اور آسمان بھی۔ سو وہاں ہونے والی گفتگو یہاں صاف سنائی دیتی تھی۔

"تمہیں پہلے مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ میں بہت سے مسئلوں میں پھنسا ہوا ہوں۔ اگر میں نے جنوری کی تاریخ طے کی تھی تو کسی وجہ سے کی تھی۔"

"تب میں بابا کی بیماری کے بارے میں نہیں جانتی تھی۔" زارا کی آواز میں بھی اتنا ہی غصہ تھا۔

"وہ میرے بابا ہیں۔ کچھ فیصلے مجھے ان کے لحاظ سے لینے پڑیں گے، ماہر۔ کلینیکل ٹرائل میں جانے کے بعد ہمیں نہیں معلوم ان کی حالت کیا ہو گی۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ اس شادی کو اپنے ہوش و حواس میں دیکھ سکیں۔ نہ کہ بعد میں جب وہ.... جب وہ...." اس کی آواز بھیگنے لگی۔

"تم مجھ سے بات کر سکتی تھیں۔" مردانہ آواز دھیمی ہوئی۔

"بات کرنا چاہتے ہو تو پہلے میری بات سنو۔"

مالا سانس روکے دیوار سے پشت لگائے کھڑی تھی۔ وہ اگر اس وقت اندر جاتی تو کھڑکی سلائیڈ کر کے کھولنی پڑتی۔ آواز سے وہ دونوں سمجھ جاتے کہ ساتھ والی بالکونی میں کوئی موجود ہے۔

"تم نے اسے ساتھ والے اپارٹمنٹ میں کیوں لا بسایا ہے؟"

"مالا؟ اس کا کیا تعلق ہے اس سب سے؟"

"میں اس سے ان کمفر ٹیبل ہوں، ماہر۔ وہ سارا دن آفس میں تمہارے ساتھ ہوتی ہے۔ میں نے کہا

"اٹس او کے۔ لیکن اب وہ گھر میں بھی تمہارے ساتھ ہوگی۔"

"زارا.... اس کا بیٹا..."

"اس کا بیٹا... اس کا بیٹا... کب سے ایک ہی بات سن رہی ہوں میں۔ مجھے اب یقین بھی نہیں ہے کہ اس کے بیٹے کو کچھ ہوا بھی ہے۔" وہ زور سے چلائی تھی۔ "وہ ساتھ والے اپارٹمنٹ میں کیوں رہتی ہے؟ وہ ہمارے فیملی ڈنرز میں کیوں شریک ہوتی ہے؟"

"تم اس سے اِن سیکیور کیوں ہو رہی ہو؟"

"کیونکہ تم دونوں کی ایک ہسٹری ہے۔ جانتی ہوں میں سب۔" وہ پھنکاری۔

چند لمحے کی خاموشی۔

وہ دم سادھے کھڑی رہی۔ پیروں سے سردی گھستی سارے وجود کو منجمد کر رہی تھی۔

"تمہیں کیا لگا تھا، زارا کو کچھ نہیں معلوم؟ سب جانتی ہوں میں۔"

اسے کرسی کھینچنے کی آواز آئی۔ دونوں میں سے کوئی ایک بیٹھا تھا۔

"میری اور اس کی کوئی ہسٹری نہیں ہے۔ وہ مختلف حالات تھے، زارا۔ ہم دونوں موو آن کر گئے تھے۔ اور اب... اب وہ وہ مجبوری کے تحت یہاں آئی ہے۔ ہم اچھے ایکیوئنٹیس ہیں۔ اچھے دوست۔ تمہارا بھی تو ایک زمانہ دوست ہے۔ مگر مجھے تم پہ بھروسہ ہے۔ اس لیے اعتراض نہیں کرتا۔" وہ آہستہ آواز میں کہہ رہا تھا جیسے تھک گیا تھا۔

"ہلکا مت لو مجھے۔"

"زارا... "اس کی آواز دھیمی مگر دوٹوک تھی۔ "اگر تم... اس سے اتنی اِن سیکیور ہو.... تو ہم اس رشتے کو یہیں ختم کر دیتے ہیں۔ میں ایسے نہیں چل سکتا۔"

خاموشی۔ خوفناک سرد خاموشی۔

"کل گیارہ بجے ...وینیو مینیجر کے ساتھ میری اپائنٹمنٹ ہے۔" وہ گہرے سانسوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔

"زارا... میں کچھ اور کہہ رہا ہوں۔"

"نہیں، ماہر۔ اب تم میری سنو گے۔ ساری زندگی میں نے تمہاری سنی ہے۔ ایک عرصہ تم دونوں بھائیوں نے میرے باپ کو اپنا دشمن سمجھا ہے۔ اب ڈیتھ بیڈ پہ تم میرے باپ کو تکلیف نہیں دو گے۔ صبح گیارہ بجے۔ تمام؟" ٹھک ٹھک دور جاتے قدم۔ دروازہ سلائیڈ ہونے کی آواز۔ پھر بند ہونے کی ٹھاہ۔

وہ دیوار سے لگی دھیرے دھیرے ٹھٹھر رہی تھی۔ ہونٹ جامنی پڑ رہے تھے۔ وہ اس کنٹینر میں تھی۔ ہاتھ پیر زنجیروں میں تھے۔ اور سردی بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر دروازہ دھیرے سے سلائیڈ ہوا۔ پھر آرام سے بند ہوا۔ لاک کی آواز۔ پھر خاموشی۔

وہ اندر چلا گیا تھا۔ اس کے لبوں سے گہری سانس خارج ہوئی اور دھوئیں کی صورت اوپر اٹھ گئی۔

"گیارہ بجے!" وہ لاؤنج میں ہیٹر کے سامنے کھڑی ہاتھ رگڑتی کانپ رہی تھی۔

"صبح گیارہ بجے۔" اس نے خود سے دہرایا۔

اسے معلوم تھا اسے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

ماہر فرید نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ وہ گیارہ بج کے دس منٹ بجا رہی تھی۔

اس نے ہاتھ نیچے کیا اور بظاہر پوری توجہ سے سامنے دیکھا۔

ایک سرد اور روشن صبح ان کے آس پاس پھیلی تھی۔ قدموں تلے تاحد نگاہ گھاس تھا۔ ایک قلعے جیسی اونچی عمارت سامنے تھی۔ اور بہت سے باوردی ملازم کام کرتے اندر باہر آ جا رہے تھے۔

وہ کھلی فضا تلے بچھی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ زارا اس کے ساتھ تھی اور وینیو مینیجر سامنے۔ درمیان میں میز پر بہت سے سیمپل رکھے تھے۔ نیپکن۔ نیپکن رنگز۔ پھولوں کی اقسام۔ ربن۔ ربن کس چیز کے لیے تھے؟ اس نے سوچتے ہوئے زارا کو دیکھا جو

پر جوش سی ہاتھ ہلاتے ہوئے مینیجر کو کچھ سمجھا رہی تھی۔ مینیجر مسکراتے ہوئے سر ہلا کے سن رہی تھی۔ چند چیزیں نوٹ بھی کرتی جا رہی تھی۔ مینیجر کی آنکھیں لانبی تھیں۔ بادامی شکل کی۔ گال کی ہڈی اونچی اور ہونٹ بھرے بھرے۔ ماہر نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا۔ پھر زارا کو۔ ان دونوں کی شکل ملتی تھی۔

اس نے ٹائی کی ناٹ ہلکی سی ڈھیلی کی۔ پہلو بدلا۔ گھڑی دیکھی۔ (یہ ربن کس چیز کے لیے تھا؟)

"آپ کی رنگوں کے حوالے سے ترجیحات؟" مینیجر اب ماہر کو مخاطب کیے ہوئے تھی۔ وہ جبراً مسکرایا اور ابرو سے زارا کی طرف اشارہ کیا۔ پھر دائیں طرف دیکھنے لگا۔ زارا نے ایک سلگتی نگاہ اس پہ ڈالی اور واپس مینیجر کی طرف متوجہ ہوئی۔ کل رات کی لڑائی کے زخم ابھی باقی تھے۔

دائیں جانب سے ایک دوسرا ایونٹ مینیجر ایک کپل کے ساتھ چلتا آ رہا تھا۔ گھاس پر قدم بڑھاتے ہوئے وہ ہاتھوں کے اشارے سے ان کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ ماہر کی نگاہ اس جوڑے کی متوقع دلہن پہ جا ٹکی۔ گال کی اونچی ہڈی۔ بادامی آنکھیں۔ کس کے بنائی اونچی پونی ٹیل۔ اس کی شکل بھی ویسی ہی تھی۔ زارا جیسی۔ مینیجر جیسی۔

وہ خوب صورت چہرہ اب بہت عام ہو چکا تھا۔ عام اور سستا۔

اس نے پھر سے پہلو بدلا۔ مسکراہٹ اب مکمل عنقا ہو چکی تھی۔

"جیسے ہی آپ ڈیپازٹ کروا دیں گے میں وینیو... "اس نے مینیجر کو کہتے سنا۔ ڈیپازٹ کے لفظ پہ وہ ایک دم سیدھا ہوا۔

زارا بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں اشارہ کیا۔

"ڈیپازٹ؟"

"میں ابھی ڈیپازٹ نہیں جمع کرواؤں گا۔ پہلے ہم شادی کی ڈیٹ ڈسکس کریں گے۔"

زارا کے لب بھنچ گئے۔ "ہم کل رات ڈسکس کر چکے ہیں۔"

"نہیں۔ کل رات ہم نے یہ طے کیا تھا کہ ہم گیارہ بجے یہاں ملیں گے۔ میں آ گیا ہوں۔ لیکن ڈیٹ وہی ہوگی جو ہم نے پہلے طے کی تھی۔ جنوری۔"

زارا نے مینیجر کو دیکھا جو دونوں کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اور مسکرا کے آواز کو دھیما کر کے کہا۔

"آپ ہمیں ایکسکیوز کریں گی؟"

اس کے اٹھ کے جانے کے بعد وہ اس کی طرف گھومی۔ ضبط سے گہرے سانس لیے۔ وہ اسی طرح پر سکون ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

"ماہر... "وہ بولی تو لہجہ نرم تھا۔ "میں یہ بابا کے لیے کر رہی ہوں۔ میری پوزیشن سمجھو۔"

"تمہیں اس وقت ان کے ساتھ ہونا چاہیے۔ کلینکل ٹرائل تکلیف دہ عمل ہوتا ہے۔ تمہیں شادی میں مصروف ہونے کے بجائے ان کو وقت دینا چاہیے۔"

وہ لب بھینچے اسے دیکھے گئی۔

"میں تب تک ڈیپازٹ نہیں جمع کروں گا جب تک یہ میرا فیصلہ نہیں ہوگا۔ تم مجھے بچپن سے جانتی ہو۔ تم ماہر کو کسی کام کے لیے مجبور نہیں کر سکتیں۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"اگر تم ڈیپازٹ نہیں دو گے تو میں دے دوں گی۔"

"پھر چودہ دن بعد تم یہاں اکیلی کھڑی ہو گی۔" وہ کوٹ کا بٹن بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ گھاس پر چلتی متوقع دلہن قریب آ رہی تھی۔ وہ کسی بات پہ ہنستے ہوئے اپنے منگیتر سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کا سائیڈ پوز بالکل زارا کے جیسا تھا۔ ماہر نے پھر سے ٹائی ڈھیلی کی۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" زارا نے بیٹھے بیٹھے گردن اٹھا کے اسے دیکھا تو اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"میں اس طرح جذباتی فیصلے نہیں کر سکتا۔ مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم تاریخ کے بارے میں سوچ..."

"مجھے اس رشتے کے بارے میں سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔"

وہ پلک تک نہ جھپک سکی۔

"اگر میری حیثیت اس رشتے میں صرف چیک کاٹنے والے ٹرونی ہزبنڈ کی ہے تو مجھے وقت چاہیے، زارا۔" وہ ایک شکوہ کناں نگاہ اس پہ ڈال کے پلٹ گیا۔ زارا بھیگی آنکھوں سے اسے گھاس پہ دور جاتے دیکھے گئی۔ سب کچھ اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

کشمالہ نے کلائی اونچی اٹھائی۔ گھڑی سوا گیارہ بجا رہی تھی۔

سامنے مالک فرید بیٹھے تھے۔ اسی کرسی پہ۔ اسی گھاس پہ۔ اسی کاٹیج کے باغیچے میں جس کے ساتھ سمندر کا پانی ٹھاٹھیں مارتا ہوا ٹکرا رہا تھا۔

اس دن کی نسبت موسم بہت سرد تھا۔ وہ بھورا کوٹ پہنے ہوئی تھی اور ہوا سے بال بار بار پیچھے کو اڑ رہے تھے۔ سر پہ ٹوپی تھی جو اس کے اپنے سائز کی تھی۔ اور اس پہ کوئی پوم پوم نہیں لگا تھا۔

"کل والے واقعے میں تمہاری غلطی نہیں تھی۔" وہ اسی میکانکی انداز میں کہہ رہے تھے۔ انہوں نے کوٹ کے اوپر شال بھی لے رکھی تھی اور سفید بال اُونی ٹوپی میں چھپے تھے۔ وہ آج، کل رات سے بھی زیادہ کمزور لگ رہے تھے۔ اور اس گھر میں آتے ہوئے مالا کو لونگ روم میں ایک وہیل چیئر بھی دکھائی دی تھی۔ شاید ان کے ذاتی وقار نے ابھی تک اس وہیل چیئر کو استعمال کرنا گوارا نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ سمجھ سکتی تھی کہ یہ ان کا مستقبل تھا۔

"بیربل کچھ زیادہ ہی حساس ہے۔ اوپر سے وہ جس لڑکی کو اٹھا لایا ہے..."

"میں اس بارے میں بات کرنے نہیں آئی۔" وہ تیزی سے بولی۔ اسے اپنی بات زارا کے واپس آنے سے پہلے مکمل کرنی تھی۔ اس سے بہتر موقع اس کو نہیں ملے گا۔

"اگر تم زیاد کے بارے میں..."

"آپ جادو پہ یقین رکھتے ہیں؟"

مالک فرید کے چہرے پہ ہلکی سی اکتاہٹ ابھری۔ سر افسوس سے دائیں بائیں ہلایا۔

"بالکل بھی نہیں۔"

وہ گھر ایک چٹان پہ بنا تھا۔ باغیچے کے دہانے پہ کھائی تھی۔ اور نیچے سمندر کی لہریں زور و شور سے چٹان سے ٹکرا رہی تھیں۔ ایسے میں مالا کو اپنی آواز اونچی کرنی پڑی۔

"لیکن جادو ایک حقیقت..."

"جادو کچھ نہیں ہوتا۔ سوائے ایک اسکام کے۔ یہ کسی کی زندگی یا قسمت نہیں بدلتا۔"

مالا کی نگاہ ان کی ہتھیلی کی پشت پہ لگے کینولا پہ جا ٹکی۔

"اور اگر تم کہنا چاہتی ہو کہ میری بیماری کسی جادو کا نتیجہ ہے تو اپنے الفاظ بچا کے رکھو۔" وہ جیسے ڈانٹ کے بولے تھے۔

البتہ کشمالہ مبین کے ابرو چونکنے والے انداز میں اٹھے۔ وہ آگے کو ہوئی۔

"یعنی آپ کو شک ہے کہ آپ کی بیماری کسی جادو کا نتیجہ ہے۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔"

مالا نے سوچتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا۔ لاؤنج کی دیوار گیر کھڑکی کے اندر کھڑا اعمار غور سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کو وہاں دیکھتا پا کے اس نے گردن موڑ لی۔ مالا واپس ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"یعنی آپ کو علامتیں نظر آئی ہیں؟ خون کا گرنا۔ برے خواب۔ کچھ تو دکھائی دیا ہے آپ کو، مالک صاحب۔"

مالک فرید نے بے زاری سے شانے اچکائے۔

"میں پھر بھی جادو پہ یقین نہیں رکھتا۔ ہر چیز کی

ایک لوجیکل وجہ ہوتی ہے۔ میری کھڑکیوں پر آنے والے خون کے قطرے کسی زخمی پرندے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ یہاں اکثر پرندے کھڑکیوں سے ٹکرا کر مر جاتے ہیں۔ برے خواب اور سلیپ پیرالائیسز سب کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اگر تم مجھے جادو کے بارے میں کنوینس کرنے آئی ہو تو اپنا وقت ضائع کر رہی ہو۔"

"آپ جادو پر یقین نہیں رکھتے۔ جادوگروں پہ رکھتے ہیں؟"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئے۔

"یہ ایک پوری انڈسٹری ہے اسکامرز کی۔ وہ پیسے لے کر ظاہر کرتے ہیں کہ وہ کسی پہ جادو کر رہے ہیں۔ پلیسبو افیکٹ۔" یہ آخری لفظ ادا کر کے وہ گردن موڑ کے دور افق کو دیکھنے لگے۔

وہ جانتی تھی اس لفظ سے ان کا ذہن کس طرف گیا ہے۔ اس کا بھی وہیں گیا تھا۔ کلینیکل ٹرائل۔ کیا ان کو لگنے والی دوا اصلی ہوگی یا بے ضرر دوا؟ کیا جس ٹرائل سے وہ سب اتنی امیدیں لگائے ہوئے تھے، وہاں ان کو دوا کی جگہ پانی لگایا جائے گا؟

"یعنی آپ یہ مانتے ہیں کہ جادوگر وجود رکھتے ہیں، جیسے کہ عالیان، جس کے بارے میں کل میں نے آپ کو بتایا تھا۔"

مالک نے اب کے جیسے بیزاری سے اسے دیکھا۔

"ظاہر ہے وہ ایک اسکامر ہے اور اپنے کلائنٹس کو دھوکہ دے کر پیسے بٹور رہا ہے۔ شاید اسے لگتا ہو کہ وہ لوگوں کی زندگیوں کو خراب کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ لیکن میں بالکل بھی یقین...."

"زارا عالیان کی کلائنٹ ہے۔"

مالک فرید کے الفاظ لبوں میں ٹوٹ گئے۔ وہ چند لمحے پلک جھپکے بنا اس کو دیکھے گئے۔

پھر ٹانگ سے ٹانگ ہٹائی۔ کمر سیدھی کی۔ آنکھیں چھوٹی کر کے غور سے اسے دیکھا۔

"کیا تم میری بیٹی زارا کی بات کر رہی ہو؟"

"آپ کی بیٹی کی بات ہے اسی لیے صرف آپ سے کر رہی ہوں۔"

سمندر کی آوازیں اور بگلوں کا شور ختم ہو چکا تھا۔ پتھروں نے جیسے چٹانوں سے سر پٹخنا چھوڑ دیا۔ سب دم سادھے سننے لگے۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" ان کی آواز ہلکی تھی۔

"عالیان مجھ سے اس روز ملا۔ یعنی وہ نوجوان جس نے اپنا نام عالیان بتایا اور کہا کہ میرا بیٹا اس کے پاس ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی کہا کہ زارا اس کی کلائنٹ ہے۔ بہت دفعہ اس کے پاس آئی ہے۔ اس کو پیسے دیے ہیں۔ ماہر سے شادی کا جادو کروانے کے لیے۔ عالیان کا کہنا تھا کہ اس نے ماہر کے اوپر جادو نہیں کیا۔ بلکہ آپ کو بیمار کر دیا۔ تاکہ ماہر جذباتی طور پہ مجبور ہو کے زارا سے شادی کر لے۔" وہ بالکل عام سے انداز میں کہے جا رہی تھی۔ اس نے سارا رستہ ٹیکسی میں اس تقریر کی مشق کی تھی۔ لیکن مالک فرید کی آنکھوں میں دیکھ کر ان کی بیٹی کے بارے میں یہ کہنا آسان نہیں تھا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا اور ہاتھ سختی سے بیگ پر جمے تھے۔ اگر انہوں نے عمار کو حکم دیا کہ وہ اس لڑکی کو گھر سے نکال دے تو وہ اس کے لیے تیار تھی۔

"عالیان چاہتا ہے کہ میں یہ بات ماہر کو بتا دوں اور اس کے بدلے میں وہ میرے بیٹے کو واپس کر دے گا۔ اس نے مجھ سے کوئی تاوان نہیں مانگا۔ صرف یہ عجیب سا مطالبہ رکھا۔"

"تم نے ماہر کو کیوں نہیں بتایا؟" ان کا چہرہ روبوٹ جیسا تھا۔ بے تاثر۔ وہ غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ مالا کو لگا وہ اسے اندر تک اسکین کر رہے ہیں۔

"کیونکہ مجھے عالیان کا مقصد نہیں معلوم۔ ایسی بات ماہر کو بتانے کا ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے۔ اس کی زندگی میں شر پیدا کرنا۔ اور میں شر پیدا کرنے والی نہیں ہوں۔"

وہ آنکھوں چھوٹی کر کے اسے دیکھے گئے۔ پھر

دوبارہ ٹیک لگائی تھی اور ٹانگ پر ٹانگ جمائی تھی۔
کیا انہیں اس کی بات کا یقین آیا تھا؟
"اور... اور مجھے نہیں معلوم یہ بات سچ ہے یا جھوٹ۔ اگر جھوٹ ہے تو میں ماہر اور زارا کے درمیان نہیں آنا چاہتی۔ اور اگر سچ ہے تو یہ میرا راز نہیں ہے۔ اس کو کھولنے کی ذمہ داری بھی مجھ پر نہیں ہے۔"
"مجھے کیوں بتا رہی ہو؟"
"کیونکہ میں بہت عقل مند نہیں ہوں، مالک صاحب۔ میں ہمیشہ درست فیصلے نہیں کرتی۔ میں انسانوں کو پڑھنے میں بھی اچھی نہیں ہوں۔ لیکن میں جھوٹ نہیں بولتی۔ میں باتیں سچی اور صاف کرنے کی قائل ہوں۔ آپ نے خود ہی کہا تھا کہ میں بہادر ہوں۔" وہ گردن میں جھولتی فاختہ کو انگلیوں میں لپیٹ رہی تھی۔ "اور میں اس راز کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ میں ماہر کو بتا کے عالیان کا مقصد بھی پورا نہیں کر سکتی۔ نہ مجھے اس کے ہاتھوں بلیک میل ہونا ہے۔"
وہ اسی طرح آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے اسے دیکھے گئے۔ ان کے رعب، ان کی ایکس رے کرتی نظریں، اور ان کے خوف کے باوجود وہ گردن اکڑائے کہہ رہی تھی۔
"مجھے نہیں معلوم مجھے اس انفارمیشن کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔ لیکن اگر عالیان زارا کے ساتھ کوئی دشمنی نکالنا چاہتا ہے تو اس کا حل بھی صرف آپ کے پاس ہوگا۔ میں اس راز کو کسی امانت کی طرح آپ کے حوالے کرنے آئی ہوں۔ حقیقت کیا ہے، اس کو جاننا آپ کی ذمہ داری ہے۔ لیکن میں... میں ایک ماں ہوں۔" اس کی آنکھیں پانی سے بھرنے لگیں۔
"میرا بچہ اس آدمی کے پاس ہے۔ اور وہ بار بار مجھ سے ایک ہی ڈیمانڈ کر رہا ہے۔ میں اب تھک گئی ہوں۔ اسی لیے میں آپ کے پاس آئی ہوں۔" اس نے انگلیوں کی پشت سے آنکھیں رگڑیں۔ گیلی سانس ناک سے اندر کھینچی۔
"میری باتیں آپ کو تکلیف پہنچائیں گی۔ مگر آپ جادو پہ یقین نہیں رکھتے۔ اس لیے آپ کو شاید اپنی بیماری والی بات سے کوئی فرق نہ پڑے۔ ہو سکتا ہے یہ سب جھوٹ ہو۔ عالیان نے زارا کو صرف اسکام کیا ہو۔ لیکن ایک چیز حقیقت ہے۔ اس نے میرے سامنے زارا کو کال کی تھی.... ویڈیو کال.... اور میں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ میں بس اتنا جانتی ہوں۔" اس کے گھٹنوں سے جان نکل چکی تھی۔ دل زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ بیگ پکڑے اٹھ کھڑی ہوئی۔
مالک فرید نے گردن اٹھا کے اسے دیکھا۔ ان کا روبوٹ جیسا چہرہ بے تاثر تھا۔
کیا وہ شاک میں تھے.... یا حیرت زدہ تھے؟
وہ کبھی ان کا چہرہ پڑھ نہیں سکتی تھی۔
"آئی ایم سوری۔ اگر اس بات سے آپ کو دکھ پہنچا ہے تو اس کے لیے بھی میں معافی مانگتی ہوں۔ میں غلط موقع پہ سچ بول دیتی ہوں ہمیشہ۔ اور میرا سچ ہمیشہ دوسروں کو تکلیف دیتا ہے۔ لیکن میں خود کو نہیں بدل سکتی۔ میرا ماننا اب بھی یہی ہے کہ ہر انسان کو اس کے حصے کا سچ معلوم ہونا چاہیے۔ میں... میں چلتی ہوں۔" ان کی طرف دیکھے بنا وہ تیزی سے قدم اٹھانے لگی۔ گھاس گیلی تھی۔ جوگرز کے کنارے گدلے ہونے لگے۔ وہ تیزی سے گھر کے اندر آئی اور جوتوں سمیت چلتی راہداری عبور کر کے باہر نکل گئی۔
عمار نے غور سے اس کو جاتے دیکھا۔ پھر سیدھا مالک فرید کے پاس آیا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ نگاہیں باغیچے کی سفید باڑ پہ جمی تھیں۔
وہ چپ چاپ ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ وہ خاموش رہے تو وہ کھنکھارا۔
"سر؟ مس زارا نے کہا تھا کہ اگر یہ لڑکی دوبارہ گھر آئے تو انہیں انفارم کروں۔"

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم اسے نہیں بتاؤ گے۔"

اس نے سر کو جنبش دی۔ وہ ابھی تک باغیچے کی باڑ کو دیکھ رہے تھے جہاں ایک بگلا آ بیٹھا تھا۔ اس کے پنجے بار بار پھسلنے لگتے، لیکن وہ بدقت نوکیلی لکڑی پہ اپنا توازن برقرار رکھے ہوئے تھا۔ نگاہیں مالک فرید کی میز پر رکھے بسکٹس پہ تھیں۔

"تم نے دو دفعہ مجھے آگاہ کیا تھا کہ زارا کمپنی کے فنڈز سے ہر مہینے ایک خطیر رقم نکال رہی ہے۔"

عمار نے سر اثبات میں ہلایا۔

"یس، سر۔ وہ ہمیشہ کیش لیتی ہیں۔"

"اور وہ اس کیش کا کیا کرتی ہے؟"

"آڈٹ میں ان سے پوچھا گیا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ وہ بیگز خرید رہی ہیں۔ انہوں نے تمام رسیدیں اور بلز دکھا دیے تھے۔"

"کیا اس نے یہ رقم منگنی کے بعد نکالنی شروع کی تھی؟"

"نہیں۔ اس سے بھی کئی ماہ پہلے سے۔ میں آپ کو تمام تاریخیں..."

"تم نے کسی عالیان کا نام سنا ہے؟" وہ اسی بگلے کو دیکھ رہے تھے۔

عمار چونکا۔ ابرو اکٹھے ہوئے۔ اس نے موبائل نکالا۔ چند بٹن دبائے۔

"پچھلے سال زارا نے مجھے اس شخص کو ڈھونڈنے کا کہا تھا۔ میں نے پرائیوٹ انویسٹی گیٹر بھی ہائر کیا لیکن یہ نہیں ملا۔ یہ کوئی بچہ تھا جو کئی سال پہلے مر گیا تھا اور..."

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔" مالک فرید نے ہاتھ سے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ ابھی تک بگلے کو دیکھ رہے تھے جو توازن قائم کرتا ہوا باڑ سے گر گیا تھا۔ پھر گھاس پہ جلدی سے سنبھلا اور ڈرتے ڈرتے ان کی میز کے قریب آنے لگا۔ وہ لنگڑا کے چل رہا تھا۔

☆☆☆

لائبریری کے ریکس خاموشی سے اپنے اندر بہت سی داستانیں سمیٹے کھڑے تھے۔ دائیں بائیں میزیں بچھی تھیں۔ ٹیبل لیمپس جلے تھے اور بہت سے جھکے سر کتابوں میں غرق تھے۔

ایسی ہی ایک میز پہ ہلال بیٹھی تھی۔ ایک کتاب کھولے وہ انگلیاں صفحے پر لکیر در لکیر پھیرتی جا رہی تھی۔ آنکھیں میز پہ کسی غیر مرئی نقطے پہ جمی تھیں۔ قریبی میز پہ اس کا گارڈ قدرے بیزار بیٹھا تھا۔ موبائل پہ کوئی گیم کھیلتے ہوئے وہ گاہے بگاہے نگاہیں اٹھا کے ہلال کو دیکھ لیتا۔ پھر واپس اسکرین پہ جھک جاتا۔

دفعتاً گیم کی اسکرین پہ کال آنے لگی۔ نام دیکھ کر گارڈ اشتیاق سے مسکرایا۔ ایک نظر ہلال کو دیکھا جو اپنی بریل کتاب میں مصروف تھی۔ گارڈ چپ چاپ اٹھا اور ہینڈز فری کانوں میں ٹھونستا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

چند لمحے خاموشی سے سرک گئے۔ انگلیوں سے پڑھتے ہوئے ہلال ایک دم رکی۔ چونک کے سر اٹھایا۔ چہرہ دائیں بائیں کیا۔ دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن محسوس کر سکتی تھی۔

"کون؟" اس نے مدھم سا پکارا۔ کوئی اس کے ساتھ کرسی کھینچ کے بیٹھ رہا تھا۔

اس کا سانس تھم گیا۔ انگلیاں رک گئیں۔

"تم سے ملنا کتنا مشکل ہے، ہلال۔"

وہ آہستہ سے پیچھے ہو کے بیٹھی۔

"کیوں ملنے آئے ہو مجھ سے؟"

ہلال نے کتاب بند کر دی۔ ٹیک لگائے اب وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔ چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

"کیونکہ تم نے مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔"

وہ خاموشی سے نگاہیں سامنے جمائے بیٹھی رہی۔

"کیا تم بدر کے لیے میری مدد کرو گی؟"

ہڈی والا نوجوان اس کی طرف جھکا دھیمی آواز میں پوچھ رہا تھا۔

ہلال کے ابرو چونکنے والے انداز میں اٹھے۔

"تم نے اسے کیوں اغوا کیا ہے؟ "اس کی آواز ہلکی تھی۔

نوجوان نے شانے اچکائے۔

"یونہی۔"

"یونہی؟ "اس کی آواز میں افسوس در آیا۔ "تم نے مالا کو توڑ کے رکھ دیا ہے۔"

"مجھے بس تمہاری توجہ چاہیے تھی، ہلال۔ تم بدر کو واپس لینے کے لیے میری مدد کرو گی؟"

ہلال کے ابرو ڈھیلے ہو گئے۔ چہرہ اسی طرح سپاٹ ہو گیا۔ وہ کچھ نہیں بولی اور وہ بولتا جا رہا تھا۔

"ہم دوست تھے، یاد ہے تمہیں؟ میں تمہیں پاں کی سزا سے بچایا کرتا تھا۔ تم تب بھی ضدی تھیں۔ اب بھی ہو۔ لیکن میں ماں جیسا نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ مل کے کام کرو۔ ہفتے میں ایک دن صرف مجھے دے دیا کرو۔ تمہارا گفٹ... تمہاری صلاحیت ضائع جا رہی ہے۔ اسے درست جگہ استعمال ہونا چاہیے۔"

ہلال برف کا مجسمہ بنی بیٹھی رہی۔ لب ایک دوسرے میں پیوست رہے۔

عالیان بغور اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اگر تم ہاں کہہ دو تو میں آج ہی بدر کو واپس کر دوں گا۔"

"غصہ۔" وہ آنکھیں دور کسی بک ریک پہ جمائے ہوئے تھی۔ "تمہارے اندر غصہ بھرا ہے۔ انتقام۔ تم اندر سے فرسٹریٹڈ ہو۔ تم معاف نہیں کر سکتے۔ تمہیں بدلہ چاہیے۔"

عالیان کی گردن میں گلٹی سی ابھر کے معدوم ہوئی۔ پھر وہ پھیکا سا مسکرایا۔

"بالآخر تم مجھے پڑھنے لگ گئی ہو۔ "احتیاط سے داخلی سمت میں دیکھا۔ گارڈ ابھی واپس نہیں آیا تھا۔

"تمہارے اندر روشنی کم ہے اور اندھیرا زیادہ۔ وہ اندھیرا تمہیں نگل لے گا، عالیان۔ اور رہا بدر، تو وہ واپس آ جائے گا۔ ہم دونوں ساتھ بڑے ہوں گے۔"

عالیان چند لمحے ضبط سے اسے دیکھتا رہا۔

"میں نے تمہاری جان بچائی تھی۔ "اس کا لہجہ بدل گیا۔ "جس روز زیاد نے تمہیں دھکا دیا تھا، وہ میں تھا جو کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ میں تھا جو تمہارے ساتھ ایمبولینس میں ہسپتال گیا تھا۔ کیا تم میرے لیے کچھ بھی نہیں کرو گی؟"

"تم غلط دروازے پہ دستک دے رہے ہو۔" اس نے کتاب واپس کھول لی۔

"یہ بات یہاں ختم نہیں ہوئی۔ "اس نے ہڈی سر پہ درست کی اور ایک تیز نگاہ اس پہ ڈال کے وہاں سے اٹھ گیا۔

وہ اندھیرے میں محسوس کر سکتی تھی کہ اس کے اردگرد بہت سی سرخ توانائی کم ہوئی ہے۔

اب ہر طرف سکون تھا۔ کسی خاموش جھیل جیسا۔

ہلال کی انگلیاں ابھرے ہوئے لفظوں پہ سطر بہ سطر چلنے لگیں۔

☆☆☆

سریار میں ساری رات طوفانی بارش ہوتی رہی تھی۔ بجلی کڑکتی اور بادل گرجتے تو ساتھ کھڑکیاں دروازے بھی لرزتے۔ وہ صبح اپارٹمنٹ بلڈنگ سے باہر نکلی تو مطلع صاف لیکن زمین گیلی تھی۔ اور ہوا برفیلی۔

مالا کو لگ رہا تھا کہ اس کی ٹوپی اور بھورا کوٹ سردی روکنے میں ناکام ہیں۔ اسے زیادہ گرم کوٹ چاہیے تھا۔

وہ سڑک عبور کر کے سائیڈ واک پہ چلنے لگی جس کے ساتھ باسفورس بہہ رہا تھا۔ بہت سے لوگ جاگنگ یا واک کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ پانی کے کنارے رنگ برنگی کشتیاں بھی پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ رات کو اسے یہ اپنے ٹیرس سے نظر آتی تھیں

اوران میں قمقمے جل رہے ہوتے تھے۔
چند قدم بعد وہ ایک دم ٹھہر گئی۔
سائیڈ واک پہ نصب ایک بنچ پر وہ بیٹھا تھا۔ ٹراؤزرز اور گرم اسپورٹس جیکٹ میں ملبوس وہ سر جھکائے جوگرز کے تسمے بند کر رہا تھا۔ یہ یقیناً اس کی صبح کی دوڑ کا ٹائم تھا۔ وہ اس سے ملنے کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ اس کے اوپر دروازہ بند کرنے کے بعد سے اس کی باہر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اور کل وہ آفس بھی نہیں گئی تھی۔ اپارٹمنٹ کی راہداری میں نکلنے سے پہلے بھی جھانک لیتی کہ وہ آس پاس تو نہیں ہے۔
اس لیے ایک لمحے کے لیے تو سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ جلدی سے ایڑیوں پہ گھومی۔ اور الٹی سمت میں چلنے لگی تا کہ....
"مالا!"
اُف۔ مالا نے آنکھیں زور سے میچیں۔ پھر گہری سانس لے کر اس کی جانب پلٹی۔
"ماہر؟" سپاٹ چہرے سے اسے دیکھا۔
وہ اٹھ کے اس کی طرف آرہا تھا۔ اب ایک طرف پانی تھا، دوسری جانب سڑک۔ اور سامنے ماہر فرید۔ ماتھے پہ بکھرے بال پسینے سے گیلے تھے اور رنگت بھاگنے کے باعث گلابی ہو رہی تھی۔
"تم ناراض ہو مجھ سے؟"
کشمالہ نے دو دفعہ پلکیں جھپکائیں۔
"میں ناراض ہوں؟" زور "میں" پہ ڈالا۔
"تم مجھے اوائڈ کر رہی ہو۔"
اور کشمالہ مبین نے جو دو دن سے یہ طے کیا تھا کہ اگر وہ دکھائی دے گیا تو اس کے سامنے وہ خود کو مالک فرید کی طرح روبوٹ چہرے والی بنا لے گی۔ بس کام کی بات کرے گی اور کوئی گلہ شکوہ منہ سے نہیں نکالے گی، جیسے اسے فرق ہی نہیں پڑا تھا.... اس کے سارے ارادے بھک سے اڑے اور پانی میں جا ملے۔
"میں تمہیں اوائڈ کر رہی ہوں؟ یا تم مجھے سائیلنٹ ٹریٹمنٹ دے رہے ہو؟" وہ ایک دم اتنی اونچی آواز میں بولی کہ ساتھ چلتے ایک بوڑھے آدمی نے گردن موڑ کے تادیبی نظروں سے اسے گھورا تھا۔ مگر اسے پروا نہیں تھی۔
"مجھے ابھی تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ تم مجھ سے چاہتے کیا ہو۔ کبھی تم کسی دوست کی طرح بن جاتے ہو۔ اور کبھی بالکل اجنبی۔ کتنی دفعہ کہا ہے میں نے ماہر... کہ جب کوئی بات ہوا کرے تو بتا دیا کرو۔ کمیونیکیٹ کیا کرو۔ لیکن نہیں..." اس نے ہاتھ جھاڑنے کے انداز میں ملے۔ "یہ تمہاری پرانی عادت ہے۔ تم ہمیشہ باتیں ادھوری چھوڑ کے چلے جاتے ہو۔"
وہ لب بھینچے خاموشی سے سنے گیا۔
"ایک دن تم میرے ساتھ میرے بیٹے کی تلاش میں نکلتے ہو۔ دوسرے دن تم یوں ظاہر کرتے ہو جیسے تم مجھے جانتے ہی نہیں ہو۔ اور میں کنفیوژڈ ہو جاتی ہوں کہ شاید مجھ سے کچھ غلط ہوا ہے۔ میں نے کسی طرح تمہیں (ناراض) اوفینڈ کیا ہے۔ اور اس سب میں..." اس کی آنکھیں گلابی پانی سے بھرنے لگیں۔ "اس سب میں میرا ذہن مزید اسٹریس کا شکار ہو رہا ہے۔ تمہیں اندازہ بھی ہے کہ میں کس تناؤ سے گزر رہی ہوں؟ میرا بیٹا..." اس نے سینے پہ انگلی سے زور زور سے دستک دی۔
"میرا بیٹا میرے پاس نہیں ہے۔ کہاں ہے؟ میں نہیں جانتی۔ اسی شہر میں ہے۔ میرے قریب۔ مگر میں اسے دیکھ نہیں سکتی۔ مل نہیں سکتی۔ اس کو کسی بھی خطرے سے بچا نہیں سکتی۔ میری صبح اس کی تصویر دیکھ کر ہوتی ہے۔ میری رات اس کے لیے رو کے گزرتی ہے۔ میں تھک گئی ہوں گہری سانسیں لے کر خود کو کمپوزڈ کر کر کے ... اس سب میں اگر تم میرے ساتھ اس طرح کا رویہ رکھو گے تو میرے لیے چیزیں مشکل ہوں گی یا آسان؟"
ماہر کی آنکھوں میں بہت سا ملال اترا۔ چند لمحے وہ اس کی بھیگی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

"آئی ایم سوری۔"

مالا کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑتے گئے۔ وہ بہت سا غصہ جو اتنے دن سے اندر لاوے کی طرح ابل رہا تھا دھیرے دھیرے نیچے بیٹھتا رہا۔

"تم میرے ساتھ ایک دفعہ پھر وہی کر رہے ہو جو ہمیشہ کرتے تھے۔ حالانکہ ہم نے طے کیا تھا، نو فلٹر، نو ججمنٹ۔"

"تم نے بھی فلٹر لگایا ہے، مالا۔" اس کی آنکھوں اور الفاظ دونوں میں شکایت تھی۔

وہ چونک گئی۔ پلکیں گیلی تھیں مگر اس نے انہیں رگڑنے کے لیے ہاتھ نہیں اٹھائے۔

"اس عالیان نامی لڑکے نے تمہیں کچھ اور بھی کہا تھا جو تم نے مجھے نہیں بتایا۔"

اس کا سانس تھم گیا۔

"میں نے بہت سوچا کہ وہ تم سے کیوں ملا۔ اغوا کار ہمیشہ تاوان مانگتا ہے۔ پھر مجھے تمہارا چہرہ یاد آیا۔ تم جھوٹ بولنے میں اچھی نہیں ہو۔ اس نے کچھ ایسا کہا تھا جو تم بتا نہیں سکتی تھیں۔ اس لیے تم نے مجھ سے چھپالیا تھا۔ کیا؟ میں نہیں جانتا۔ اور میں اسے تمہارے چہرے پہ پڑھ بھی نہیں سکتا۔"

کشمالہ کے ہونٹوں پہ زخمی مسکراہٹ ابھری۔

"تم تو کہتے تھے تم ہر ایک کو پڑھ سکتے ہو۔"

"تمہیں نہیں پڑھ سکتا۔ تم میرا بلائنڈ اسپاٹ ہو، مالا۔"

وقت تھم گیا۔ ساری کائنات رک گئی۔ سمندر کا پانی بھی۔ بگلوں کے پر بھی۔ اور سڑک پر گزرتا ٹریفک بھی۔ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

اپنی بات کہہ کے ماہر نے چہرہ موڑ لیا۔ اب وہ اس سڑک کو دیکھ رہا تھا جس کے پار عمارت میں ان دونوں کے اپارٹمنٹس تھے۔

"یہاں ہوا تھا میرا ایکسیڈنٹ۔" ماہر نے بازو لمبا کر کے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہاری اور زیاد کی شادی سے پہلے۔ عین اسی جگہ پہ۔ زیاد کے بھیجے آدمی نے مجھے ٹکر ماری تھی۔ تب میں تمہیں میسج کر رہا تھا۔"

وہ ابھی تک اسے دیکھ رہی تھی۔ ملال سے۔ بے یقینی سے۔ وہ اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کیسے کہہ سکتا تھا؟

"کیا لکھ رہے تھے تم مجھے؟"

وہ زخمی سا ہنسا۔ وہ اب بھی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔

"یہی کہ کاش ہم مختلف حالات میں ملے ہوتے۔"

وہ اسے دیکھ کے رہ گئی۔ آنکھوں میں پھر سے پانی بھرنے لگا۔ وہ اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کیسے کہہ سکتا تھا۔

پھر ماہر نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ "میں چلتا ہوں۔ مجھے آفس کے لیے تیار ہونا ہے۔"

وہ آگے بڑھا تو وہ اپنی ایڑیوں پہ گھومی۔

"تم کہیں نہیں جارہے، ماہر فرید۔" اس نے زور سے پکارا۔ آواز میں دبا دبا غصہ تھا۔

وہ واپس اس کی طرف پلٹا۔

"تم مجھ سے بات کیے بغیر ایسے نہیں جاسکتے۔"

وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ تکان سے۔ شکست سے۔ پھر سر کو خم دیا۔

"ایک شرط پہ۔"

"کیا؟"

"تم مجھے بات کرنے کے ساتھ ناشتہ بھی کرنے دو گی۔"

وہ نا چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔

وہ بھی کافی کی تلاش میں ہی باہر نکلی تھی۔ ماہر شاید کہیں اور سے کافی لیتا تھا۔ کیونکہ جس قریبی کافی شاپ میں وہ اسے لے آئی، اس کے چہرے سے لگتا تھا وہ اس کو پسند نہیں آئی تھی۔ البتہ اس نے تبصرہ نہیں کیا۔

شاپ اندر سے گرم تھی۔ ہیٹر تیز چل رہے تھے۔ اور روسٹ ہوئے کافی بینز کی مہک سارے میں پھیلی تھی۔

"اور تمہارے لیے؟ "اپنا آرڈر باریستا کو بتانے کے بعد ماہر نے اسے دیکھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ کاؤنٹر پہ کھڑے تھے۔

وہ سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی اپنی کافی کا آرڈر دینے لگی۔ ماہر کے ساتھ اب وہ "اپنے پیسے میں خود دوں گی" والی بحث نہیں کیا کرتی تھی۔

مالا نے شوکیس میں سجے ڈونٹ پر انگلی رکھی تو ماہر نے افسوس سے اسے دیکھا اور پھر ڈونٹ کو۔ لیکن جب آرڈر دیا تو دو ڈونٹس کا دیا۔ کشمالہ مبین نے استعجاب سے ابرو اٹھائے۔

"تم بھی کھاؤ گے؟ تم تو نان خطائی اور کوکیز دونوں ادھورے چھوڑ دیتے ہو۔"

وہ سوگواریت سے مسکرادیا۔ بہت کچھ یاد آیا تھا۔

"کھاؤں گا۔" اور اپنا آرڈر دہرانے لگا۔

باریستا نے مسکرا کے آرڈر پنچ کیا۔ ٹیبلیٹ کی اسکرین جس کا رخ ان دونوں کی طرف تھا، اس پر رقم ابھری۔ 535 لیرا۔

ماہر فرید اس کی طرف مڑا۔

"تم پیسے دے دوگی؟"

کشمالہ نے ایک لمحے کے لیے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"والٹ گھر بھول گیا ہوں۔ واپس کر دوں گا۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"آف... آف کورس۔" وہ جلدی سے سنبھلی۔ کوٹ کی جیب سے والٹ نکالا۔ زپ کھولی اور چند نوٹ باریستا کو پکڑائے۔

"میں اپارٹمنٹ میں جاتے ہی واپس کر دوں گا۔"

"کم آن، ماہر۔ اب میں تم سے 535 لیرا واپس لوں گی؟" وہ ہنس دی۔ (کتنی ہی دفعہ ماہر نے ہر چیز کا بل پے کیا تھا۔ ایک دفعہ اس نے کر دیا تو کیا ہوگیا؟)

"مجھے باتیں کلیئر پسند ہیں، ماہر۔ صاف اور شفاف۔"

وہ دونوں اب آمنے سامنے ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔ کافی کپس اور ڈونٹس درمیان میں رکھے تھے۔ ماہر کا ڈونٹ ابھی تک بھورے پیکٹ میں تھا۔ اس شاپ میں بہت سی چیزیں بھورے رنگ کی تھیں۔ جامنی کچھ بھی نہ تھا۔

"میں تمہیں سائیلنٹ ٹریٹمنٹ نہیں دے رہا تھا۔ میں اپنے کچھ مسئلوں سے گزر رہا تھا۔" کپ دونوں ہاتھوں میں پکڑے ماہر کی گردن جھکی تھی۔

"تم سو چیزوں سے گزرو، لیکن اس کی سزا مجھے نہیں ملنی چاہیے۔ تمہیں اتنا تو سوچنا چاہیے کہ میں اپنی خوشی سے یہاں نہیں آئی ہوں۔"

وہ کہہ رہی تھی اور وہ گردن موڑے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔ چھت سے لٹکتے بلب۔ دیواروں کا انٹیریئر۔

"تمہارا خواب تھا بیکری بنانا۔ اور میرے ایک دستخط سے وہ خواب چھن گیا۔"

وہ بہت پرانی بات کر رہا تھا۔ شاید اسے نان خطائی سے یاد آیا تھا۔ شاید اسے کبھی بھولا ہی نہیں تھا۔

"اس میں تمہارا قصور نہیں تھا۔"

"جانتا ہوں۔ میں نے بنا دیکھے اوشن کی ڈیل پہ سائن کیے تھے۔ اور میری کمپنی اس ڈیل کا حصہ بن گئی تھی جس کے تحت تمہارا ریستوران بکا تھا اور تم جاب لیس ہوگئی تھیں۔ میں نے غور ہی نہیں کیا۔ ان دنوں میں بہت سی چیزوں پہ غور نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ میرا ذہن ہر وقت ہلال کی تلاش پہ لگا رہتا تھا۔ جیسے اب تمہارا ذہن..." اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔

"تم اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کیسے کہہ سکتے ہو، ماہر؟" وہ بے بسی اور ملال سے اسے دیکھ رہی تھی۔

ماہر نے جواب نہیں دیا۔ وہ انہی سوگوار نظروں سے اسے دیکھے گیا۔

"مجھے تمہارا بلائنڈ اسپاٹ نہیں ہونا چاہیے۔ تم

ایک دوسری عورت سے شادی کرنے جا رہے ہو۔ وہ بھی دو ہفتے بعد۔"

ماہر نے تصحیح کے لیے ہونٹ کھولے، پھر سر جھٹک دیا۔

"جانتا ہوں۔ مگر میں نے تمہیں کہا تھا مالا... جس لمحے تم میرے آفس میں آئی تھیں.... کہ اب ہر چیز پیچیدہ ہو جائے گی۔"

"کیا اس میں میرا قصور ہے؟"

ماہر نے سوگوار مسکراہٹ سے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں۔ میرا قصور ہے۔ میں تم سے بھی موو آن نہیں کر سکا۔" اس نے خود کو کہتے سنا۔

"مجھے لگا تھا میں موو آن کر جاؤں گا۔ لیکن اب میں تھک گیا ہوں۔ میں یہ آنکھ مچولی نہیں کھیل سکتا۔ میں زارا کو بھی ہرٹ کر رہا ہوں۔ یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ میں نے تمہیں اوائڈ کر کے بھی دیکھ لیا۔ مگر میں کیا کروں، مالا؟"

اسے لگا ماہر کی آنکھوں میں پانی چمکا ہے۔

"اٹ از واٹ اٹ از" اس نے جیسے بے بسی سے کندھے اچکائے۔

وہ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔

"میں نے کوشش کی ہے۔ اپنا دھیان بٹانے کی۔ مالک کے بارے میں سوچنے کی۔ مگر اب میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ میں تھک گیا ہوں۔ میں کیا کروں؟ میں کبھی مالا جیسی لڑکی سے ملا ہی نہیں زندگی میں۔ میرے اردگرد موجود لڑکیاں... وہ سب ایک جیسی ہیں۔ اب ان کی شکلیں بھی ملنے لگی ہیں۔" تلخی سے ہنس کے سر جھٹکا۔ "مجھے معلوم تھا یہی ہوگا۔ جب تم میرے آفس میں داخل ہوئی تھیں، مجھے معلوم تھا یہی ہوگا۔"

وہ اسی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔ ماہر نے سر دائیں بائیں ہلایا۔

"کاش ہم مختلف حالات میں ملے ہوتے، مالا۔"

"لیکن نہیں ملے۔ او کے؟" اس نے کافی کا کپ نیچے رکھا اور جب بولی تو آواز نرم مگر دوٹوک تھی۔

"میں تمہاری زندگی میں پیچیدگیاں پیدا کرنے نہیں آئی، ماہر۔ میرے لیے یہاں آنا آسان نہیں تھا۔ تمہیں میری پوزیشن کو بھی سمجھنا ہوگا۔ میں تمہیں کئی بار بتا چکی ہوں۔ ہمارے راستے الگ ہیں۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گی جو تمہاری زندگی کو پیچیدہ کرے۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"مگر تم بھول جاتے ہو۔ اس لیے آج پھر سے سنو۔ میرا ایک بیٹا ہے۔ میری ایک زندگی ہے۔ وین کور میں۔ وہاں میرا گھر ہے۔ میں یہاں ایک مسافر ہوں۔ اپنے بیٹے کو لے کر چلی جاؤں گی۔ شاید اس کے بعد ہم زندگی میں کبھی نہ ملیں۔ شاید ملیں تو کسی اجنبی کی طرح۔ کیونکہ ہمارے رستے الگ ہیں۔"

ماہر نے تکان سے سر ہلا دیا۔ یاسمین یا چنگیز یہ بات کہتے تو اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی اس کے الفاظ سے ہوئی تھی۔

"میں چاہتی ہوں تم میری طرف سے کسی بھی غلط فہمی کا شکار نہ رہو۔ تمہاری زندگی میں زارا ہو یا نہ ہو، مالا کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ میں اس وقت ایک شدید ٹراما سے گزر رہی ہوں۔ میرے اندر کسی نئی چیز کے لیے جگہ ہی نہیں ہے۔ اس لیے میں جتنا وقت یہاں ہوں، تم میرے ساتھ آنکھ مچولی مت کھیلو۔ جب یہ ممکن ہی نہیں ہے تو پھر بھاگ کیوں رہے ہو؟ تم مجھے ایک دوست کی طرح بھی ٹریٹ کر سکتے ہو۔ تاکہ اگر تمہیں کچھ پریشان کرے تو تم مجھے کہہ سکو اور میں اس بات کو کلیئر کر سکوں۔"

وہ رکی۔ پھر گہری سانس لی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆



بدن میں اتریں تھکن کے سائے تو نیند آئے
یہ دل کہانی کوئی سنائے تو نیند آئے

بجھی بجھی رات کی ہتھیلی پہ مسکرا کر
چراغ وعدہ، کوئی جلائے تو نیند آئے

ہوا کی خواہش پہ کون آنکھیں اجاڑتا ہے
دیے کی لو خود سے تھرتھرائے تو نیند آئے

تمام شب جاگتی خوشی نے اس کو سوچا
وہ زیرِ لب گیت کوئی گنگنائے تو نیند آئے

بس ایک آنسو بہت ہے محسن کے جل گئے کو
یہ اک ستارہ کوئی بجھائے تو نیند آئے

محسن نقوی

شاید

میں شاید تم کو یکسر بھولنے والا ہوں
شاید، جانِ جاں شاید
کہ اب تم مجھ کو پہلے سے زیادہ یاد آتی ہو
ہے دل غمگین، بہت غمگین
کہ اب تم یاد دلدارانہ آتی ہو
شمیم دور ماندہ ہو
بہت رنجیدہ ہو مجھ سے
مگر پھر بھی
مشامِ جاں میں میرے آشتی مندانہ آتی ہو
جدائی میں بلا کا التفاتِ محرمانہ ہے
قیامت کی خبر گیری ہے
بے حد ناز برداری کا عالم ہے
تمہارے رنگ مجھ میں اور گہرے ہوتے جاتے ہیں
میں ڈرتا ہوں
میرے احساس کے اس خواب کا انجام کیا ہوگا؟
یہ میرے اندرونِ ذات کے تاراج گر
جذبوں کے بیری وقت کی سازش نہ ہو کوئی
تمہارے اس طرح ہر لمحہ یاد آنے سے
دل سہما ہوا سا ہے
تو پھر تم کم ہی یاد آؤ
متاعِ دل، متاعِ جاں تو پھر تم کم ہی یاد آؤ
بہت کچھ بہہ گیا ہے سیلِ ماہ و سال میں اب تک
سبھی کچھ تو نہ بہہ جائے
کہ میرے پاس رہ بھی کیا گیا ہے
کچھ تو رہ جائے

جون ایلیا

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

وصیت کی اہمیت

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کسی مسلمان مرد کے لیے، جس کے پاس وصیت کے قابل کوئی چیز ہو یہ جائز نہیں ہے کہ وہ دو راتیں بھی اس حالت میں گزارے کہ اس کے پاس وصیت لکھی ہوئی نہ ہو۔“ (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔)

اور مسلم کی روایت میں ہے۔

”(یہ جائز نہیں کہ) وصیت کے بغیر تین راتیں گزارے۔“ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سنی، مجھ پر ایک رات بھی ایسی نہیں گزری کہ میری وصیت میرے پاس (لکھی ہوئی موجود) نہ ہو۔“

فائدہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تاکید وصیت سے واضح ہے کہ موت کا کوئی پتا نہیں، اس لیے صاحب حیثیت لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر وقت وصیت لکھ کر رکھیں تا کہ ان کی وفات کے بعد لین دین کے معاملات ان کے ذمے نہ رہیں۔ نیز ورثاء کے درمیان جائیداد میں لڑائی جھگڑا نہ ہو۔

مینڈک کہانی

ایک خوب صورت لڑکی شام کے وقت ایک پارک سے گزر رہی تھی کہ تالاب کے قریب اس نے ایک دھیمی سی فریاد سنی۔ ”ذرا سنیے...... پلیز سنیے......“

لڑکی نے ادھر ادھر دیکھا تو اسے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ذرا غور سے تالاب کی جانب دیکھا تو پتا چلا ایک مینڈک اس سے مخاطب تھا۔ ”اے پیاری لڑکی! میں ایک مینڈک نہیں ہوں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں ایک ملک کا شہزادہ ہوں، ایک ظالم جادوگرنی نے مجھے اپنے جادو کے زور سے مینڈک بنا دیا ہے۔ اگر تم جیسی حسین اور رحم دل لڑکی میری مدد کرے تو میں پھر سے انسان کے روپ میں آجاؤں گا۔ کیا تمہیں میری حالت پر رحم نہیں آتا۔“

مینڈک کی درد بھری فریاد نے لڑکی کے دل کو پگھلا دیا وہ بولی۔ ”تم مجھے بتاؤ اے مظلوم شہزادے میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔“

”اے رحم دل حسین لڑکی! اس جادو کا توڑ یہ ہے کہ اگر تم جیسی کوئی لڑکی مجھے ایک رات نہایت پیار محبت سے اپنے ساتھ رکھے تو میں اپنے اصل روپ میں لوٹ سکتا ہوں، کیا تم میری مدد کرو گی، مجھے اپنے ساتھ لے چلو گی۔“

لڑکی کو اس مینڈک پر ترس آگیا وہ اسے اپنے گھر لے آئی، پیار سے اپنے ساتھ رکھا اور اپنے ہی پاس سلایا۔ صبح وہ مینڈک واقعی ایک خوش شکل نوجوان بن گیا۔

اس مختصر سی کہانی کا المناک پہلو یہ ہے کہ لڑکی کی ماں نے اس کی سنائی کہانی پر یقین نہیں کیا۔

زادراہ

حضرت شیخ سعدیؒ بیان فرماتے درویش کسی صحرا میں راستہ بھول گیا اور اس کے پاس موجود زادراہ بھی ختم ہوگیا۔ جب اسے تلاش کے بعد راستہ نہ ملا تو وہیں بھوک پیاس کی شدت میں دم توڑ گیا۔

اس درویش کے پاس چند درہم تھے مگر ان کا کیا کہ وہ اس صحرا میں کچھ بھی نہ خرید سکتا تھا۔ پھر درویشوں کی ایک جماعت کا گزر وہاں سے ہوا۔ انہوں نے اس درویش کی لاش دیکھی اور اس لاش کے پاس چند درہم موجود تھے۔ اس درویش نے مرتے وقت زمین پر لکھا تھا کہ اگر کسی کے پاس خالص سونا ہو تو بغیر زادراہ کے وہ ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکتا۔ جنگل میں ایک دریش کے لیے ابلی ہوئی شلغم خالص سونے چاندی سے بہتر ہے۔

حضرت شیخ سعدؒ فرماتے ہیں کہ پس یاد رکھو کہ انسان کا پیٹ خوراک سے بھرا جاتا ہے۔ نہ کہ سونے چاندی سے۔

(حکایات سعدیؒ)

ہمت نہ ہاریں

کرنل سینڈرس ریٹائر ہوا تو پینسٹھ سال کی عمر میں اس کے پاس صرف سو ڈالر تھے۔ اس کو حالات بہتر بنانے کے لیے کچھ کرنا تھا۔ کرنل سینڈرس کو اپنی والدہ کی مرغی بھوننے کی ایک خاص ترکیب یاد تھی۔ اس نے آرڈر لینے کی کوشش شروع کر دی۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں اس نے کتنے دروازوں پر دستک دی؟

اس نے اندازاً ایک ہزار افراد سے رابطہ کیا تب کہیں جا کر اسے پہلا آرڈر ملا۔

کچھ باتیں گہری گہری سی!!

☆ علم یہ طے کرتا ہے کہ کیا کہنا ہے، تربیت یہ طے کرتی ہے کہ کیسے کہنا ہے، طرز عمل یہ طے کرتا ہے کہ کس قدر کہنا ہے۔ اور دانشمندی یہ طے کرتی ہے کہ کہنا بھی ہے یا نہیں۔

☆ زندگی کے عجائبات میں سے ایک یہ بھی عجوبہ ہے کہ انسان ایسے لوگوں کے ہاتھوں تکلیف اٹھاتا ہے جن کے بارے میں وہ دعائیں کرتا رہتا ہے کہ انہیں تکلیف میں نہ دیکھوں۔

☆ کچھ لوگوں کو بلندی پر پہنچنے کی اتنی جلدی ہوتی ہے کہ وہ چھوٹے لوگوں کا ہاتھ پکڑنے کے بجائے بڑے لوگوں کے پیر پکڑنا پسند کرتے ہیں۔

☆ ہم سب مر جائیں گے! یہ حقیقت جاننے کے باوجود بھی ہم ایک دوسرے کا جینا حرام کر رہے ہیں۔

ناہید اسماعیل کراچی

طبی پیشہ

''نکل جاؤ یہاں سے، مجھے تو آج معلوم ہوا ہے کہ تم گورکن ہو۔ حالانکہ تم کہتے تھے کہ تم ڈاکٹر ہو۔''

لڑکی کے باپ نے غصے سے چلاتے ہوئے نوجوان کو گھورا۔

''جناب! میں نے آج تک خود کو ڈاکٹر نہیں کہا۔''

نوجوان نے اعتماد سے وضاحت دینے کی کوشش کی۔

''میں تو ہمیشہ سے یہی کہتا آرہا ہوں کہ میری روزی کا دارومدار طبی پیشے کی مہارت پر ہے۔''

مہارت

ایک نیا شادی شدہ جوڑا ہنی مون منانے کسی تفریحی مقام پر گیا۔ ہوٹل کے منیجر نے بغیر پوچھے ان کا نام رجسٹر پر درج کر لیا تو بیوی نے حیران ہو کر منیجر سے پوچھا۔

''آپ کو میرے شوہر کا نام کیسے معلوم ہوا؟''

''یہ تو ہمارے پرانے کسٹمر ہیں، ہر سال ہنی مون منانے کے لیے ہمارے ہی ہوٹل میں قیام کرتے ہیں۔'' منیجر نے متانت سے جواب دیا۔

مسکراتی کرنیں

80 کی دہائی میں چاچا رحمت حج کرنے گیا جب طیارہ جدہ ایئر پورٹ پر اترا تو اس نے باہر نکلنے کے لیے کھڑا ہونا چاہا مگر کھڑا نہ ہو سکا۔ اور واپس سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دوبارہ کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن زور لگانے کے باوجود اس سے کھڑا نہ ہوا ہو گیا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ بابے نے سیٹ سے ٹیک لگائی اور اپنے ماضی کے گناہوں کو یاد کرنے لگا۔ رو رو کر معافی مانگی، ساتھ بیٹھی اپنی بیوی سے اعتراف کیا کہ ''میں نے تم سے چھپ کر دوسری شادی کر رکھی ہے۔ مجھے معاف کر دینا بھلی لوک......'' جہاز خالی ہو گیا مگر بابا نہ اترا، ایئر ہوسٹس دوڑی دوڑی آئی اور پوچھا۔

''آپ کو کیا ہوا ہے؟ نیچے اتریے جدہ ایئر پورٹ آ گیا ہے۔''

بابے نے جواب دیا۔

''میرے گناہوں کا بوجھ بہت زیادہ ہے، اٹھا نہیں جا رہا ہے، میرا جسم من من کا ہو گیا ہے۔'' اور ٹیک لگا کر استغفار کرنے لگا۔

ایئر ہوسٹس بولی۔ ''گناہوں کے بوجھ کا تو مجھے نہیں پتا۔ مگر کھڑے ہونے کے لیے پہلے آپ کو اپنی سیٹ بیلٹ کھولنا ہوگی۔''

☆☆

امت الصبور

خاتون کی ڈائری

ناہید اسماعیل کی ڈائری سے

میرے پیارے استاد محترم (مرحوم) کو جن سے ہم بہن بھائیوں نے قرآن پاک پڑھا ہمارے گھرانے سمیت محلے کے سب چھوٹے بڑے ابا جی کہہ کر بلاتے تھے۔ مزے کی بات یہ کہ ان کی بیگم کو سارے خالہ جی کہا کرتے جس پر انہیں شکوہ ہوتا کہ انہیں اماں جی کیوں نہیں پکارا جاتا۔ ہمارے کچے پکے محلے میں سب سے جدا اور منفرد جانے کس دیس کے تھے دونوں......

خوب صورت قد و قامت کے ساتھ گلابی چہرے، سنہری آنکھیں جو ہر کسی کے لیے محبت شفقت سے بھری ہوتیں۔ سینکڑوں باران سے سنی یہ مختصر نظم جو ڈائری میں نہیں دل پر لکھی اور یاد رہی۔

پریم کا دیپک ہے دیوانے، جلتا جا اور بجھتا جا
دل سلگے ہے، زخم رسے ہیں دھیرے دھیرے، ہولے ہولے
خوشی کے لمحے غم کے بہانے، غم کی راہ پہ چلتا جا
پریم کا دیپک ہے دیوانے جلتا جا اور بجھتا جا
ہے جھوٹی دنیا، ہیں جھوٹے ناتے، کسی کے دل میں پیار نہیں
پل میں بدلے رنگ زمانہ، دیکھتا جا اور چلتا جا
پریم کا دیپک ہے دیوانے جلتا جا اور بجھتا جا

فرخندہ سلیم کی ڈائری سے

میری دوست نے یہ نظم مجھے سینڈ کی ہے اس کا کہنا ہے کہ یہ نظم پروین شاکر کی ہے، قارئین اسے پڑھیں اور مجھے بتائیں کہ یہ نظم کس کی ہے۔

سردی کی ہوا، اور تمہارا خیال
کیا خوب صورتی سے ایک دوسرے میں جڑا ہے
سردیوں کی دھوپ میں تمہارا چہرہ
کبھی کبھی، سورج کی کرنوں کی طرح
نرم اور دھندلا سا دکھتا تھا
پھر تمہاری یادوں میں گم ہو جانا
اور درختوں کے نیچے سو جانے کا خوف
چاند کی روشنی میں وہ سناٹا
یہ سب تمہاری باتوں میں غم کے کنارے دیکھتے ہوئے
سردیوں کی راتیں، اور تمہاری مسکراہٹ
جو ٹوٹتے ہوئے ستاروں کی طرح
میرے دل میں کہیں اور گہرائیوں میں خود کو چھپاتی ہے
یادوں کی گلیوں میں سرد ہو گئی راتیں
تمہارے بچھڑنے کا دکھ، اور بچھڑ جانے کا سناٹا
کہاں گئے وہ موسم، وہ لمحے
جو کبھی ہم نے ایک ساتھ گزارے تھے؟
اب صرف سردی ہے، اور تمہاری یاد
جو ہلکی ہلکی ہواؤں میں رقص کرتی ہے
اور یہ سرد موسم تمہاری یاد دلاتا ہے۔

روحیلہ خان کی ڈائری سے

ندا فاضلی کی یہ خوب صورت غزل آپ سب کی نذر:

کہیں چھت تھی، در و دیوار تھے، کہیں ملا مجھے گھر کا پتا دیر سے
دیا تو بہت زندگی نے مجھے، مگر جو دیا وہ دیا دیر سے

ہوا نہ کوئی کام معمول سے، گزرے شب و روز کچھ اس طرح
کبھی چاند چمکا غلط وقت پر، کبھی گھر میں سورج اگا دیر سے

یہ سب اتفاقات کا کھیل ہے، یہی ہے جدائی یہی میل ہے
میں مڑ مڑ کے دیکھا کیا دور تک، بنی وہ خموشی صدا دیر سے

کہیں رک گئے راہ میں بے سبب، کبھی وقت سے پہلے گھر آئی شب
ہوئے بند دروازے کھل کھل کے سب، جہاں بھی گیا میں گیا دیر سے

سجا دن بھی، روشن ہوئی رات بھی، بھرے جام، لہرائی برسات بھی
رہے ساتھ کچھ ایسے حالات بھی، جو ہونا تھا جلدی، ہوا دیر سے

بھٹکتی رہی یوں ہی ہر بندگی، ملی نہ کہیں سے کوئی روشنی
چھپا تھا کہیں بھیڑ میں آدمی ہوا مجھ میں روشن خدا دیر سے

رضوانہ وقاص کی ڈائری سے

مجھے لکھنے پڑھنے کا بہت شوق ہے اب اشعار، اور غزلیں بھی لکھنے لگ گئی ہوں۔ یہ غزل احمد فراز کی ہے، ٹی وی پر کوئی لڑکی گا رہی تھی اور میں نے اپنی ڈائری میں لکھ لی اور اب خاتون کی ڈائری میں لکھنے کا دل کیا۔ بتانا ہے، کیسی لگی۔

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

ڈھونڈ اجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

غم دنیا بھی غم یار میں شامل کرلو
نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انسان ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

اب نہ وہ میں نہ وہ تو ہے نہ وہ ماضی ہے فراز
جیسے دو شخص تمنا کے سرابوں میں ملیں

☆☆☆

حمدہ خان کی ڈائری سے

انٹرنیٹ اور موبائل نے کتاب سے رشتہ کمزور کر دیا ہے جب انگلی کی ایک جنبش سے ایک دنیا سامنے کھل جائے تو کتاب کے بکھیڑوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے لیکن کچھ لوگ جو کتابوں سے وابستگی رکھتے ہیں۔ اپنی ایک عمر کتابوں کی محبت کی نذر کر چکے ہیں انہیں کتابوں کی مہک، کاغذ کی خوشبو آج بھی اپنی طرف کھینچتی ہے۔ گلزار کی یہ نظم ان ہی لوگوں کے نام

کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں
مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہوتیں
جو شامیں ان کی صحبت میں کٹا کرتی تھیں
اب اکثر گزر جاتی ہیں کمپیوٹر کے پردوں پر
زباں پر جو ذائقہ آتا ہے صفحہ پلٹنے کا
اب انگلی کلک کرنے سے بس اک جھپکی گزرتی ہے
بہت کچھ تہہ بہ تہہ کھلتا چلا جاتا ہے پردے پر
کتابوں سے جو ذاتی رابطہ تھا، کٹ گیا ہے
کبھی سینے پہ رکھ کے لیٹ جاتے تھے
کبھی گودی میں لیتے تھے
کبھی گھٹنوں کو اپنے رحل کی صورت بنا کر
نیم سجدے میں پڑھا کرتے تھے
چھوتے تھے جبیں سے
وہ سارا علم تو ملتا رہے گا آئندہ بھی
مگر وہ جو کتابوں میں ملا کرتے تھے سوکھے
پھول اور مہکے ہوئے رقعے
کتابیں مانگنے، گرنے اٹھانے کے بہانے
رشتے بنتے تھے
ان کا کیا ہوگا
وہ شاید اب نہیں ہوں گے

سعدیہ انیس کی ڈائری سے

نذیر بنارسی کی اس غزل میں پرانے شاعروں کا انداز نظر آئے گا

یہ عنایتیں غضب کی، یہ بلا کی مہربانی
میری خیریت بھی پوچھی کسی اور کی زبانی

نہیں مجھ سے جب تعلق تو خفا خفا سے کیوں ہیں
نہیں جب مری محبت تو یہ کیسی بدگمانی

مرا غم رلا چکا ہے تجھے بکھری زلف والے
یہ گھٹا بتا رہی ہے کہ برس چکا ہے پانی

مری بے زبان آنکھوں سے گرے ہیں چند قطرے
وہ سمجھ سکیں تو آنسو نہ سمجھ سکیں تو پانی

میری بیاض سے

روحیلہ خان

رضوانہ وقاص............ہری پور
جوق در جوق تمناؤں کے دھوکے کھا کر
دل اگر اب بھی دھڑکتا ہے تو حد کرتا ہے

سائرہ قریشی............امریکہ
ورنہ کیا کچھ میسر نہ تھا تیرے بعد مجھے
میں نے دیکھی ہی نہیں آنکھ اٹھا کر دنیا

ناہید اسماعیل............کراچی
اپنی مرضی سے دو چار قدم چلنے دے
زندگی ہم تیرے کہنے پہ چلے ہیں برسوں

آمنہ سعد............کراچی
عظم لوگ تھے ٹوٹے تو ایک وقار کے ساتھ
کسی سے کچھ نہ کیا، بس اداس رہنے لگے

طیبہ شوکت............مرید کے
نہ سونا میرے مقدر میں ہے نہ شب بھر جاگنا خالد
میں آنکھیں کھولتا اور میچتا رہتا ہوں بارش میں

ارم ظاہر............کراچی
آپ کے بعد ہر گھڑی ہم نے
آپ کے ساتھ ہی گزاری ہے

روبینہ............فیصل آباد
یہ دکھ نہیں کہ اندھیروں سے صلح کی ہم نے
ملال یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

اقرا نمرہ............گلستان جوہر
زندگی اتنی غنیمت تو نہیں جس کے لیے
عہد کم ظرف کی ہر بات گوارا کر لیں

شائستہ نسرین............اسکیم 33
میری تلاش کو بے نام و بے سفر کر دے
میں تیرا راستہ چھوڑوں تو دربدر کر دے
اور بکھرتے ٹوٹتے رشتوں کی عمر بھی تنی
میں تیری رات ہوں آ جا میری سحر کر دے

شہلا عباس............کراچی
اب کے ہم نے بھی دیا ترک تعلق کا جواب
ہونٹ خاموش رہے آنکھوں نے بارش نہیں کی

انیقہ مرید............شہر کالا
ہم بھی وفا کریں گے، ہے جب تک کہ دم میں دم
وہ بھی جفا سے باز نہ آئے خدا کرے

شاہ اقصیٰ سید............اسلام آباد
میں تجھے ٹوٹ کر چاہوں تو میری فطرت ہے
تو بھی ہو میرا طلب گار یہ ضروری تو نہیں

خدیجہ خان............لاہور
میں یہ ہی سوچ کے آیا ہوں تیری چوکھٹ پہ
دربدر ہونے کے بعد اک یہی در بچتا ہے

نوال افضل محسن............بحریہ ٹاؤن لاہور
ابھی تو عشق میں ہونا کمال باقی ہے
کہ ہجر کاٹ لیا ہے وصال باقی ہے
تیری تلاش میں آدھی صدی بتائی
جنوب ڈھونڈ لیا اب شمال باقی ہے

زینب............اسلام آباد
محبت زندگی کے فیصلوں سے لڑ نہیں سکتی
کسی کو کھونا پڑتا ہے، کسی کا ہونا پڑتا ہے

ارم کمال............فیصل آباد
مجھے کسی سے کوئی غرض نہیں، مجھے کام ہے اپنے کام سے
تیرے ذکر سے تیری فکر سے تیری یاد سے تیرے نام سے

☆☆

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

بیف اسٹکس

ضروری اشیاء:

گوشت	ڈیڑھ کلو
لال مرچ	چوتھائی کھانے کا چمچہ
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالہ	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ادرک، لہسن	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچیں	دو کھانے کے چمچے
سرکہ	چوتھائی کپ
کریم	آدھا کپ
انڈے	حسب ضرورت
شملہ مرچ	حسب ضرورت
پیاز	تین عدد
بریڈ کرمبز	حسب ضرورت
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:۔

گوشت کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں بنالیں۔ اس میں لال مرچ، ہلدی، گرم مسالہ، زیرہ، ادرک، لہسن، ہری مرچیں، سرکہ، کریم مکس کر کے اس کو پکالیں۔ گوشت گل جائے تو چولہے سے اتارلیں، شملہ مرچ اور پیاز کے چوکور ٹکڑے کاٹ لیں۔ اسٹک پر ایک بوٹی، ایک شملہ مرچ کا ٹکڑا، ایک پیاز کا ٹکڑا اور پھر بوٹی لگا کر اس پر پھینٹا ہوا انڈا لگادیں۔ اس کے بعد اس پر بریڈ کرمبز لگالیں۔ تیل گرم کریں اور اسٹکس کو فرائی کرلیں۔ ٹماٹو کیچپ کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

لائم چکن سوفٹ ٹاکوز

ضروری اشیاء:۔

چکن بریسٹ	دو عدد
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
چینی	ایک چائے کا چمچہ
ہری پیاز	دو عدد
اوریگانو	ایک چائے کا چمچہ
ٹورٹیلا	دس عدد
پنیر	چوتھائی کپ
لیموں کا رس	ایک چائے کا چمچہ
سیاہ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ
لہسن کے جوے	دو عدد
ٹماٹر	ایک عدد
سلاد پتا	چوتھائی کپ
سالسہ	چوتھائی کپ

ترکیب:۔

گوشت کو دھو کر خشک کر کے اس کے چھوٹے کیوبز کاٹ لیں۔ ایک پتیلی میں دو کھانے کے چمچے تیل گرم کریں۔ اس میں گوشت کے کیوبز ڈال کر بیس منٹ تک درمیانی آنچ پر فرائی کریں۔

اس میں سرکہ، لیموں کا رس، چینی، نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر، ہری پیاز، لہسن اور اوریگانو ڈال کر دس منٹ تک پکائیں۔ ٹورٹیلا کو توے پر گرم کرلیں۔ اس کے بعد اس پر تیار کیا ہوا گوشت کا مکسچر ڈالیں۔

ٹماٹر، سلاد پتا، کدوکش کیا ہوا پنیر اور سالسہ ڈالیں۔ مزیدار لائم چکن سوفٹ ٹاکوز تیار ہیں۔ گارنش کر کے سرو کریں۔

نوٹ: اگر ٹورٹیلا نہ ملیں تو اس کی جگہ گھر کی پکی ہوئی روٹیاں استعمال کی جاسکتی ہیں۔

سالسہ بنانے کے لیے کھیرا، ٹماٹر، لیموں، پیاز، سلاد پتا اور ہری مرچ، لہسن کو باریک کاٹ لیں اس میں لیموں کا رس نمک اور کالی مرچ کٹی لال مرچ ڈال کر مکس کریں۔

☆☆

آپ کا باورچی خانہ

صبا بٹ...... لاہور

س۔ کھانا بناتے وقت کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں پسند ناپسند یا گھر والوں کی صحت؟

1۔ ہمارے گھر میں کھانا سب کی مشترکہ پسند سے بنتا ہے اور صرف ذائقے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ سبزیاں خوب بھون کر اور دال خوب تڑکا لگا کر بنائی جاتی ہے روزانہ کھانا بنانے میں سب کی پسند ناپسند کا خیال رکھتی ہوں۔

س۔ کھانے کا وقت ہے گھر میں اچانک مہمان آ جائیں؟

2۔ ہمارے گھر مہمان زیادہ تر بتا کر ہی آتے ہیں اچانک اگر مہمان آ جائیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ گوشت، چکن ہفتہ بھر کا فریزر میں موجود ہوتا ہے اگر گرمیاں ہوں تو مہمان کو پہلے کولڈ ڈرنک پیش کی جاتی ہے۔ اگر سردیاں ہوں تو پہلے چائے کے ساتھ نمکو بسکٹ یا انڈے ابال کر رکھے جاتے ہیں تو جب تک مہمان اس سب سے فارغ ہوں میں چکن فریزر سے نکال کر کچھ دیر کے لیے باہر رکھ دیتی ہوں۔ اور لہسن، پیاز، ہمیشہ تازہ بنا کر ہی ہنڈیا میں استعمال کرتی ہوں ایک آسان ڈش جو جلدی بھی بن جاتی ہے اور بہت مزیدار بھی ہے۔

ایک مزے دار ڈش

اشیاء:

مرغی	ایک کلو
ادرک، لہسن پسا ہوا	تین کھانے کے چمچ
تیل	آدھی پیالی
بڑی ہری مرچ	چھ عدد
دہی	آدھا کلو
ٹماٹر	چار عدد
نمک، لال مرچ، ہلدی	حسب ضرورت
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے

ترکیب:

پہلے دہی میں نمک، لال مرچ، ہلدی اور گوشت ملا کر اچھی طرح مکس کریں اور اس کو تھوڑی دیر کے لیے کھلے منہ کے برتن میں رکھ دیں اب تیل میں کٹے ہوئے ٹماٹر اچھی طرح بھونیں یہاں تک کہ ٹماٹر گل جائیں۔ پھر لہسن، ادرک پیاز بھون لیں اب اس میں ایک پیالی پانی ڈال کر دہی ملا چکن ڈال کر ہلکی آنچ پر دس سے پندرہ منٹ تک بھونیں یہاں تک کہ گوشت گل جائے۔ جب گوشت گل جائے تو لیموں کا رس اور ہری مرچ لمبائی میں کاٹ کر دم میں رکھ دیں جب تک آئل مسالے سے الگ نہ ہو۔ مزیدار چکن کا سالن تیار ہے۔

س۔ کچن کی صفائی کے لیے کیا اہتمام کرتی ہیں؟

3۔ کچن کی صفائی کی تو میں روز کرنے کی قائل ہوں۔ کچن صاف ہوگا اور ہر چیز ترتیب سے ہوگی تو کھانا بھی خوش دلی سے پکے گا، میں روزانہ نمک مرچ کے ڈبوں کو صاف کر کے ان کی جگہ پر رکھتی ہوں۔ سلیب کو روزانہ سرف ملے پانی کے ساتھ دھو کر خشک کپڑے سے صاف کرتی ہوں کچن کا فرش روزانہ دھوتی ہوں۔

س۔ صبح کا ناشتہ بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے؟

4۔ ہمارے ہاں ناشتہ پر سب کی پسند بدلتی رہتی ہے، اس لیے ناشتہ پر پوچھنا پڑتا ہے کہ کون کیا کھائے گا۔ ابو اور بھائی پراٹھے رات کے سالن بمعہ آملیٹ کے کھاتے ہیں۔ میں اور امی، زیادہ تر چائے کے ساتھ پاپے کھاتے ہیں اور طیبہ (طفل سسٹر) پراٹھا بمعہ فرائی انڈہ کے۔ چھٹی والے دن نان چنے یا پھر حلوہ پوری منگوائی جاتی ہے اور درمیان میں میرا اگر پراٹھے کا موڈ بنے تو آلو یا گوبھی کے پراٹھے اور وہ بھی امی کے ہاتھ کے تو کیا بات ہے۔

س۔ آج کل باہر کھانا رواج بنتا جا رہا ہے آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھاتی ہیں؟

5۔ ہمارے ہاں ہوٹلنگ کا رواج نہیں ہے۔ ہاں کبھی کبھار اتنی عیاشی ہو جاتی ہے کہ باہر کا کھانا گھر لا کر کھایا جاتا ہے ورنہ زیادہ تر گھر کے بنے کھانے کو ترجیح دی جاتی ہے۔

س۔ کھانا بناتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟

6۔ میں ہمیشہ اپنے اندر کے موسم کو ترجیح دیتی ہوں۔ اگر بارش نہیں بھی ہے تو کیا ہوا پکوڑوں کا موڈ ہوا فوراً کچن میں حاضری دیتی ہوں۔

سردی اگر زیادہ نہیں بھی ہے تو کیا حرج ہے سوپ پینے کے لیے سخت سردی کا انتظار بے کار ہے۔ فوراً سوپ بنا لیا جاتا ہے چونکہ امی کی طرف سے روک ٹوک نہیں ہے اور کھانے پینے کی ہر چیز گھر میں موجود ہوتی ہے اس لیے فوراً میں کچھ نہ کچھ بناتی رہتی ہوں۔ ہاں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اپنی پسند کو ختم کر کے دوسروں کی پسند کو ترجیح دیتی ہوں۔ اس وقت تھوڑی سی تکلیف تو ہوتی ہے لیکن دوسروں کی خوشی میں ہی میں خوش رہنے والی ہوں۔

س۔ کچن کی کوئی ٹپ؟

7۔ پیاز کاٹنے سے پہلے اگر انہیں تھوڑی دیر کے لیے فریزر میں رکھ دیں تو آنکھوں سے پانی نہیں نکلے گا۔

پھٹے ہوئے ہونٹوں پر گائے کا کچا دودھ لگایا جائے تو ہونٹ چمکنے لگیں گے۔

گرم مسالہ گھر پر تیار کریں

ہر گھر میں خواتین بہت محنت سے کھانا بناتی ہیں۔ مگر ہوٹل کے کھانوں کے سامنے ان کا ذائقہ کم ہی ہوتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں کہ ہوٹلوں میں شیف کمرشل طریقے سے کھانے بناتے ہیں جن کی ٹپس کم ہی خواتین کو معلوم ہوتی ہیں۔ بازاری کھانوں میں ذائقوں کی ایک وجہ ان میں ڈالے گئے مختلف گرم مسالے بھی ہیں۔ ہم بتا رہے ہیں ایسا گرم مسالہ بنانے کی ترکیب جو آپ کے بھی بنائے گئے تمام کھانوں میں بازاری کھانوں جیسا ذائقہ لے آئے گا اور کھانے والے آپ کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکیں۔

اجزاء:

زیرہ	ایک کپ
ثابت دھنیا	چار چمچے
کالی مرچ	دو چمچے
جائفل	چھوٹا ٹکڑا
بادیان کے پھول	چار عدد
جاوتری	چار ٹکڑے
دار چینی	پانچ ٹکڑے
تیز پات	چار عدد
لونگ	چار چمچے
	ایک چمچی
بڑی الائچی	بیس عدد

ان تمام چیزوں کو توے یا فرائنگ پین میں کچھ منٹ تک سینک لیں۔ جب ان میں سے خوشبو آنے لگے چولہا بند کر دیں۔

اب ان تمام اجزا کو پیس کر پاؤڈر بنائیں۔

لیجیے تیار ہے آپ کا گرم مسالہ جو بازاری کھانوں جیسا ذائقہ آپ کے کھانوں میں لائے اور ان کی شان بڑھائے۔

چاٹ مسالہ خود بنائیں

اجزاء

ثابت لال مرچ	بیس عدد
تیز پات	دو عدد
سفید زیرہ	تین چمچے
کالی مرچیں	دو چمچے
کالا نمک	دو چمچے
امچور پاؤڈر	تین چمچے
لال پسی مرچ	آدھا چمچہ

ترکیب: ثابت لال مرچ، تیز پات، سفید زیرہ اور کالی مرچیں دو سے تین منٹ توے پر بھون لیں۔ پھر انہیں ٹھنڈا ہونے کچھ دیر کے لیے رکھیں اور انہیں گرائنڈر میں پیس لیں اس کے ساتھ ہی بقایا تمام اجزاء بھی ملا کر باریک پیس لیں اور ایک شیشے کے جار میں محفوظ کر لیں۔

بقیہ خط آپ کے

مظاہرہ عرصہ دراز سے ملتوی ہے۔ سب کو روکھا پھیکا خط پسند نہیں۔ یہ صورت حال آپ کے مرہون منت ہے۔

ج: گوشی! آپ کا ''شکایت نامہ'' جن خطوط کو ایڈٹ کیا گیا ان میں قارئین کی عمومی دلچسپی کی کوئی بات نہیں تھی۔ پھر صفحات کی مجبوری آپ بھی جانتی ہیں۔ آپ کو تکلیف ہوئی۔ معذرت۔ کوشش کریں گے کہ آپ کی کہانیاں جلد شائع ہوسکیں۔

میمونہ بخاری نے منڈی بہاؤالدین ... میمونہ بخاری نے منڈی یزمان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

میں عرصہ سے خواتین اور شعاع پڑھ رہی ہوں۔ میری کزن (عائشہ) نے اب تک اپنے رسالے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں جو میں اب تک پڑھتی رہی ہوں۔ پرانے رسالے پڑھ کر مجھے پرانی رائٹرز بہت یاد آتی ہیں جن میں ''عنیزہ سید''، ''سائرہ رضا'' شامل ہیں۔ ''سائرہ رضا'' ان کا مکمل ناول ''یقین کامل ہی بندگی ہے'' بہت پیارا اور حیران کن تھا۔ پلیز ان سے کہیں کہ اب دوبارہ لکھیں۔ ایسے رائٹرز کو تو قلم رکھنا ہی نہیں چاہیے۔

''خواتین'' کے بارے میں بتاؤں تو مجھے ساری رائٹرز بہت پیاری ہیں اور اچھا لکھتی ہیں۔ ''مالا'' تو ''لاجواب'' ہے۔ ''نمرہ احمد'' بہت بہت اچھا لکھتی ہے کبھی انٹرویو ہی کروا دیں اپنا۔

''پردیس'' بہت دکھی اور سسپنس والا ہے۔ ''سمیرا حمید'' دیس والوں کو خوف زدہ کر رہی ہیں۔ ''احد'' بہت اچھا چل رہا ہے۔ ''ایڈوکیٹ خولہ'' مجھے بہت پسند آئی۔ اس میں اور باقی کردار بھی اچھے ہیں خاص ''اسود'' کا ''انگنا پھول کھلیں گے'' میں بہت مزہ آرہا ہے۔ جب جب ثانیہ کے ساتھ کبھی برا ہوتا ہے اچھا لگتا ہے ''ارحم'' کا کردار بہت اچھا اس کے ساتھ کبھی برا نہ ہونے دیجیے۔

ج: پیاری میمونہ! عنیزہ سید اور سائرہ رضا دونوں ہی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ہمیں بھی ان کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

آپ کا خط تاخیر سے ملنے کے باعث پچھلے ماہ شامل نہ کرسکے۔ اس ماہ شامل ہے۔

صائمہ گل......مردان

جنوری کی بالکل ہلکی مدھم سی دھوپ میں گرم ٹوپی اور جراب ڈال کر میں چھت پر چلی آئی کہ آرام سے سکون سے خط لکھ سکوں۔ بادلوں اور سورج صاحب کی آنکھ مچولی جاری ہے۔ گرم چائے کا کپ خستہ، سموسے اردگرد نظر آتے کھیت گندم کی فصل نے ابھی سر اٹھایا ہے۔ ایسا لگتا ہے زمین پر سبز قالین بچھا دی گئی ہو۔ تو چلیے چلتے ہیں تبصرے کی طرف۔

نعیمہ ناز کے خوبصورت انٹرویو کے لیے ڈھیروں ڈھیر شکریہ۔ شاہین جی: اب جلدی سے رضیہ جمیل اور نادرہ خاتون سب سے ملوائیں۔ ہمارے نام میں صائمہ گل کا خط سب سے اچھا لگا ہاہاہا۔ ہماری معصوم سی قاری بہن رضوانہ وقاص آپ کی صحت اور خوشیوں کے لیے خلوص دل سے دعائیں۔ پیاری بہن خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے۔ خیر آپ اپنا ایڈریس سمجھا دیں۔ ہم من موجی سے ہیں۔ کیا پتا آپ کی طرف چکر لگ جائے کہ دنیا امید پر قائم ہے۔

نئے سال کی دہلیز افسردہ رہی کہ سب نے ہی بچھڑے ہوؤں کو یاد کیا۔ شازیہ جمال کے شدید صدمے سے ابھی نکلے نہ تھے کہ راحت جبیں کے ہمسفر کے سانحہ ارتحال نے مزید نڈھال کر دیا۔ اللہ شازیہ اور اسلم صاحب کو غریق رحمت کرے۔ اور اہل وعیال کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

جنوری کی سردی میں نعیمہ جی نے گرم گرما سوپ اور لذیذ پکوانوں سے سجا ناول پیش کیا۔ کھنڈویاں نام پہلی بار پڑھا۔ فوراً گوگل پر سرچ کیا۔ بیسن کی ریسپی ہے ٹرائی کریں گے۔ ''پردیس'' روشن کے بعد اب مشعل۔ سچ میں دل دکھ سے بھر جاتا ہے کہانی پڑھ کر۔ سمیرا جی اب بس بھی کریں۔ اب کوئی اچھے دنوں کی نوید بھی سنا دیں۔

''احد'' ویری ویری ویل ڈن صوفیہ جی۔ ناقابل فراموش تحریر۔ لازول کردار مدتوں تک یاد رہ جانے والے ''چوہدری ہاؤس'' ہر کردار کے ساتھ بھرپور انصاف ہوا۔ پلیز اب رکنا نہیں۔ ایک اور زبردست سے ناول کے ساتھ انٹری دیں۔

سفید گلابوں میں اپنے ولی کی نزدیک کی نظر کمزور تھی جو اتنے پیارے دل والی گول مٹول سی زینی نظر نہ آئی۔

حکمرانی اور برکت ملتے جلتے موضوع والی تحریریں۔ آج کل ایسی فرماں بردار اور صلح جو بہوئیں نایاب ہیں۔ "آزمائش شرط ہے۔"

باقی صدیقی کی غزل نے ملکہ پکھراج کی یاد دلادی۔ آخر میں چلتے چلتے بتاتی چلوں کہ محمد طلال بہت ہی پیارے دل والا تھوڑا سا لاابالی تھوڑا سا شرارتی بیٹا ہے ہمارا۔ آپ کی دعا پر بے ساختہ آمین کہا۔

ج: پیاری صائمہ! بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے پڑھ کر مزہ آیا، بہت شکریہ۔

رضوانہ وقاص...... کرلاب ہری پوری

ٹائٹل پہ ماڈل پہاڑوں کے درمیان کھڑی ہوئی۔ بال چہرے پر بکھرے ہوئے مسکرا رہی ہے "کہنی شنی" نئے سال کے لیے دعا سب کو اور ہمیں خوشیاں نصیب ہوئیں۔ آمین۔ "اللہ تعالیٰ شازیہ جمال اور اسلم سندھو کی مغفرت فرمائے۔" کرن کرن روشنی" قرض کے بارے میں بہت اچھا لکھا ہوا۔ امی کہتی ہیں۔ یہ باتیں بہت اچھی لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ میں تو پڑھتی ہوں مجھے ڈر بھی بہت لگ جاتا ہے۔ ایک دو باتیں پوچھنی ہیں کہ یہ جو آج کل لڑکیاں کر رہی ہے۔ ایک کے ساتھ نکاح ہوا ہوتا ہے دوسرے شخص کے پیچھے بھاگ جاتی ہے۔ کوئی تو اپنی اولاد بھی لے جاتی ہے۔ اور دوسری بات یہ جو مرا ہوا بچہ یا بچی پیدا ہوتی ہے۔ اسے قبرستان میں نہیں دفنانا چاہیے پلیز ان باتوں پر حدیث کی روشنی میں بتانا ہے شکریہ "نئے سال کی دہلیز پر" سب کو پڑھا۔ سب کے اپنے اپنے دکھ اور خوشیاں۔

نعیمہ ناز سے ملاقات اچھی رہی۔ آپ کی شادی 2009 میں ہوئی میری شادی 2010 میں ہوئی، شادی کے بعد پہلا رمضان اور اللہ نے تین بیٹے دیے الحمد للہ۔ لیکن خود اب بیمار ہوگئی۔ اللہ پاک سے دعا کرتی رہتی ہوں اللہ انہیں افسر بنائے۔ میری خواہش تو بہت ہے کہ اپنے بچوں کے کام کروں لیکن اب چارپائی پر بیٹھ کر جو کر سکتی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ آپ کی طرح اچھی مصنفہ بن جاؤں اور تو اب کچھ نہیں کر سکتی۔ اگر اب کتابیں نہیں پڑھوں گی تو ٹائم کیسے گزرے گا میرا۔ کہانیاں پڑھ کر اپنا غم، بیماری تھوڑی دیر کے لیے بھول جاتی ہوں۔ شاہین آپا انٹرویو تو آپ اچھا لیتی ہیں۔ ساتھ میں مصنفہ کی فیملی کی تصویریں بھی لازمی لیا کریں۔ پہلے میں صرف شعاع پڑھتی تھی اب کرن اور خواتین بھی میرے شوہر مجھے لا کر دینے لگے ہیں دل سے شکریہ ادا کرنا چاہوں گی اپنے شوہر کا۔ ہمیشہ خوش وخرم اور صحت والی زندگی جئیں (آمین) "ہمارے نام" تو ضرور پڑھتی ہوں بہت سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ لبنیٰ آصف سب بہترین لکھتی ہیں کیا بات ہے جی۔ میں تو آپ کا نام دیکھ کر ہی کہہ دیتی ہوں ضرور کوئی نہ کوئی سبق اس کہانی سے ملے گا۔ امی نے پڑھی اور کہا کہ سمجھدار بہنیں ہوتی ہیں جو اپنے بھائیوں کا خیال رکھتی ہیں اور بھابھیوں کے ساتھ بنا کر رکھتی ہیں۔ کیونکہ والدین کے بعد بھائی ہوتے ہیں جو اپنی بہنوں کا خیال رکھتے ہیں۔ "حکمرانی" ہر لڑکی چاہتی ہے، میرا اپنا گھر ہو میں حکمرانی کروں لیکن اپنی ساس کا خیال رکھنا چاہیے کہ انہوں نے اپنے وقت میں یہ گھر کتنی محنت سے بنایا ہوتا ہے۔ امی نے کہا کہ کبھی دوسروں کے لیے بدنیتی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ جو دوسروں کا برا چاہتا ہے۔ اس کا برا ہوتا ہے اور ہمارے بزرگ ہی ہمارے گھر کی برکت ہیں۔ "خاتون کی ڈائری" میں سب نے اچھی غزلیں لکھی ہیں۔ "نفسیاتی الجھنیں" بھی ضرور پڑھتی ہوں۔

پیاری رضوانہ! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے۔ اور آپ کے شوہر کو اور ان کی محبت کو سلامت رکھے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ خط آپ اس طرح لکھیں کہ 22 تاریخ تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

لڑکی کسی کے نکاح میں ہو تو اس کا دوسرے مرد کے ساتھ بھاگ جانا جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تو اسے پہلے اپنے شوہر سے طلاق لینا چاہیے۔ پھر یہ فیصلہ کرے کہ اس کو کس کے ساتھ شادی کرنا ہے۔ بغیر شادی کیے کسی کے ساتھ بھاگنا اس کے ساتھ رہنا بھی جائز نہیں۔

مردہ پیدا ہوئی بچی کو قبرستان میں دفنانا جائز ہے یا نہیں۔ اس کے بارے میں ہمیں علم نہیں۔

حنا جاوید......کراچی

ابتدا میں ہی ایک بہت دکھ کی خبر ملی کہ میری موسٹ فیورٹ مصنفہ شازیہ جمال طارق صاحبہ رحلت فرما گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ کریم ان کی بے حساب مغفرت فرمائے۔ آمین۔ ان کی تحاریر ہمیشہ مجھے اپنے دل کے قریب محسوس ہوتی تھیں۔ نیچے دیکھا تو پیاری بہن راحت جبیں کے ہم سفر کے انتقال کی خبر بھی دکھی کر گئی۔ اللہ پاک انہیں غریق رحمت فرمائے اہل خانہ کو صبر و جمیل پر اجر عظیم فرمائے۔ آمین۔

سروے کے جوابات میں "نئے سال کی دہلیز پر" یوں لگا کہ ہم سب ایک ساتھ کھڑے ہیں۔ سوال نمبر 2 کے جواب میں مجھ سمیت سب کے دکھ سانجھے، تخیل میں ایک دوسرے کے ہاتھ تھپتھپائے، ایک دوسرے کے آنسو چنتے، ایک دوسرے کے دکھ کو محسوس کرتے پائے گئے۔

نعیمہ ناز سے ملاقات اچھی رہی۔ میری کچھ عادتیں ان سے ملتی ہیں۔ جیسا کہ بچپن میں شرارتی اور باتونی ہونا۔ خاندان کے بڑے بزرگوں سے بہت دوستی اور ان سے دل لگنا۔ اور جیسا انہوں نے اپنی مزاجاً سادگی کا ذکر کیا تو مجھ میں بھی ویسی ہی سادگی پائی جاتی ہے۔ اور ان کی طرح بڑے صحن میں درخت، کیاریاں اور پھلواری میرا بھی خواب ہے۔ ہاں مگر اس میں ایک عدد جھولا بھی شامل کر لیں۔ ہاہاہا۔

نفسیاتی الجھنوں میں کوہاٹ کی بچی کے سوال پر بے اختیار میں مسکرا گئی۔ ہائے یہ عمر اور پھر اس عمر کے بعد بھی دوسروں کو خوش کرنے کے چکر میں اپنا نقصان کرانے کے نقصانات یاد آتے رہے۔

اب آتے ہیں کہانیوں پر تبصرے کی جانب۔ نعیمہ ناز کا "جنوری کی سردی میں" پسند آیا۔ رامین کی دو دو کی بلیوں سے ہمیں اپنی پیاری پرشین بلیاں "کوکی اور مانو" یاد آ گئے جو ابھی کچھ دن پہلے ہی ہم نے کسی کو دے دیے کہ یہ گھر کچھ اس طرز پر بنا ہوا ہے کہ وہ بار بار ٹیرس پر چڑھ چڑھ کر بیٹھتے تھے اور ایک بار پیارا مانو گلی میں گر گیا تھا تو ڈر گئے اور دل نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں رخصت کر دیا۔ دو دو جیسی خواتین مجھے اٹریکٹ کرتی ہیں اگر انہیں کوکنگ سے بھی دلچسپی ہو تو کیا بات ہے۔

لبنیٰ آصف کا "دروازے کھلے رکھو" بہترین سین تھا۔ موجودہ دور میں تو اکسیر ہیں جہاں رشتوں کا کال پڑا ہوا ہے۔ ویلڈن لبنیٰ آصف۔

"حکمرانی" بھی بہت اچھا افسانہ تھا۔ اتفاق دیکھیے کہ اس بار صلہ رحمی اور بزرگوں کے مان سے متعلق دو افسانے خواتین اور شعاع میں شائع ہوئے۔ جی ہاں برکت نام کے افسانے، دونوں کا موضوع ایک، عنوان ،ایک مصنفات الگ۔ واہ مزا آیا۔

"سفید گلابوں کا سال" میں دیا کا اتنا زیادہ حقیقت پسند ہونا حیران کر گیا۔ اس نے ولی کو جب کارڈ بھیجا تو کاسنی پھولوں کی بابت لکھا تھا کہ یہ رنگ محبت، وفا اور خلوص کے نرم گرم جذبوں کا عکاس ہوتا ہے۔ اس رنگ کو پسند کرنے والے مہربان، شفیق مگر ارادوں میں اٹل ہوتے ہیں۔

اب یہ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ باتیں اگر دیا ولی کو بتا رہی تھی تو وہ تو ویسا ہی تھا۔ اپنے لیے کہی تھیں تو پھر ولی کو ریجیکٹ کیوں کیا؟ بہرحال ناولٹ اچھا تھا۔

"آپ کا باورچی خانہ" اس بار کیوں غائب رہا۔ بھئی پیاری بہنوں مانا کہ اس بار سردی دیر سے آئی مگر اتنی نہیں آئی کہ ہم باورچی خانے کو لاک کر کے بستر میں آرام فرمائیں۔ آ جائیں اپنے اپنے کچن میں۔

"ہمارے نام" کی بزم میں آ کر یوں لگتا ہے کہ ہم سب ایک دوسرے کو بہت عرصے سے جانتے ہیں۔ سب ایک دوسرے کے حال احوال سے واقفیت کی بنا پر دل سے بہت قریب محسوس ہوتی ہیں۔

فرزانہ انصاری بالکل ٹینشن نہ لیں، ماہدولت بھی گیارہ سال پہلے اپنے پتے سے دست بردار ہو چکے ہیں۔ تقریباً آدھی کراچی کے لوگوں کے پتے انہیں گڈ بائے کر چکے ہیں۔

اللہ پاک کا بے حد کرم ہے کہ اس نے اس تکلیف سے نجات دی جس میں ہم مبتلا ہو چکے تھے۔ اپنا کام ہے اس کی باقی نعمتوں کے احساس کو یاد رکھ کر اس کی شکر گزاری کرنا۔

ناہید اسماعیل کا ہمیشہ کی طرح مفصل تبصرہ اچھا لگا۔

رضوانہ وقاص آپ نے کہا، میں ہمت نہیں ہارتی۔
یقین کریں بہت اچھا لگا۔ اگلی سطور میں پڑھا کہ میں اتنی ہی مجبور اور بے بس ہوں۔ بہت دل دکھا جب یہ پڑھا کہ چل پھر نہیں سکتی ناں۔ میرا دل اداس ہو گیا۔ مگر پھر دل کیا کہ آپ سے دل کی بات کہہ دوں۔ ''اللہ ہے ناں وہ تنکے میں جان ڈال سکتا ہے، ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے مایوس نہ ہو، بے شک دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔ اور فرماتا ہے ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے اور بار ہا فرماتا ہے غم نہ کرو، ڈرو نہیں۔'' اطمینان رکھیے۔ اللہ کریم ہے وہ ضرور کرم فرمائے گا۔ رضوانہ آپ بہت ہمت والی ہیں۔ میں اللہ پاک سے دعا کرتی ہوں کہ اللہ آپ کو مکمل صحت یابی سے نوازے۔ آمین۔

پیاری حنا! آپ کے خط پڑھ کر ہمارا اندازہ ہے کہ آپ میں صلاحیت ہے لکھ سکتی ہیں۔ آپ نے جس طریقہ سے سطر چھوڑ کر صفحے کے ایک جانب خط لکھا ہے۔ اسی طرح افسانہ بھی لکھیں۔ اپنی تحریر اسی ایڈریس پر پوسٹ کریں جس پر خط لکھا ہے۔ خود آ کر دینا ضروری نہیں ہے۔

زرینہ خانم لغاری...... مظفر گڑھ

مسکراتی ہوئی حسینہ نئے سال کا استقبال کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کرن کرن روشنی سے فیض یاب ہوئے۔ سروے کے جوابات بہت خوب صورت تھے میرا سروے بھی شامل ہو کر چار چاند لگا رہا تھا۔ نعیمہ ناز سے ملاقات ادھوری رہ گئی تھی مکمل کی۔ سفید گلابوں کا سال خوب صورت کہانی تھی۔ ہمیشہ حمیرا شفیع چھوٹے چھوٹے افسانے لکھتی ہیں اس دفعہ خاصا طویل افسانہ لکھا۔ آئندہ بھی ایسے ہی لمبے لمبے افسانے لکھیں۔ دیا جیسی لڑکیاں اعتبار کے قابل نہیں ہوتیں لالچی اور پیسے جائیداد کو اہمیت دینے والی اچھا ہوا ولی کی جان چھوٹ گئی اور اسے زینی جیسی پیاری گول مٹول بیگم مل گئی۔ نعیمہ ناز کی جنوری کی سردی مزا دے گئی۔ بہت ہی دل چسپ اور مزے دار کہانی تھی کہانی میں سبق تھا بچیوں کو سلیقہ مند اور سگھڑ ہونا چاہیے اسی سلیقے ہی وجہ سے ہی تو شانی رامین پر فدا ہو گیا۔

حکمرانی عجیب کہانی تھی۔ ساس محترمہ کس نیچر کی تھیں انہیں پکی پکائی روٹی دینے والی سلیقہ مند بہو ملی لیکن ناشکری عورت حکمرانی چھن جانے کا دکھ دل کو لگا لیا۔

احد اختتام پذیر ہو گئی اس کہانی نے چوبیس مہینے تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ سب کو منزل مل گئی۔ بہت اچھا اینڈ تھا۔ مومنہ اور ہمایوں کے ملنے کی بہت خوشی ہوئی پردیس تو دکھ بڑھا رہا ہے روشن آزاد ہو گئی۔ ابھی اجالا اور مشعل مصیبتیں جھیل رہی ہیں۔ آگ لگے ایسے امریکہ کو، ہمارا پیارا پاکستان تا قیامت قائم و دائم رہے آمین۔

''دروازے کھلے رکھو'' بہت پیاری کہانی تھی۔ حمیرا نے اریبہ کو صحیح عقل دی تحفہ تحفہ ہوتا ہے اس کی قیمت نہیں دیکھتے خلوص دیکھتے ہیں شکریہ ادا کرتے ہیں ہمارے مرحوم بھائی ہر عید پر، ہر فصل پر ہم تینوں بہنوں کو خوب صورت سوٹ گفٹ کرتے تھے وہ دنیا سے چلے گئے تو سوٹ بھی چلے گئے۔ بھائی کے سوٹ کا مان ہوتا ہے۔ بڑے بزرگ تو سراپا برکت ہوتے ہیں۔ صدقہ خیرات سے بھی برکت ہوتی ہے۔ ''اللہ کافی ہے'' عجیب کہانی تھی اگر شوہر صاحب ایک غریب رشتہ دار کی فوتگی کا کھانا پکوا رہے ہیں تو محترمہ کو کیوں وٹ پڑ رہے تھے۔ مرے ہوؤں سے جیلسی کیا معنی، مالا کو حسب معمول نظر انداز کر دیا۔ آہ کی راہ میں جیسی کرنی ویسی بھرنی تھی۔ آج کے دور سے بیس سال پہلے یہی چلن تھا لڑکی اچھی ہے لڑکا بھی بہترین ہے لیکن والدین اور رشتہ داروں کو بھنک بھی پڑ جاتی کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں پھر تو ان کا رشتہ ہونا محال تھا۔ غیرت انا کا مسئلہ بنا لیا جاتا۔ زینب کے ساتھ بھی برا ہوا لیکن وہ اپنی بھتیجی سے بدلہ لے رہی تھی۔ غلط تھا اور اس کی خوب سزا بھی ملی۔ رنگا رنگ پھول میں سقراط کا جواب مزے دار تھا دو مرتبہ دفن بھی حیرت زدہ کر گئی۔ میری بیاض میں سونیا ربانی کا شعر پسند آیا۔

پیاری زرینہ! بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے بہت شکریہ۔

محترمہ کو وٹ اس لیے پڑ رہے تھے کہ انہیں اپنے شوہر پر شک تھا کہ وہ غریب رشتہ دار کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں اور محترمہ اس غریب رشتہ دار کے سامنے احساس کمتری کا شکار بھی تھیں۔

☆☆

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

ام سلمیٰ ...... کراچی

س۔ میری عمر چھبیس برس ہے میں ایک مقامی آفس میں کام کرتی ہوں۔ اب تک غیر شادی شدہ ہوں۔ میرے دونوں چھوٹے بھائی اور ایک بہن شادی شدہ اور اپنے گھروں میں سیٹ ہیں۔ میں اپنے دوسرے نمبر کے بھائی کے ساتھ رہتی ہوں، میری والدہ بیمار ہیں، والد مرحوم کی پنشن اچھی خاصی آتی ہے اس لیے ہمیں مالی دشواریوں کا سامنا نہیں ہے۔ میری والدہ چاہتی ہیں کہ ان کی زندگی میں ہی میں اپنے گھر کی ہو جاؤں۔ اس کے لیے انہوں نے کئی رشتے والیوں سے بات کر رکھی ہے۔

ہمارے آفس میں ایک ڈیڑھ مہینے پہلے ایک لڑکا جاب کے لیے آیا ہے۔ خاصا ہینڈسم ہے، وہ عمر میں مجھ سے خاصا چھوٹا ہے۔ دس بارہ برس کا فرق تو ہوگا لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ مجھ میں دلچسپی لیتا ہے۔ وہ میرے انڈر کام کرتا ہے اور بہانے بہانے سے میرے پاس آتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ ابھی اس کی ایک چھوٹی بہن شادی کے لیے ہے لیکن اس کی امی اس کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں اور یہ بھی کہ اس کی امی اس کی پسند کو ترجیح دیں گی۔ اس نے کبھی کھل کر مجھ سے اپنی پسندیدگی کا اظہار تو نہیں کیا لیکن اگر کر دیا تو میں کیا کروں؟ کیا میں بھی ہاں کہہ دوں یا میں پہل کر دوں۔ میں نے اپنی قریبی دوست سے مشورہ کیا تو اس نے کہا میں اگر تم پہل کرو گی تو کہیں تمہاری بے عزتی نہ ہو جائے۔ میں کیا کروں، پہلے ہی شادی کے لیے لیٹ ہو چکی ہوں خوب صورت نہیں تو بدصورت بھی نہیں ہوں، ینگ لگتی ہوں، اسمارٹ ہوں۔ رشتے والیاں تو رشتہ بھیجتی رہتی ہیں پر میرا تو ان سے دل ہی بھر گیا ہے۔

ج۔ عزیز بہن! ساری باتیں ایک طرف، ابھی تک تو یہ ہی نہیں پتا کہ ان صاحب کے دل میں کیا ہے۔ آپ نے سب کچھ لکھ دیا لیکن یہ سوال تو اپنی جگہ ہے۔

خود پہل کرنے والی بات تو مناسب نہیں۔ آپ کی دوست اپنے طور پر پوچھ سکتی ہے کہ اس کے دل میں کیا جذبات ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ آپ کو محض پسند کرتا ہو۔ شادی کا ارادہ نہ ہو۔ شادی کے لیے اکثر لوگوں کی سوچ مختلف ہوتی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے اگر وہ شادی کے لیے کہے تو آپ کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کا جواب آپ اپنے دل سے پوچھیں۔ اگر آپ اسے پسند کرتی ہیں، اس سے شادی کرنا چاہتی ہیں تو ہاں کر دیں آپ کی عمر زیادہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔ اصل چیز قبولیت ہے۔ اگر آپ کا دل اور ذہن اسے قبول کرتا ہے اور وہ بھی آپ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو شادی سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔

مسز ح...... حیدر آباد

میری شادی کو چھ سال ہوئے ہیں ہم جوائنٹ فیملی میں رہتے ہیں۔ میری ابھی دو سال پہلے ہی گورنمنٹ

جاب لگی ہے۔ میری دو نندیں غیر شادی شدہ ہیں۔ ساس بوڑھی ہیں۔ ایک نند جاب کرتی ہے۔ ہم آسودہ زندگی گزار رہے ہیں۔ میری بہن نے اپنا گھر شفٹ کیا ہے، میری بھی خواہش ہے کہ میں اپنا الگ گھر کروں لیکن سسرال کے مسئلے، میری نند ہر ہفتے گھر کا سامان یعنی کھانے پینے کی اشیاء خرید کر لاتی ہے۔

میرے شوہر کی تنخواہ اچھی ہے۔ میری تنخواہ بینک میں جمع ہو رہی ہے۔ میرے شوہر ہر ماہ گھر میں ایک مناسب رقم دے رہے ہیں لیکن مہنگائی کا شور مچا کر ساس چاہتی ہیں کہ پیسے بڑھائے جائیں، مجھے لگتا ہے کہ ان کی میری تنخواہ پر نظر ہے۔ آخر میں کیوں ان لوگوں کو اپنی تنخواہ کے پیسے دوں۔ میرے شوہر میرے ہی حمایتی ہیں۔ وہ ہر ہفتے مجھے خرچا دیتے ہیں جب ان کو مجھ سے کوئی مسئلہ نہیں تو کسی اور کو بھی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔ بس ذہن میں کوفت ہی سوار رہتی ہے کہ کیا کروں۔

ج۔ عزیز بہن! آپ کی تنخواہ پر آپ کا حق ہے لیکن آپ جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتی ہیں، گھر کی تمام آسائشات سے فیض یاب ہوتی ہیں۔ سسرال میں تین افراد ہیں اور آپ دو ہیں۔ اگر ساس مہنگائی کا شور مچاتی ہیں تو وہ حق بجانب ہیں۔ آپ خود ہی دیکھیں، پانچ سال پہلے مہنگائی کہاں تھی اور اب کہاں ہے۔ آپ کے شوہر کو چاہیے کہ وہ ماہانہ رقم میں اضافہ کریں اگر شوہر کے پاس گنجائش نہیں ہے تو کچھ آپ بھی مدد کر سکتی ہیں۔ جب ساتھ رہتے ہیں ساتھ کھاتے پیتے ہیں تو کس نے کم دیا، کس نے زیادہ دیا۔ یہ حساب کتاب کم ظرفی ہے ویسے بھی ماں اور بہنوں کا خرچ اٹھانا آپ کے شوہر کی ذمہ داری ہے۔

نصرت کیانی......خانیوال

میں ایک اسکول میں جاب کرتی ہوں۔ میرے والد کا ابھی کچھ مہینوں پہلے ہی انتقال ہوا ہے۔ میرے والد مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ میں تین بھائیوں کی اکلوتی اور سب سے بڑی بہن ہوں۔ میری شادی میں دو مہینے ہیں لیکن میرے پیارے ابو میری شادی سے پہلے ہی چلے گئے انہیں بہت ارمان تھا مجھے دلہن بنے دیکھنے کا، ہمارے اسکول میں ابھی ایک پیون نئے آئے ہیں ان کی شکل میرے ابو سے بہت ملتی ہے۔ اتنی کہ مجھے لگتا ہے کبھی کہ وہ میرے ہی ابو ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان سے ڈھیر ساری باتیں کروں اسی طرح جیسے ابو سے کرتی تھی ممی مجھے بہت سمجھاتی ہیں کہ صرف باپ ہی باپ ہوتا ہے، کوئی غیر آدمی ان کی جگہ نہیں لے سکتا۔ میں ان سے بہت اچھی طرح پیش آتی ہوں، انہیں انکل کہتی ہوں دل چاہتا ہے انہیں اپنے گھر بلاؤں۔ اسکول میں بھی میری فرینڈز مجھے سمجھاتی ہیں، ویسے وہ اچھے آدمی ہیں میری طرف ہمیشہ ابو کی طرح مسکرا کر دیکھتے ہیں۔

ج۔ عزیز بہن! دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی شکلیں ملتی ہیں ان کے دیکھنے، بات کرنے، مسکرانے کا انداز ملتا ہے لیکن کیا ان کی سوچ، ان کے جذبات، ان کے احساسات بھی یکساں ہوتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ وہ پیون آپ کے باپ کا ہم شکل ہو سکتا ہے۔ لیکن آپ کا باپ نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں لیکن جس چیز کی ہمارے مذہب میں ممانعت کر دی گئی۔ اس کے بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتیں جس خالق نے ہمیں تخلیق کیا ہے، وہ ہماری ہر کمزوری، کمی اور خامی سے واقف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ شخص آپ کے لیے نامحرم ہے۔ آپ اس سے مراسم نہ بڑھائیں نہ گھر پر بلائیں۔ زندگی میں بلاوجہ کی الجھنیں نہیں بڑھانی چاہئیں۔ آسان اور سیدھے راستوں کا انتخاب کریں۔ خود بھی خوش رہیں گی اور آپ سے متعلقہ لوگ بھی خوش رہیں گے۔

☆☆

بیوٹی بکس

امت الصبور

ارجمند......کراچی

س: میری بیٹی کی عمر سولہ سال ہے اس کے چہرے پر دانوں کے نشان رہ گئے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ڈاکٹر کی کریمیں استعمال کرنے کے بجائے ہربل استعمال کروں کیونکہ ابھی وہ کم عمر ہے۔ اس کی جلد نارمل ہے اور رنگ صاف ہے؟

ج: شہد جلد پر زخموں کو بھرنے اور نشانوں کو دور کرنے کے لیے مفید ہے اس میں اینٹی بیکٹریل خصوصیات ہیں جو زخم کی شفایابی کے عمل کو تیز کرتی ہیں۔ ایک چمچہ ہلدی اور ایک چمچہ شہد ملا کر نشانوں پر لگائیں، اسے پورے چہرے پر بھی لگایا جاسکتا ہے۔ پندرہ منٹ بعد چہرہ دھولیں۔

شہد میں لیموں کا رس ملا کر بھی چہرے کے نشانوں پر لگایا جاسکتا ہے۔ اگر آپ کی بیٹی کو ایلوویرا سے الرجی نہیں ہے تو ایلوویرا کا ایک ٹکڑا کاٹیں اور چھری کی مدد سے اس کا ایک جانب سے سخت چھلکا الگ کر دیں پھر اس کا جیل براہ راست دانوں کے نشانات پر لگائیں۔ اسے دو ایک گھنٹے لگا رہنے دیں پھر بعد میں سادے پانی سے منہ دھولیں ایکنی ختم کرنے کے لیے بھی اسی طرح سے روزانہ لگانا مفید ہے۔

سمیرا بلوچ......لسبیلہ

س: میری عمر چالیس سال ہے۔ بچوں کی پیدائش کے بعد سے جسم ذرا پھیل گیا ہے۔ میک اپ سے میرا چہرہ تو اچھا لگتا ہے لیکن گردن پھر بھی بہت موٹی سی لگتی ہے۔ حالانکہ میں چہرے سے گردن تک اچھی طرح فاؤنڈیشن لگاتی ہوں پھر بھی عجیب سی لگتی ہے؟

ج: پیاری بہن گردن کو پتلا دکھانے کے لیے آپ کو سامنے کی طرف ہلکی رنگت کا فاؤنڈیشن اور گردن کے اطراف گہرے رنگ کا فاؤنڈیشن لگانا چاہیے اس طرح آپ کی گردن پتلی دکھائی دے گی۔

کم از کم ہفتے میں ایک بار کولڈ کریم سے اس کا مساج ضرور کریں۔ مساج کرتے وقت یاد رکھیں کہ ہاتھوں کو نیچے سے اوپر کی جانب حرکت دیں۔ خشک جلد کے لیے یہ عمل بہت مفید ہے۔

سائرہ خان......سیالکوٹ

س: میری بیٹی کی عمر دس سال ہے۔ اس کی رنگت صاف ہے۔ اس کی عادت ہے کہ ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہے اس کی وجہ سے اس کے ہونٹ خشک رہتے ہیں اور پھٹتے ہیں۔

ج: چھوٹے بچوں کی عام طور پر ہونٹوں پر زبان پھیرنے کی عادت ہوتی ہے جس سے ہونٹوں کی رنگت اور ساخت بدل جاتی ہے۔ گلیسرین کے چند قطروں میں نیم کا تیل شامل کر کے اس کے ہونٹوں پر لگائیں۔ اس کے علاوہ لپ بام اور پٹرولیم جیلی لگانے سے بھی ہونٹوں کی رنگت پر اثر پڑے گا۔

مائرہ خان...... بھاول پور

س: میری جلد پھیکی اور بے رونق ہے۔ مہنگے سے مہنگا میک اپ کرلوں۔ تھوڑی دیر بعد چہرہ بے رونق لگنے لگتا ہے۔ ہر وقت ویسے بھی میک اپ نہیں کیا جاسکتا۔ بغیر میک اپ کے چہرہ بہت برا لگتا ہے؟

ج: مائرہ! سب سے پہلے آپ اپنی صحت پر توجہ دیں۔ اچھی اور متوازن غذا لیں۔ غذا میں پھل اور سبزیاں زیادہ شامل ہوں کیک، پیسٹری، مٹھائی بیکری کی بنی ہوئی اشیاء اور تلی ہوئی چیزیں نہ کھائیں۔ صبح اٹھ کر ایک گلاس پانی میں ایک لیموں کا رس اور ایک چمچہ شہد شامل کر کے پی لیں اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ قبض نہ ہونے دیں، جلد کی صفائی پر توجہ دیں۔ دودھ، بالائی، عرق گلاب اور گلیسرین ایک ایک چمچہ لیں اور ان کا آمیزہ بنا کر چہرے پر لگائیں۔ پانچ منٹ بعد صاف پانی سے چہرہ دھولیں۔

☆☆